شیرازۂ حیات

مولانا طیب عثمانی ندوی کی
حیات وخدمات

مرتب
ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی

شیرازۂ حیات
مولانا طیب عثمانی ندوی کی حیات وخدمات
مرتب ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی

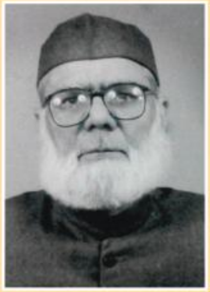

مولانا طیب عثمانی ندویؒ: ایک نظر میں

نام : شاہ محمد طیب عثمانی قلمی نام: طیب عثمانی

والد کا نام : شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسیؒ
(صاحب سجادہ خانقاہ مجیبیہ فردوسیہ، سملہ، ضلع اورنگ آباد، بہار)

تاریخ پیدائش : ۳۰ر ستمبر ۱۹۳۰، بمقام سملہ، ضلع اورنگ آباد، بہار۔

سکونت : بیت الرشاد، شانتی باغ، نیا کریم گنج، گیا، بہار۔

ابتدائی تعلیم : اردو، فارسی، عربی بذریعہ اتالیق ۱۹۴۳ء تک گھر پر ہوئی۔

اعلیٰ تعلیم : دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ۱۹۴۴ء تا ۱۹۵۲ء (سند فضیلت امتیاز کے ساتھ)
دو برس تک جدید تعلیم حاصل کی، انٹرمیڈیٹ تک۔

ملازمت : ندوہ سے فراغت کے بعد صحافت کے میدان میں قدم رکھا، کلکتہ کا سفر کیا اور چند ماہ وہاں رہے۔
- جنوری ۱۹۵۴ء تا دسمبر ۱۹۵۶ء بحیثیت مدیر 'نقیب' پھلواری شریف سے وابستہ رہے۔
- 'نئی نسلیں' لکھنؤ ۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۸ء بحیثیت معاون مدیر منسلک رہے۔
- بحیثیت معلّم ہادی ہاشمی ہائی اسکول گیا میں ۱۹۵۷ء تا ۱۹۸۸ء خدمات انجام دیں اور وہیں سے وظیفہ یاب ہوئے۔

تصانیف :
- رسولِ اکرمؐ، مطبوعہ ۱۹۶۰
- نقش دوام (شاہ محمد قاسمؒ کے مکاتیب)، مطبوعہ ۱۹۶۰ء
- حدیث اقبال، مطبوعہ ۱۹۶۱ء (دوسرا ایڈیشن اقبال: شخصیت و پیام، مطبوعہ ۲۰۰۵ء)
- افکار واقدار (تنقیدی مقالات کا مجموعہ)، مطبوعہ ۱۹۷۶ء
- حیاتِ دوام (سوانح قاسم فردوسیؒ)، مطبوعہ ۱۹۹۴ء
- سفرنامہ حرمین شریفین، مطبوعہ ۱۹۹۸ء
- ادبی اشارے ('نئی نسلیں' لکھنؤ، 'پیش رفت' دہلی کے اداریوں کا مجموعہ)، مطبوعہ ۲۰۰۲ء
- صحرا میں اذان (سیاسی، سماجی مضامین کا مجموعہ)، مطبوعہ ۲۰۰۴ء
- شخصیات، مطبوعہ ۲۰۰۶ء
- اسلامی معاشرہ، مطبوعہ ۲۰۰۷ء
- خیابانِ خیال: مکتوبات مولانا طیب عثمانی ندویؒ (مرتب: ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی)، مطبوعہ ۲۰۱۶ء

وفات : ۲۹ر ستمبر ۲۰۱۵ء، ۶ر بجے صبح، کریم گنج، گیا (بہار) مدفن: آبائی وطن سملہ کا خاندانی قبرستان

ISBN 938323958-1
9789383239580

اپلائڈ بکس
APPLIED BOOKS
New Delhi-110002
Tel.: 011-23266347 Email: appliedbooks@gmail.com

شیرازۂ حیات

(مولانا طیب عثمانی ندوی کی حیات وخدمات)

مرتب

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی

اپلائڈ بکس
APPLIED BOOKS

© جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ

نام کتاب	:	شیرازۂ حیات (مولانا طیب عثمانی ندوی کی حیات وخدمات)
مرتب وناشر	:	ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی
موجودہ پتہ	:	صدر شعبۂ اردو، انجمن ڈگری کالج، بھٹکل-581320 (کرناٹک) Emai: dr.s.r.usmani@gmail.com Mobile: 09449127861
اشاعت اول	:	مئی 2017
صفحات	:	248
قیمت	:	-/250 (دوسو پچاس روپے)
تعداد	:	500
کمپوزنگ	:	ابرارالحق خطیبی، بھٹکل
زیر اہتمام	:	**اپلائڈ بکس، نئی دھلی**

ISBN 978-93-83239-58-0

ملنے کے پتے:

- مجلس مصنّفین، بیتُ الرَّشاد، شانتی باغ، نیا کریم گنج، گیا-823001 (بہار)
- اردو بک ریویو، 1739/3 (ذیلی منزل)، نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-2
- مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، D-307 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-25
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی-6

SHEERAZA-E-HAYAT

Maulana Tayyib Usmani Nadvi Ki Hayat-o-Khidmaat

Compiled by: Dr. Shah Rashad Usmani

Edition: May 2017 Pages: 248 Price Rs. 250/-

Distributor: Urdu Book Review, New Delhi - 110002 Tel. 011-23266347

Printed at: New Print Centre, New Delhi - 110002

فہرست مضامین

- عرض حال — ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی — 7

سوانح و شخصیت

- مولانا طیب عثمانی مرحوم — مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — 31
- مولانا طیب عثمانی...ایک پیاری شخصیت — جناب محمد جعفر — 34
- چند یادیں چند باتیں — پروفیسر احمد سجاد — 37
- رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز — ڈاکٹر حسن رضا — 45
- کچھ یادیں کچھ باتیں — ڈاکٹر تابش مہدی — 55
- ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں.... — ڈاکٹر محمد بدیع الزماں — 61
- چراغ دل سے منور رہی محفل — جناب محمد شبیر عالم خان — 68

فکر و فن

- مولانا طیب عثمانی مرحوم اور ان کی اقبال شناسی — پروفیسر ابوذر عثمانی — 75
- طیب عثمانی کا ادبی اور تہذیبی مزاج — ڈاکٹر سید عبد الباری — 95
- مولانا طیب عثمانی کی حیات و خدمات — پروفیسر محسن عثمانی ندوی — 113
- مولانا طیب عثمانی کے افکار صوفیانہ — مولانا شاہ ہلال احمد قادری — 116
- مولانا طیب عثمانی کی تعلیمی خدمات — پروفیسر محمد ظفر الدین — 124
- دیکھے ہے جو کوئی.... — ڈاکٹر جاوید حیات — 128

- ادب اسلامی کے ایک ستون — جناب محمد عارف اقبال — 144
- ایک ادیب، مفکر اور متحرک صوفی — ڈاکٹر وقار انور — 151
- مولانا طیب عثمانی کی تصنیفی سرگرمیوں کے دائرے — ڈاکٹر محمد منصور عالم — 158
- مولانا طیب عثمانی کی صحافتی دور اندیشی — ڈاکٹر سید احمد قادری — 163
- مولانا طیب عثمانی کی ادبی خدمات — ڈاکٹر ممتاز احمد خان — 167
- ادب اسلامی کے خاموش خادم اور مجاہد — جناب عبد الرؤف، ساؤنور — 172
- مولانا طیب عثمانی کا نظریۂ ادب — جناب دلشاد حسین اصلاحی — 179

منظوم خراج عقیدت

- نذر طیب۔ مستند، معتدل، مثال سلف — مولانا شاہ تسنیم عثمانی ندوی — 158
- ہوا جاتا ہے ویراں صحن گلشن — جناب مرغوب اثر فاطمی — 187
- نذر طیب عثمانی — ڈاکٹر ظفر عالم سہسرامی — 188
- علم کا روشن ایک دیا تھے — ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن ضیاء مدنی — 189

دیباچے

- حدیث اقبال — ڈاکٹر یوسف حسین خان — 191
- ادبی اشارے — ڈاکٹر سید عبد الباری — 193
- خیابان خیال — ڈاکٹر شمس بدایونی — 196

تبصرے

حدیث اقبال

- مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی — مدیر معارف اعظم گڈھ — 198
- مولانا ماہر القادری — مدیر فاران کراچی — 198
- مولانا سید احمد عروج قادری — مدیر زندگی رام پور — 198

مولانا عامر عثمانی	مدیر تجلی دیوبند	199
ڈاکٹر ابن فرید	مدیر ادیب علی گڑھ	199

افکار و اقدار

مولانا سید احمد عروج قادری	مدیر زندگی رامپور	200
حیات دوام	مدیر تذکیر لکھنؤ	202

سفرنامۂ حرمین شریفین

ڈاکٹر ابن فرید	حجاب رام پور	203
ڈاکٹر عبدالمغنی	ماہنامہ مریخ پٹنہ	204
محمد عارف اقبال	ماہنامہ آج کل دہلی	205
ابوالقاسم ایوب اصلاحی	اردو بک ریویو دہلی	206

ادبی اشاریے

مولانا عمیر الصدیق ندوی دریا آبادی	معارف اعظم گڑھ	209

خیابان خیال

محمد رضوان خاں	ماہنامہ زندگی نو	210
غلام نبی کمار	ماہنامہ پیش رفت	212
اشعر حمیدی	اُردو بک ریویو، نئی دہلی	214

وفیات (اخبار و رسائل کے تراشے)

محمد عارف اقبال	مدیر اردو بک ریویو، نئی دہلی	220
ڈاکٹر سید احمد قادری	پیش رفت دہلی	223
ڈاکٹر سید شاہ فتح اللہ قادری	مدیر ماہنامہ المجیب پھلواری شریف	225
شاہ مبشر حسنین عثمانی	آئینہ (دی مرر آن لائن)	227

شاہ مسرور عثمانی	آغاز تحریک جمشید پور	230
تعزیتی قرارداد	پیش رفت دہلی	233
وفیات	روزنامہ راشٹریہ سہارا پٹنہ	234
شوکت علی	روزنامہ قومی تنظیم، پٹنہ	235

قارئین کے خطوط

پروفیسر عبدالقیوم خاں	236	ایم-ایم افتخار حسین	237
ارشد قمر	238	اے-عبداللہ	239
ڈاکٹر ظفر مراد آبادی	239	مناظر حق	240
شبیر حسن شبیر	240	محمد امین عامر	241
اقبال احمد خاں	242	پروفیسر شاہ غلام سلطانی احقر	242
علی احمد عثمانی	245		

❑❑❑

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض حال

ہر دور میں شخصیات اوران کے کردار وعمل کا مطالعہ دراصل تاریخ کے ایک عہد کا مطالعہ ہوا کرتا ہے اوراسی لئے اردو ادب میں یہ ایک مستحسن اور قابل تقلید روایت رہی ہے۔ولی نعمت والد ماجد حضرت مولانا شاہ محمد طیب عثمانی ندوی علیہ الرحمہ کی شخصیت ملک کے تحریکی،تعمیری اوراسلامی حلقۂ ادب میں محتاج تعارف نہیں۔آپ ایک ادیب،صحافی اور مصنف کی حیثیت سے معروف اور تحقیق،تنقید،سفرنامہ،سوانح اور صحافت کے میدان میں تقریباً نصف صدی سے زاید عرصہ تک سرگرم عمل رہے ہیں،اور یوں اس ذیل میں آپ کی تقریباً ایک درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

والد محترم مرحوم کی شخصیت بہت ہی ہمہ جہت مگر سادہ عوام وخواص،دوستوں، ملنے والوں اور شاگردوں کے درمیان بے حد مقبول ومحبوب رہی ہے۔آپ عجز وانکساری،شرافت ونیک نفسی، مشرقی انداز وتمدن،تہذیب واخلاق،خشیت وللہیت،مروت ونرمیت،رواداری اور وضع داری کا بے نظیر نمونہ تھے۔دراصل آپ خاندان کے ذمہ دارترین فرد،عزیزوں و دوستوں کے غم گسار اورشاگرد نواز واقع ہوئے تھے۔

1956ء میں جب رامپور یوپی میں ایک دستور ومنشور کی منظوری کے ساتھ ادارہ ادب اسلامی ہند کی تشکیل وتنظیم عمل میں آئی تو اس کے تاسیسی ارکان میں آپ کی شخصیت بڑی فعال اور اہم تھی،اس لئے کہ اس سے دوسال قبل 1954ء میں لکھنؤ سے جناب م نسیم کے ساتھ مل کر ماہنامہ نئی نسلیں کا اجراء آپ کر چکے تھے،جس نے ادب اسلامی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اور فکری و عملی فروغ میں بہت ہی اہم اور تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

چنانچہ 29 ستمبر 2015ء کو جب آپ کا انتقال اپنے وطن شہر گیا میں ہوا تو ادارہ ادب اسلامی ہند کے ترجمان ماہنامہ پیش رفت دہلی نے ’’طیب عثمانی نمبر‘‘ کی صورت میں خراج عقیدت پیش کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر مارچ 2016ء میں یہ خاص نمبر تاثرات،سوانح وشخصیت اورفکروفن کے تحت اکیس مضامین نظم ونثر کے ساتھ شائع ہوا جو عام طور سے ملک کے طول وعرض میں بے حد پسند کیا گیا۔

اس نمبر کی اشاعت کے بعد بعض مخلص دوستوں نے مجھے یہ صائب مشورہ دیا کہ پیش رفت کے ان مضامین کو باقاعدہ ایک کتاب کی صورت میں محفوظ کر دیا جائے چنانچہ اس موقع پر احباب سے گذارش کے بعد بطور خاص مزید چند مضامین لکھوائے گئے،کتابوں پر دیباچے اور چند ادبی رسائل میں آپ کی کتابوں پر تبصرے بھی فائل میں رکھے مل گئے۔اب ان سب کو شامل کتاب کیا جا رہا ہے۔ہمارے مخلص دوست اور ملک کے معروف ادیب اور صحافی ڈاکٹر سید احمد قادری کے ہم بے حد شکر گذار ہیں،جنہوں نے والد مرحوم کے انتقال کی خبر بنائی اور اپنے تعزیتی وتعارفی نوٹ کے ساتھ اسی دن ملک کے تمام مؤقر اخبارات اور انٹرنیٹ پر بھی شائع کرادیا تھا۔بعض اخبارات ورسائل نے وفیات کے تحت باضابطہ ادارتی نوٹ تحریر کئے افسوس کہ یہ سب محفوظ نہ رکھے جاسکے۔بہر حال جو بھی دستیاب ہوئے شامل کتاب ہیں۔خاص نمبر کی اشاعت کے بعد ’’قارئین کے خطوط‘‘ بڑی تعداد میں شائع ہوئے تھے اور ایسے کچھ خطوط ذاتی طور سے میرے نام بھی آئے تھے یہ بھی شامل کتاب کر لئے گئے ہیں۔

میں بے حد ممنون ہوں ماہنامہ پیش رفت دہلی کے مدیر ڈاکٹر حسن رضا اور مدیر منتظم جناب حسنین سائر کے ساتھ ساتھ تمام ادارتی وانتظامی اسٹاف کا جنہوں نے بڑی محنت،محبت اور خلوص کے ساتھ یہ خاص نمبر شائع کیا اور پھر بعد میں اس کتاب کی ترتیب واشاعت میں بھی قدم قدم پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی۔جزاک اللہ خیراً کثیرا۔

اوراب میں والد محترم کے حالات زندگی سے متعلق اپنے مشاہدات ومطالعات کو مختلف ذیلی

عنوانات کے تحت نہایت اختصار کے ساتھ قلم بند کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

خاندانی پس منظر: حضرت والد ماجد مولانا شاہ محمد طیب عثمانی صاحب ندوی مرحوم کا سلسلۂ نسب امیر المومنین خلیفۃ المسلمین حضرت سیدنا عثمان غنی ذی النورین رضی اللہ عنہ سے چالیسویں پشت میں ملتا ہے۔ حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شادی حضرت سیدنا محمد رسول ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ اور ان کے انتقال کے بعد حضرت اُم کلثومؓ سے ہوئی۔ اسی لئے آپ ''ذی النورین'' (دو نور والے) کے لقب سے مشہور ہوئے۔ حضرت ام کلثومؓ کے انتقال کے بعد آپ کی شادی ام عمرو بنت جندب دوسیؓ سے ہوئی۔ ان سے چار صاحبزادے ہوئے، بڑے صاحبزادے حضرت امیر عمروؓ تھے، جو خراسان کے گورنر تھے۔ ان کی گیارھویں پشت میں حضرت خواجہ عبدالرحمٰن گاؤ ذرونیؒ ہوئے، جو سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ سلطان محمود نے آپ کو پانی پت کا حاکم اور قاضی بنایا۔ ان کی بائیسویں پشت میں حضرت خواجہ محمد جلال الدینؒ کبیر الاولیاء پانی پتی ہوئے، آپ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے مشہور بزرگ ہیں۔ آپ کی قبر پانی پت میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔ حضرت خواجہ جلال الدینؒ کبیر الاولیاء کے پر پوتے حضرت خواجہ سلیمان پانی پت سے اپنے لڑکے حضرت خواجہ داؤد کے ساتھ بہار تشریف لائے۔ کیوں کہ ان دنوں بہار شریف حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور ان کے خلیفہ حضرت مولانا مظفر بلخی کی وجہ سے مشہور اور مرجع خلائق تھا۔ حضرت خواجہ داؤد کے پر پوتے حضرت مخدوم برہان الدین عرف خوندمیاں دیوروی‌ؒ تکمیلِ علوم ظاہری و باطنی کے بعد ضلع گیا کے ایک گاؤں ''دیورہ'' میں اقامت گزیں ہوئے۔ آپ کی اولاد گیا ضلع کی چار بستیوں دیورہ، سملہ، پیر بیگھ، مکارم چک میں آباد ہے۔

اس خانوادہ میں شروع ہی سے علم و فضل، دین و تقویٰ، فقر و درویشی عام رہی ہے جو عربی النسب خانوادوں کی خصوصیات رہی ہیں۔ گہری دینداری، اہلِ دنیا، امراء و وزراء اور اصحابِ دولت و حکومت سے دوری و بیزاری، علم سے شغف، عبادت کا شوق، اذکار و اشغال کی

کثرت، فکرِ آخرت اور تصوف و احسان کا ذوق قدرت کا خاص عطیہ ہے۔ یہ ایک ایسی غیر جانبدارانہ تصویر ہے جو اس خاندان کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس خانوادہ کی زیادہ تر شادیاں بہار کے صاحبِ شجرۂ حسنی حسینی سادات کے گھرانوں میں ہوئیں۔ چنانچہ خود حضرت مخدوم برہان الدین کی شادی بی بی اولیاء بنت حضرت مخدوم شاہ درویش (بیتھو شریف گیا) سے ہوئی، جو حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کی اولاد ہیں۔ ان سے حضرت شاہ منصور دانش مند پیدا ہوئے۔ آپ کے پوتے حضرت مولانا شاہ محمد کبیر دیورہ سے آ کر نوبت پور ضلع پٹنہ ہوتے ہوئے سملہ پہنچے، مگر اس گاؤں کو انہوں نے اپنا مستقل مسکن نہیں بنایا کچھ دنوں بعد حضرت مولانا شاہ جار اللہ بن مولانا شاہ محمد اعظم سملہ تشریف لائے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ خاص طور سے سملہ کے اس خانوادہ میں علماء و صوفیا کا ایک سلسلۃ الذہب ہے۔ ان میں حضرت مولانا شاہ غلام امام بن مولانا شاہ جار اللہ جو اپنے علم و تقویٰ و طہارت میں بے حد مشہور و معروف ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا شاہ محمد علی ہوئے جو عربی و فارسی کے ماہر اور انشاء پرداز تھے۔ جن کی ولادت ۱۲۰۰ھ میں سملہ میں ہوئی اور وفات ۱۲۹۲ھ میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب 1857ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد انگریزوں کی حکومت مضبوط و مستحکم ہو گئی تھی۔ ایک انگریز کلکٹر گیا ضلع میں مقرر ہوا، اس وقت حکومت کی زبان چونکہ فارسی تھی اسی لئے مولانا شاہ محمد علی جو فارسی کے انشاء پرداز تھے ان کو اپنا سکریٹری اور حکومت کا رجسٹرار مقرر کیا۔ انگریز حاکم اپنے حکم نامے اور پروانے مولانا شاہ محمد علی سے لکھواتا، اس طرح منشی محمد علی کے نام سے مشہور ہوئے۔ مگر کچھ ہی دنوں کے بعد انگریزوں کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور خاندانی فقر و درویشی کی زندگی اختیار کر لی۔ ان کے ایک صاحبزادے مولانا شاہ احمد کبیر ابوالحسنؒ ہوئے جو خانقاہ برہانیہ کمالیہ دیورہ کے سجادہ نشین ہوئے۔ ان سے رشد و ہدایت کا سلسلہ دیورہ اور سملہ میں بہت پھیلا، آخری عمر میں اپنے منجھلے صاحبزادے حضرت شاہ فدا حسین کو دیورہ خانقاہ کا سجادہ نشین مقرر کر کے خود اپنے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ مجیب الحق کمالی کے ساتھ سملہ میں خلوت نشین ہوئے۔ حضرت کمالی اپنے

وقت کے باکمال بزرگ تھے جنہیں علم وفضل، تصوف اور احسان میں کمال حاصل تھا۔ ساتھ ہی حکیم وطبیب حاذق تھے، فارسی کے بڑے شاعر، ادیب اور انشاء پرداز تھے، حضرت شاہ ابوالحسن شہید نے سملہ میں آپ کو اپنا خلیفۂ مجاز اور جانشین بنایا۔ اس طرح سملہ اور دیورہ دونوں جگہ حضرت شہید کا فیضان جاری ہوا۔ حضرت مجیب الحق کمالیؔ نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ حضرت شہید کے وفات کے بعد صرف ایک سال اپنے والد اور پیر طریقت کا فاتحہ کرنے پائے تھے کہ سانپ کے کاٹنے سے آپ کا وصال ہوگیا۔ وصال سے پہلے اپنے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسیؒ کو اپنا جانشین اور خلیفہ بنایا۔

محبوب الاولیاء حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی اپنے وقت کے ایک گمنام مگر باکمال شیخ وقت، مرد درویش اور مجاہد جلیل گزرے ہیں۔ جنہوں نے اپنی درویشانہ زندگی اور خلوت نشینی کے باوجود علم وادب، تصوف واحسان، اصلاحِ معاشرہ، سیاست واجتماعیت گویا زندگی کے ہر شعبہ میں تجدید واصلاح کے نقوش ثبت کئے اور مرجع خلائق ہوئے۔ ان کے ذاتی اوصاف وکمال سے اپنے والد کے نقش قدم پر خانقاہ مجیبیہ فردوسیہ کا فروغ اور اس کی شہرت ہوئی۔ آپ کے فیضان سے سملہ کی یہ خانقاہ آسمانِ رشد وہدایت پر روشن ستارے کی طرح نمودار ہوئی۔ جس کی روشنی وتابانی اور تجلیات عرفانی سے سرزمین بہار آج بھی روشن ہے۔ حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی کے احوال و واقعات ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رفاقت اور ان کے اخبار ''الہلال'' کی صحافت سے 1947ء کی جنگِ آزادی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ 15 اگست 1947ء کو جب آزادی کا آفتاب طلوع ہونے والا تھا اس سے ایک ماہ پہلے 19 جولائی 1947ء کو آپ کی زندگی کا آفتاب غروب ہوگیا۔ آپ کی سوانح ''حیاتِ دوام'' اس پورے دور کی دینی وملی اور سیاسی واجتماعی تحریکات کی تاریخ ہے۔ آپ نے اپنے پیچھے چار صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں چھوڑیں۔ بڑے صاحبزادے جناب حکیم شاہ محمد طاہر عثمانی فردوسیؒ صاحب سجادہ خانقاہ مجیبیہ فردوسیہ سملہ، منجھلے صاحبزادے جناب مولانا شاہ محمد طیب عثمانی ندویؒ، سنجھلے صاحبزادے پروفیسر ڈاکٹر شاہ حسن عثمانی

مدظلہ (سابق صدر شعبہ اردو ورکرس ڈگری کالج جمشید پور) اور چھوٹے صاحبزادے جناب شاہ حسین احمد عثمانی مدظلہ رٹائرڈ اسسٹنٹ انجینئر ٹیلکو، جمشید پور ہیں۔ بھائی بہنوں میں سب سے بڑی بی بی طاہرہ خاتون مرحومہ زوجہ جناب مولانا سید شاہ عثمان رخشاںؔ ابدالیؒ بن حضرت مولانا سید شاہ عبدالقادر ابدالیؒ سجادہ نشین خانقاہ اسلام پور اور چھوٹی صاحبزادی بی بی سلیمہ خاتون مرحومہ زوجہ جناب قاضی ثناءاللہ مرحوم بن حکیم قاضی عطاءاللہ قاضی محلّہ شیرگھاٹی گیا ہوئیں۔

پیدائش اور نام و نسب: والد محترم جناب مولانا شاہ محمد طیب عثمانی ندوی علیہ الرحمہ نے اس دینی وروحانی اور علمی وادبی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ تعلیمی اسناد میں آپ کی تاریخ پیدائش 30 ستمبر 1930ء درج ہے۔ لیکن مجھے حال ہی میں آپ کے کاغذات میں پیدائش کے چھٹے دن نام نہادی اور قلم چھلائی کی رسم کے دن کا وہ کاغذ دستیاب ہوا ہے جس میں آپ کی تاریخِ پیدائش ہجری سال کے مطابق ۱۳ محرم الحرام ۱۳۴۷ھ لکھی ہوئی ہے اور یوں شمسی کلینڈر کے مطابق آپ کی تاریخِ پیدائش 3 فروری 1929ء نکلتی ہے۔ اسی کاغذ کے مطابق آپ کا نام غلام امام طیب رکھا گیا۔ دراصل حضرت مولانا غلام امام فردوسی اس خانوادے کے ایک ایسے بزرگ گزرے ہیں جن کی روحانیت اور علم وفضل سے پورا خاندان فیض یاب تھا اور جو پورے علاقہ میں بڑے مولانا کے نام سے مشہور تھے۔ جدامجد حضرت مجیب الحق کمالی نے اپنے بڑے صاحبزادے کا نام ''غلام امام قاسم'' رکھا تھا جو بعد میں محمد قاسم کے نام سے موسوم ہوئے، اس طرح حضرت شاہ قاسم نے اپنے صاحبزادے کا نام غلام امام طیب رکھا۔ پھر محمد طیب نام ہوا اور بعد میں لکھنے پڑھنے کا قلمی نام ''طیب عثمانی'' ہوا۔

آپ کا پدری نسب نامہ حسب ذیل ہے:

حضرت شاہ محمد طیب عثمانی بن حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی بن حضرت مولانا شاہ محمد مجیب الحق کمالی بن حضرت شاہ احمد کبیر ابوالحسن شہید بن حضرت قطب العصر مولانا شاہ محمد علی بن حضرت مولانا شاہ غلام امام سملوی بن حضرت مولانا شاہ جاراللہ بن حضرت مولانا محمد اعظم بن حضرت

حضرت مولانا شاہ محمد کبیر بن حضرت مولانا شاہ معروف بن حضرت شاہ منصور دانشمند بن حضرت مخدوم شاہ برہان الدین عرف اخوند میاں دیوروی بن حضرت خواجہ برخوردار فردوسی بن حضرت خواجہ اسحاق فردوسی بن حضرت خواجہ داؤد چشتی بن حضرت خواجہ سلیمان چشتی بن حضرت خواجہ عبدالقدوس چشتی بن حضرت خواجہ شبلی چشتی بن حضرت خواجہ محمد جلال الدین کبیرالاولیاء چشتی پانی پتی (پانی پت پنجاب) بن حضرت خواجہ محمود بن حضرت خواجہ محمد یعقوب بن حضرت خواجہ عیسیٰ بن حضرت خواجہ اسمٰعیل بن حضرت خواجہ محمد بن حضرت خواجہ ابوبکر شبلی بن حضرت خواجہ علی بن حضرت خواجہ عثمان بن حضرت خواجہ عبداللہ بن حضر خواجہ شہاب الدین بن حضرت خواجہ عبدالرحمٰن گاوزورونی بن حضرت خواجہ عبدالعزیز سرخسی بن حضرت خواجہ خالدثم حضرت خواجہ ولید بن حضرت خواجہ عبدالعزیز ثانی بن حضرت خواجہ عبدالرحمٰن بن حضرت خواجہ عبداللہ ثانی بن حضرت عبدالعزیز اوّل بن حضرت عبداللہ کبیرؒ بن حضرت امیر عمروؓ بن خلیفہ ثالث امیر المومنین حضرت سیدنا عثمان غنی ذی النورین رضی اللہ عنہ۔

والدمرحوم کی والدہ محترمہ بی بی حفیظن حضرت سیدشاہ جنت حسین قادریؒ (بدوسر ضلع گیا) کی منجھلی صاحبزادی تھیں۔آپ کا مادری نسب نامہ بچند واسطہ حضرت سیدنا مخدوم عطاء اللہ بغدادی جیلانی ثم البہاری سے ملتا ہے اوراس سے اوپر چندواسطوں سے حضرت سیدنا محی الدین عبدالقادر جیلانی بغدادیؒ سے متعلق ہے۔مکمل سلسلہ نسب یہ ہے:۔

بی بی حفیظن بنت سیدشاہ جنت حسین قادری بن سیدشاہ محمد احسن بن سیدشاہ حسین بخش بن سیدشاہ درویش علی بن سیدشاہ خیرالدین بن سیدشاہ بدیع الدین بن سیدشاہ محمد جعفر قادری بن سیدشاہ ابراہیم قادری بن سیدشاہ بہاء الدین قادری بن سیدشاہ ولی بن سیدشاہ علی بن سیدشاہ محمد ثانی نور محمد بن سیدشاہ حضرت خضر عاشق الحق بن سیدجلال الحق احمد معشوق بن سیدنا مخدوم یوسف گنج بخش قادری بن حضرت سیدنا مخدوم ابومحمد عطاء اللہ البغدادی بن حضرت سیدشاہ حسین قادری بن حضرت سیدنا علاء الدین عبداللہ قادری بن حضرت سیدنا ابراہیم گیسودراز قادری بن سیدنا حاجی

احمد قادری ابوالعباس بن حضرت سیدنا حسن ثانی قادری بن حضرت سیدنا علی موسیٰ ثانی قادری بن حضرت سیدنا امیر علی قادری بن حضرت سیدنا محمد قادری بن حضرت سیدنا محمد حسن قادری بن حضرت سیدسیف احمد قادری بن حضرت سیدابونصر محی الدین ثانی قادری بن حضرت سیدنا شمس الدین ابوصالح نصر قادری بن حضرت سیدنا ابی بکر عبدالرزاق المقلب تاج الدین بن حضرت سیدنا محی الدین عبدالقادر جیلانی بغدادی بن حضرت سیدابی صالح موسیٰ جنگی دوست بن حضرت سیدعبداللہ ثالث بن حضرت سید یحییٰ عمر زاہد بن حضرت سید محمد سیف اللہ محمد رومی بن حضرت سید داؤد سیف اللہ بن حضرت ابوعمر سید موسیٰ ثانی بن حضرت سیدنا عبداللہ ثانی بن حضرت سیدنا موسیٰ الجون بن حضرت سیدنا عبداللہ المحض بن حضرت سیدنا امام حسن المثنیٰ بن حضرت سیدنا امام حسنؓ بن حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ۔

بچپن اور تعلیم : جیسا کہ آغاز میں یہ بات بڑی تفصیل سے آئی کہ حضرت والد ماجدؒ کا ماحول اور خاندانی پس منظر دینی وروحانی اور علمی وادبی تھا۔میرے بے حد اصرار پر والد مرحوم نے اپنی خودنوشت لکھنے کا آغاز کیا تھا مگر دس بارہ صفحات لکھنے کے بعد وہ اس سلسلے کو آگے نہ بڑھا سکے۔بہرحال ''میری زندگی'' کے عنوان سے اپنے اس قلمی مضمون میں اپنے بچپن کے حالات وکوائف پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''والدمحترم کو مجھے دینی تعلیم دلانے کا شوق ہوکا کی حد تک تھا، ابھی میری مکتب کی تعلیم ختم بھی نہیں ہوئی تھی ابتدائی نوشت وخواند کی ابتداء تھی اور ناظرہ قرآن ابھی ختم بھی نہیں کیا تھا۔غالباً چھے یا سات برس کی عمر ہوگی۔گیا کے مشہور حافظِ قرآن حافظ عبدالقدوس صاحب کے پاس مدرسہ قدوسیہ محلّہ سرائے نزد جامع مسجد گیا لے آئے اورانہی کے مدرسہ میں میرے قیام کا نظم کیا اور ناظرہ قرآن ختم ہونے سے پہلے حفظِ قرآن شروع کرادیا۔یہ زمانہ میرے عجیب احساس کا زمانہ تھا، کم عمری، ماں باپ سے دوری، تنہائی، بے کسی وبے بسی، نامانوس اوراجنبی ماحول۔کبھی جی گھبراتا تو پھوٹ

پھوٹ کر روتا۔ والد محترم کے دینی جذبے اور انگریزی تعلیم سے نفرت کا میں شکار تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے، مجھے بچپن ہی سے ذہن رسا، عقل وشعور کی دولت اور صبر وشکر کا غیر معمولی جذبہ بخشا تھا۔ کچھ دن اسی طرح گذرتے رہے کہ اچانک انہی دنوں گیا شہر میں ہندو مسلم فساد پھوٹ پڑا۔ میں اپنے ایک عزیز والد کی حقیقی خالہ زاد بہن بی بی خدیجہ الکبریٰ زوجہ شاہ مصطفیٰ ردولی لکھنؤ جو کنیز فاطمہ زوجہ میر ابوصالح صاحب نواب کڑا، ضلع گیا کی صاحبزادی تھیں اور جو مجھے بے حد عزیز رکھتی تھیں انہی کے گھر پر تقریباً مقید ہو کر رہ گیا۔ جب فساد کچھ تھما اور حالات بحال ہوئے تو ایک دن حضرت والد صاحب تشریف لائے اور مجھے گیا سے اپنے ساتھ لے کر سملہ چلے آئے۔ بچپن کا وہ واقعہ آج بھی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے کہ جیسے ہی میں گھر کے اندر گیا میری والدہ مجھے دیکھتے ہی شیرینی کے ساتھ گھر کے بھنڈار خانہ میں گئیں اور ایک سوپ چاول لئے نکلیں اور میرے ہاتھ سے چھولا کر بستی کے ایک فقیر کے گھر میں بھیجا اور ان کے چہرے پر سکون واطمینان کی جھلک دکھائی دی''۔

اس کے بعد گھر کی خانقاہ میں ہی ایک مکتب خانہ اپنے بچوں اور گاؤں کے تمام بچوں کی تعلیم کے لئے محبوب الاولیاء حضرت شاہ محمد قاسم عثمانیؒ نے قائم کیا۔ اس میں حافظ عبدالقدوس کے شاگرد رشید حافظ عبدالباری صاحب کو رکھا گیا۔ چنانچہ سملہ آنے کے بعد آپ کو اسی مکتب میں داخل کیا گیا جہاں آپ نے قرآن کے چند پارے حفظ کیے اور ابتدائی نوشت وخواند اور ابتدائی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد آپ کے والد نے آپ کی عربی تعلیم کا خصوصی نظم اپنے مرید خاص مولانا محمد یوسف صاحب (فاضل دیوبند) سے ان کے گاؤں سیلو پور میں رہ کر کیا۔ پھر ایک سال مدرسہ انوار العلوم گیا میں مولانا ابو محمد صاحب فردوسی کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی۔ ابتدائی عربی تعلیم کے بعد 15 برس کی عمر میں آپ کا داخلہ 1944ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے درجہ سوم عربی میں ہوا۔ اور تقریباً سات سال ندوہ میں زیر تعلیم رہے۔ 1952ء میں سند فضیلت

حاصل کی اور ساتھ ہی لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ علوم مشرقیہ سے عربی ادب میں مزید فاضل ادب کی سند حاصل کی۔ ندوہ کی تعلیمی فضا اور وہاں کی خوشگوار تعلیمی زندگی کا تذکرہ اکثر آپ اپنی گفتگو میں کیا کرتے تھے۔ خصوصاً ندوہ کا عظیم کتب خانہ اور انجمن الاصلاح کا شعبہ دار الکتب جوان کے ذوق مطالعہ کا ہمیشہ آماجگاہ بنا رہا۔ جہاں وہ درسیات کے علاوہ دو ڈھائی سو صفحات روزانہ مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھتے تھے۔ اکثر مجھ سے کہتے کہ میرا سارا مطالعہ قیام ندوہ کے زمانے کا ہے۔ جو میرے اب تک کام آرہا ہے، ورنہ گیا آنے کے بعد تو مجھے پڑھنے کو کچھ ملا ہی نہیں۔ اپنی زیر ترتیب نامکمل خودنوشت (میری زندگی) میں ندوہ کا ذکر کس جوش وجذبہ اور والہانہ محبت سے کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔

''ندوہ کی تعلیمی فضا، علمی وادبی اور دینی ماحول میرے لئے ایک خوشگوار زندگی کا آغاز تھا اور ایک نیا تجربہ تھا۔ دار العلوم کی بلند وبالا عمارت، اس کا کتب خانہ، شبلی ہاسٹل، انجمن الاصلاح اور اس کی لائبریری، ندوہ کی خوشنما مسجد اور اس کے دو بلند مینارے، یہ سب میرے لئے وجہ کشش تھے۔ ندوہ کا مہمان خانہ جہاں علامہ سید سلیمان ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ سے آکر ٹھہرتے اور ان کی زیارت کا شرف مجھے حاصل ہوتا۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے سید سلمان، میرے ہم درس وہم سبق تھے۔ اکثر سید صاحب میرے درجے میں آجاتے۔ جانے کتنے عربی زبان اور قرآن مجید کے اسباق ان سے پڑھنے کا مجھے شرف حاصل ہوا۔ اس دور کے اساتذہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی شیخ التفسیر والادب، مولانا محمد ناظم ندوی شیخ الادب، مولانا شاہ حلیم عطا شیخ الحدیث، مولانا محبوب الرحمٰن ازہری فقہ کے استاد اور مولانا مفتی محمد سعید نگراں شبلی ہاسٹل جیسے اساتذہ فن سے میرا تعلیمی وعلمی تعلق ہوا۔ میری علمی وادبی اور دینی واخلاقی تعلیم وتربیت میں ہمارے ان محترم ومکرم اساتذہ کرام کا سب سے زیادہ ہاتھ رہا اور آج جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ ہمارے ان اساتذہ کرام اور ندوہ کا

فیضان ہے''۔

ادبی وصحافتی زندگی اور ملازمت : والدمحترم مولانا طیب عثمانی علیہ الرحمہ نے ندوہ سے تعلیم کی تکمیل کے بعد لکھنے پڑھنے کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کے لئے میٹرک کا امتحان پاس کیا پھر انٹرمیڈیٹ تک کی تعلیم کے بعد معاشی حالات کی بنا پر یونیورسٹی کی مزید اعلیٰ تعلیم کا موقع نہ مل سکا اور پھر یکسوئی کے ساتھ ادبی وصحافتی میدان میں قدم رکھا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد ندوہ سے آپ اپنے وطن سملہ چلے آئے مگر ظاہر ہے تلاش معاش کی فکر تھی ۔لہٰذا1952ء میں ندوہ سے فراغت کے بعد سب سے پہلے تلاش معاش میں کلکتہ کا سفر کیا اور وہاں کی صحافتی زندگی میں قدم رکھا۔روز نامہ ''آزاد ہند'' اور ''عصر جدید'' اور ''الحق''، وغیرہ اس وقت کلکتہ کے مشہور روز نامے تھے،آپ کے ایک قریبی عزیز جنھیں آپ الیسع چچا کہتے تھے اور جو صحافتی دنیا میں عبدالرحمٰن عثمانی کے نام سے مشہور تھے اور آزاد ہند کی ادارت میں تھے ان کے ذریعہ کلکتہ کے مختلف اخبارات کے دفاتر میں جانے اور ان کے مالکان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔اس طرح انھوں نے اپنی اہلیت وصلاحیت کے اظہار کے لئے مختلف اخبارات میں اداریئے اور صحافتی کالم لکھے۔اس وقت آپ کی عمر ۲۴ یا ۲۵ برس کی ہوگی ۔سیاسی شعور کی پختگی اور قلم میں روانی خوب تھی ۔لہٰذا واہ واہی تو خوب ہوئی لیکن بروقت کوئی جگہ نہیں نکل سکی۔کچھ دنوں رہتے تو شاید جگہ نکل آتی مگر ایک دومہینہ بعد ہی وہاں سے چلے آئے، یہ صحافتی زندگی پسند نہ آئی۔ مجھ سے اکثر کہتے تھے کہ کلکتہ میں اردو صحافت قلم بیچنے کا پیشہ اور ضمیر کا سودا ہے۔ان ہی دنوں درس گاہ اسلامی رام پور میں عربی استاذ کی جگہ نکلی ،جس کے لئے امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث صاحب ندویؒ نے آپ کو رام پور آنے کی دعوت دی۔ابھی آپ وہاں جانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ اس وقت تک آپ کے مخلص دوست م۔نسیم اپنے ادبی رسالہ ''نئی نسلیں'' کا خاکہ مرتب کر چکے تھے،جس کی ادارتی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے انھوں نے لکھنؤ آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ آپ نے درس گاہ اسلامی رام پور کی ملازمت پر اپنے ذوق کی تسکین کے لئے ماہنامہ

''نئی نسلیں'' کی ادارت اور جناب م۔نسیم کی رفاقت قبول کر لی اور آپ لکھنؤ چلے گئے۔

فروری 1954ء میں نئی نسلیں کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا،نہایت دیدہ زیب اور کم قیمت ہونے کے ساتھ ہی اپنے فکر ونظر کے معیار ووقار کے باعث یہ رسالہ ملک میں بے حد مقبول ہوا اور اپریل 1958ء تک چلتا رہا۔لیکن پھر حالات کی ناسازگاری اور م۔نسیم کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی سیماب وش بے چین طبیعت کے باعث رسالہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا لیکن مختصر مدت میں ہی دنیائے ادب پر اپنی چھاپ چھوڑ گیا اور یقیناً ادب اسلامی کو ایسا دوام بخش گیا جس کی پیش رفت ہر دور میں جاری رہے گی۔نئی نسلیں کے دورِ ادارت میں ہی امارت شرعیہ بہار کے ترجمان ہفت روزہ ''نقیب'' پھلواری شریف پٹنہ میں ایڈیٹر کی جگہ نکلی اور جب وہاں سے بلاوا آ گیا تو آپ 'نئی نسلیں' کے ابتدائی ایام ہی میں لکھنؤ سے پٹنہ منتقل ہو گئے،البتہ اس سے یہ قلمی تعلق باقی رہا۔ یہاں تک کہ اس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے آپ کا نام 'نئی نسلیں' کی مجلس ادارت میں شامل رہا۔دو سال تک یہ صحافتی سلسلہ چلتا رہا ، قیام پھلواری کے مشاغل پر تھوڑی روشنی یا معلومات قاضی احمد حسین مرحوم ناظم امارت شرعیہ پر لکھے گئے ان کے ایک مضمون میں ملتی ہے، ایک اقتباس دیکھئے:

> ''میں جنوری 1954 سے دسمبر 1955ء تک تقریباً دوسال امارت شرعیہ بہار سے متعلق رہا ہفت روزہ نقیب پھلواری شریف پٹنہ میں بحیثیت مدیر میری تقرری ہوئی اور ساتھ ہی معاون ناظم کی حیثیت سے قاضی صاحب کے ساتھ معاونت میرے فرائض میں شامل رہے، یہ دوسال میری زندگی کا انتہائی قیمتی دور گذرا ہے،جس میں مجھے قاضی صاحب کے ساتھ صبح وشام رفاقت کا شرف حاصل رہا۔ملک کی دینی ،سیاسی اور ملی تحریکات کے سلسلہ میں قاضی صاحب سے میں براہ راست مستفید ہوا،ان کے دینی وملی اور سیاسی تجربے میری زندگی کے حاصل ہیں''۔ (شخصیات۔ص:۲۳)

''نقیب'' کی ادارت کے بعد آپ دوسال تک 57-1956ء جھریا سے نزدیک بھنورا

ہائی اسکول سے بھی منسلک رہے۔ جہاں آپ کے بڑے بھائی حضرت حکیم شاہ محمد طاہر عثمانی صاحب علیہ الرحمہ قیام پذیر تھے اور اپنا مطب کرتے تھے جھریا کا ماحول آپ کو راس نہ آیا اور 1957 میں آپ قاضی احمد حسین صاحب کی دعوت پر دہلی کے لئے نکلے جوان دنوں پارلیمنٹ کے سیشن چلنے کی وجہ سے دہلی میں مقیم تھے، خیال تھا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عصری تعلیم جاری رکھتے ہوئے کوئی مناسب ذریعۂ معاش بھی وہاں حاصل کریں گے۔ اس زمانے میں گیا میں ان کی چھوٹی بہن سلیمہ خاتون رہتی تھیں لہذا ان سے ملتے ہوئے آگے جانے کا خیال ہوا۔ حسن اتفاق کہ اس زمانے میں ہادی ہاشمی ہائی اسکول (جو بعد میں سینئر سکینڈری اسکول بھی بنا) میں اردو و فارسی کے استاذ کی جگہ خالی تھی، رشتہ داروں کے مشورہ پر فوری طور پر 1957 میں یہاں جوائن کرلیا۔ اس طرح انہوں نے ذریعۂ معاش کے لئے ادب وصحافت پر شعبۂ تعلیم کو ترجیح دی، جوان کے لئے بقدر کفاف معاشی سکون اور یکسوئی کا باعث ہوا اور یوں اپنی پوری زندگی اپنے وطن شہر گیا میں گذار دی اور تقریباً ۳۳ برس کی ملازمت کے بعد آخر کار ستمبر 1988ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبک دوش ہوگئے۔

اسکول کی یہ ملازمت ان کی طبیعت اور ذوق سے ہم آہنگ نہ تھی، مگر مزاج میں غیرت و حمیت اور صبر وشکر کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ اخفائے حال اور عزلت وگمنامی کا شعار خاندانی ورثہ تھا۔ ایک بار انہوں نے مجھ سے اپنے ابتدائی معاشی حالات وواقعات کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا کہ گیا میں اسکول کی ملازمت میں آنے کے کچھ ہی دنوں بعد انہوں نے ایک دن مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ایک خط لکھا، جس میں یہ بتایا کہ کس طرح ان کے والد محترم حضرت شاہ محمد قاسم عثمانیؒ کلکتہ میں ان کے ساتھ الہلال کے ادارتی شعبہ سے وابستہ تھے اور جب انگریزوں نے اخبار بند کر کے مولانا آزاد کو رانچی میں نظر بند کر دیا تو اس قید و بند کے دور میں بھی وہ رانچی میں ان کے ساتھ تھے اور مدرسہ اسلامیہ میں استاذ اور پرنسپل کے فرائض انجام دے رہے تھے، 15 اگست 1947ء کو جب ہندوستان آزاد ہوا تو اس سے ایک ماہ پہلے 19 جولائی کو آپ کے والد محترم شاہ محمد قاسم عثمانیؒ

کا انتقال ہوگیا اور اب سب بھائی بہن کم عمری میں یتیمی کا داغ اٹھائے زندگی بسر کر رہے ہیں، آپ چاہتے تھے کہ ندوہ کی سند کی بنیاد پر ہی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی یا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ دینیات میں کوئی جگہ نکل آئے۔ لیکن پھر اچانک ان کے اندر کا فقر غیور جاگ اٹھا اور شب میں لکھا ہوا وہ خط صبح میں پھاڑ کر پھینک دیا گیا۔ شاید انہوں نے یہ سوچا ہو کہ نیک نفس عظیم والد کے عظیم نام اور کام کو جنس بازار نہیں بنانا چاہئے، اسی طرح خود حضرت مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ کے ذریعے بہت سارے لوگ خلیجی ممالک میں ان کے اثر ورسوخ کی بنا پر عہدے اور مناصب حاصل کر رہے تھے مگر آپ نے حضرت مولانا سے اپنی تمام قربت وتعلق کے باوجود دنیاوی فائدے اٹھانے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ پوری زندگی فقر ودرویشی اور معاشی پریشاں حالی میں گذاری مگر دنیا کو اپنا مطلوب ومقصود نہیں بنایا، زندگی میں ایسے مواقع تو بہت آئے مگر وہ کبھی بھی اپنے ایمان اور ضمیر کا سودا نہ کر سکے۔ تحریکِ اسلامی سے وابستگی نے تو فقر ودرویشی اور استغناء کے اس خاندانی مزاج اور جذبے کو دو آتشہ کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایثار وقربانی اور دعوت وعزیمت کی اس شاہراہ پر آپ بڑی ثابت قدمی کے ساتھ چل پڑے، جس کے بارے میں حفیظ میرٹھی نے کہا ہے:

اُف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اس راہ گزر سے گزرے

دعوتی و تحریکی مشاغل : تحریکِ اسلامی سے آپ کی ذہنی وفکری وابستگی تو ندوہ کے عہد طالب علمی ہی میں ہوگئی تھی۔ جماعتِ اسلامی کے نام، کام اور اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے شناخت اور واقفیت کا پہلا موقع کب کیسے اور کہاں نکل آیا اس کی کچھ تفصیلات مولانا مودودیؒ پر لکھے ان کے ایک مضمون میں آ گئی ہے۔ ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

''جب کبھی مولانا مودودیؒ کی ذات والا صفات کا نام آتا ہے میری یادوں

کے چراغ جل اٹھتے ہیں اوراپنے بچپن کا وہ زمانہ یاد آتا ہے، جب میں تقریباً بارہ برس کی عمر میں عربی کی ابتدائی تعلیم حضرت والد صاحبؒ کے مرید صادق اور خلیفہ ومجاز مولانا محمد یوسف سیلو پوری (فاضل دیوبند) کے گاؤں میں مولانا موصوف کی اتالیقی میں حاصل کر رہا تھا کسی موقع پر حضرت والد ماجد بھی وہاں تشریف لائے ان کے بستر پر ان کے سرہانے مولانا مودودیؒ کی دو مشہور کتابیں ''تفہیمات'' اور ''تنقیحات'' دیکھیں گویا مولانا کے نام اور کتاب کی یہ میری پہلی شناسائی تھی۔ پھر مجھے عصر حاضر کی اس باکمال نابغۂ روزگار شخصیت کو قریب سے دیکھنے، ان کے فکر ونظر کو پڑھنے اور سمجھنے کا موقع اس وقت ملا جب میں نے اپنی کم عمری کے زمانے میں عربی زبان کی اعلیٰ تعلیم کے لئے 1944ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ اسی سال الٰہ آباد میں متحدہ ہندوستان کا جماعت اسلامی کا پہلا کل ہند اجتماع ہونے والا تھا۔ مولانا مودودی الٰہ آباد اجتماع میں شرکت کے لئے لکھنؤ ہوتے ہوئے تشریف لے گئے، مولانا عبد الغفار ندوی جماعت اسلامی لکھنؤ کے امیر مقامی تھے اور مولانا عبد السلام قدوائی ندوی کے ساتھ ان کے ادارہ تعلیمات اسلام میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے مولانا مودودیؒ کا ایک پروگرام ادارہ تعلیمات اسلام لکھنؤ میں رکھا تھا جس میں عمائدین شہر مدعو تھے۔ میں بھی سینئر طلبا کے ساتھ مولانا کو قریب سے دیکھنے اور سننے کے لئے ادارہ تعلیمات پہنچ گیا...... ندوہ میں یہ میرا پہلا سال تھا میں نے بھی طلبائے ندوہ کے ساتھ اجتماع میں شرکت کے لئے الٰہ آباد جانے کا پروگرام بنالیا اور الٰہ آباد اجتماع میں شریک ہوا۔ مولانا کی طبیعت ان دنوں کچھ ناساز تھی۔ اجتماعات کے زیادہ تر پروگرام مولانا امین احسن اصلاحی کی رہنمائی میں چل رہے تھے صرف یک خطاب عام مولانا مودودیؒ کا ہوا...... پھر ایسا ہوا کہ اسی وقت ندوہ کے طلبا ان سے ملنے ان کے قیام گاہ پر گئے میں بھی ساتھ تھا۔ طلبا مختلف موضوعات پر مولانا سے سوالات کر رہے تھے اور مولانا سنجیدہ اور

متین لہجے میں ہر سوال کا تشفی بخش جواب دے رہے تھے''۔ (شخصیات: ص:۹۲-۹۳)

تحریکِ اسلامی سے وابستگی کا یہ تو آغاز تھا، تعلیمی سفر کے دوران اور پھر اس کے بعد بھی حق وصداقت کی اس راہ پر آپ بڑی استقامت اور ثابت قدمی کے ساتھ منزل بہ منزل آگے بڑھتے رہے، حضرت والد ماجد اپنے شہر گیا کی گلیوں میں اسیری، عزلت وخلوت کی زندگی اور رہین ستم ہائے روزگار کے باوجود اپنے نصب العین اور مقصد سے کبھی غافل نہیں رہے۔ تحریک و دعوت اور ادب وصحافت ہمیشہ مطلوب ومقصود بنا رہا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد جماعت اسلامی ہند کی رکنیت اختیار کر لی اور اس طرح دعوت دین کے کاموں میں آپ کی مشغولیت مزید بڑھ گئی۔ جماعت اسلامی شہر گیا کی مقامی امارت، حلقہ بہار کی مجلس شوریٰ کی رکنیت کے ساتھ جماعت کی تمام دعوتی وتعلیمی اور خدمت خلق کی سرگرمیوں میں برابر شریک رہے۔ آج گیا شہر اور مضافات میں جماعت کے تحت جتنے دعوتی وتعلیمی ادارے کام کر رہے ہیں ان سب میں آپ کے فکر وعمل کے روشن نقوش نمایاں نظر آتے ہیں۔

جماعت اسلامی سوشل سروس سوسائٹی کا قیام اور اس کے تحت ملت اسپتال، دعوتی مرکز، مرکز اسلامی، مولانا مودودی ہال، اسلامی لائبریری کے علاوہ تعلیمی ادارے اقرأ پبلک اسکول اور سی بی ایس سی سے منظور شدہ شتابدی پبلک اسکول نرسری سے X+2 تک اپنی نوعیت کا واحد مسلم اقامتی ادارہ ہے۔ اسی طرح لڑکیوں کی تعلیم کے لئے جامعۃ البنات کھنڈیل، خالص دینی تعلیم اور تحفیظ القرآن کے لئے مدرسۃ الہدیٰ حمزہ پور۔ یہ سارے ادارے جماعت اسلامی گیا کے ایسے دعوتی وتعلیمی سرگرمیوں کے آئینہ دار ہیں، جن کی ابتداء اور ہر نشیب وفراز میں آپ پوری طرح شریک وشامل رہے ہیں۔ ان تحریکی اداروں سے ہٹ کر شہر کے دوسرے ملی وتعلیمی اداروں سے بھی آپ کسی نہ کسی حیثیت سے ہمیشہ منسلک رہے، مثلاً مدرسہ انوار العلوم گیا، یتیم خانہ اسلامیہ گیا اور قاسمی ہائی اسکول گیا کی مجلس انتظامیہ میں بحیثیت رکن ہر مشورے میں شریک رہے ہیں۔ یہی وہ سب ملی ودینی کام ہیں جو ان شاء اللہ آپ کے لئے اجر آخرت کا باعث بنیں گے۔

تصنیف وتالیف: 1944ء میں ندوہ میں داخلہ کے بعد لکھنے پڑھنے کے شوق کا آغاز ہوا۔ بچوں کے رسائل غنچہ بجنور، پھول لاہور اور پیام تعلیم دہلی میں آپ کے مضامین تواتر سے شائع ہونے لگے۔ پھر ذرا جب علم وشعور میں پختگی آئی تو تحریک اسلامی کے اخبار ''الانصاف'' الہ آباد میں دینی وسیاسی مضامین لکھنے کی ابتداء ہوئی۔ اس زمانہ کے غنچہ اور الانصاف کے بیشتر شمارے ہمارے پاس محفوظ تھے جس میں آپ کے مضامین ہوا کرتے تھے۔ غالبًا یہی وہ زمانہ تھا جب ادب اسلامی کی ابتداء ہوچکی تھی۔ کراچی سے چراغ راہ، حیدرآباد سے انوار اور میرٹھ سے معیار جیسے ادبی رسائل نکل رہے تھے۔ اس طرح ندوہ کے عہد طالب علمی ہی میں (1952-53 تک) ادبی وتنقیدی مضامین لکھنے کا آغاز ہوچکا تھا پھر 1960ء میں رامپور سے دانش اور 1967ء میں ٹانڈہ سے دوام نکلا تو آپ ادارۂ ادب اسلامی کے تاسیسی ارکان میں شامل ہوکر ادب اسلامی کی تنظیم وتخلیق میں پوری طرح سرگرم ہوگئے۔ اپریل 1963ء میں آپ نے گیا سے پروفیسر عبدالمغنی کے ساتھ مل کر ایک سہ ماہی ادبی رسالہ ''صدف'' بھی جاری کیا مگر اسی دور میں آپ پر اختلاج قلب کا شدید دورہ پڑا، اور پھر اختلاج قلب کے مستقل مریض ہوگئے۔ سفر آپ کے لئے ایک مسئلہ بن گیا۔ لہٰذا دوسرے کسی شہر میں آنے جانے سے ہمیشہ پرہیز رہا۔ چنانچہ 1998ء میں سفرحج کے لئے جب گیا سے نکلے تو دہلی پہونچے اور تب اس زمانہ کو یاد کیا جب وہ مرکز جماعت اور دہلی آئے تھے۔ ایک چھوٹا سا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ''مجھے دہلی دیکھنے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے کی سعادت اس وقت ہوئی تھی جب ادارۂ ادب اسلامی ہند کی مجلس اعلیٰ کی ایک اہم نشست جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں رکھی گئی تھی۔ سنہ یاد نہیں، اس میں مولانا سید احمد عروج قادری، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، م۔نسیم، ابن فرید، انور صدیقی، شبنم سبحانی اور کچھ دوسرے رفقاء بھی شریک تھے۔ اسی اجلاس میں ادبی ماہنامہ دانش نکالنے کی تجویز زیر غور آئی۔ پھر یہ رسالہ مولانا سید احمد عروج قادری کی ادارت میں رامپور سے نکلا''۔ (سفرنامہ حرمین شریفین۔ ص:۳۲)

بہرکیف دعوتی تحریکی جدوجہد اور سماجی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام بھی کچھ نہ کچھ کرنے کی آپ کوشش ضرور کرتے رہے، حالانکہ صحت کی خرابی اور گیا جیسے چھوٹے سے دور افتادہ شہر میں تازہ بہ تازہ رسائل وکتب اور وسائل کی کمی کسی بڑے علمی کام میں بڑی رکاوٹ رہی۔ تاہم ان حالات میں بھی جو چند مطبوعات سامنے آئیں ان کا ایک مختصر تعارف یہاں پیش خدمت ہے۔

1۔**رسول اکرم** ﷺ: سب سے پہلے ایک کتابچہ جنوری 1960ء میں رسول اکرمؐ کے نام سے شائع ہوا، جس میں سیرت النبی ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر مثلاً نبوت محمدیؐ کی ضرورت، رسول اکرمؐ اور انقلاب عالم، رسول اکرمؐ کی دعوتی زندگی اور معراج النبی ﷺ کے عنوانات پر مضامین لکھے گئے ہیں۔ دراصل بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں محبت وعقیدت کے چند پھول پیش کئے گئے ہیں۔

2۔**نقشِ دوام**: آپ نے اپنے والد محترم محبوب الاولیاء حضرت مولانا شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی کے مکاتیب کا مجموعہ ''نقش دوام'' کے نام سے ترتیب دے کر نومبر 1960ء میں شائع کیا، جو تصوف واحسان اور اصلاح معاشرہ کا ایک سدابہار گلدستہ ہے۔ جس کی خوشبو سے مشام جاں معطر اور جن کی روشنی سے قلب ونظر منور ہوجاتے ہیں۔

3-**حدیثِ اقبال**: علامہ اقبال کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے آپ کے ادبی وتنقیدی مقالات کا ایک مجموعہ جون 1961ء میں حدیثِ اقبال کے نام سے شائع ہوا۔ جس پر مشہور ماہر اقبالیات ڈاکٹر یوسف حسن خان نے ایک گراں قدر پیش لفظ لکھا۔ یہ کتاب دراصل کلام اقبال کے آئینہ میں پیامِ اسلام ہے۔ اقبال کا یہ پیام ملت کے ان شاہین صفت نوجوانوں کے نام ہے جن کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو۔ چنانچہ یہ کتاب طلبا اور نوجوانوں میں بے حد مقبول ہوئی۔

یہ کتاب فروری 1997 میں اقبال پر لکھے گئے کچھ مضامین کے مزید اضافے کے

ساتھ ''**اقبال۔شخصیت اور پیام**'' کے نام سے مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہوئی۔اس کتاب کا دوسرا نیا ایڈیشن 2005ء میں شائع ہوا ہے۔

4- **افکار واقدار** : آپ کے ادبی وتنقیدی مقالات کا مجموعہ افکار واقدار کے نام سے جولائی 1976ء میں شائع ہوا، جو اسلامی افکار اور ادبی اقدار کے حسین امتزاج کے ساتھ جدید ادبی تنقید کا نمائندہ ہے۔ 2007ء میں بعض نئے مضامین کے اضافے کے ساتھ اس کا نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

5- **حیاتِ دوام** : جنوری 1994ء میں آپ نے اپنے والد محترم حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی کی سوانح شائع کی یہ دراصل بہار کے ایک گمنام مگر باکمال مرد درویش اور مجاہد جلیل، محبوب الاولیاء حضرت مولانا شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی کی حیات وتعلیمات پر مشتمل ایک ایسی سوانح ہے جو اس دور کی پوری تاریخ پیش کرتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبدالباری ''سوانح اتنی دلچسپ اور پرکشش ہے کہ پڑھتے تو ناول کا لطف حاصل ہوتا ہے اور طیب صاحب کے بیانیہ کی داد دینی پڑتی ہے۔اسلام کی سیدھی سچی تعلیمات انسانی زندگی کو کس سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔اس کا دلکش مرقع سامنے آتا ہے''۔اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن مصنف کی نظر ثانی اور حذف واضافہ کے بعد اپریل 2007ء میں شائع ہوا۔

6- **سفرنامہ حرمین شریفین** : مارچ 1998ء میں آپ کو حج مبرور کی سعادت حاصل ہوئی۔ چنانچہ حج سے واپسی کے بعد ہم لوگوں کی خواہش پر آپ نے ''سفرنامہ حرمین شریفین'' تحریر کیا۔ یہ کتاب اگست 1999ء میں شائع ہوئی۔اس مختصر سفرنامہ میں ذاتی احوال وواقعات کے ساتھ مکہ المکرّمہ اور مدینہ منورہ کے مقامات مقدس کا ذکر، مناسک حج کے مقامات منٰی، عرفات، مزدلفہ، رمی جمار کے ہجوم کی تصویریں اس طرح آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں گویا مصنف کے ساتھ خود قاری بھی شریک سفر ہے۔

7- **ادبی اشارے** : فروری 1954ء میں ماہنامہ ''نئی نسلیں'' لکھنؤ کا اجراء ہوا، جو

1958ء تک جاری رہا۔جس کے ٹائٹل پر صرف دو نام ''م نسیم اور طیب عثمانی'' بطور مدیر شائع ہوتے تھے۔اور آپ دونوں ہی باری باری سے ادب کے مختلف مسائل پر اداریئے لکھتے تھے۔اسی طرح جب اگست 1993ء میں ماہنامہ پیش رفت دہلی جناب عزیز بگھروی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا۔تو وہ ہم فکر ادیبوں سے اس کے اداریئے پیش نامہ کے عنوان سے لکھوانے لگے۔ چنانچہ آپ نے بھی جدید ادبی مسائل پر پیش رفت میں درجنوں اداریئے لکھے۔''ادبی اشارے'' ان دونوں رسالوں میں لکھے گئے آپ کے منتخب ادبی اداریوں کا مجموعہ ہے، جو ستمبر 2002ء میں شائع ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ نئی نسلیں اور پیش رفت کے اداریوں کا یہ مجموعہ ''ادبی اشارے'' گلہائے رنگارنگ کا مصداق ہے۔اور 1954ء سے 2001ء تک کے درمیان تقریباً 50 برس کے گیپ یا فاصلہ کے باوجود فکر ونظر کے مباحث اور انداز نظر کی پیش کش میں کچھ زیادہ فرق محسوس نہیں ہوتا۔

8- **صحرا میں اذان**: آپ کے سیاسی، سماجی اور اجتماعی مسائل پر مضامین کا ایک مجموعہ ''صحرا میں اذان'' کے عنوان سے جنوری 2004ء میں شائع ہوا۔آپ کی صحافتی زندگی کا آغاز 1954ء میں ہفتہ روزہ ''نقیب'' پھلواری شریف پٹنہ کے مدیر کی حیثیت سے ہوا۔ پھر زندگی کے مختلف اتار چڑھاؤ کے بعد ملک کے مختلف اخبارات ورسائل خصوصاً سہ روزہ دعوت دہلی اور ماہنامہ ''افکار ملی'' دہلی میں اکثر ملی وملکی مسائل پر اور حالات حاضرہ پر آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ملک کے موجودہ حالات میں امت مسلمہ کی سیاسی واجتماعی تربیت کے لئے ان کی افادیت اور ضرورت واہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔اسی احساس کے پیش نظر ان کے منتخب مضامین کا مختصر مجموعہ شائع کیا گیا ہے۔

9- **شخصیات، جن کی نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشین** : بیسویں صدی کے آغاز میں ملت اسلامیہ ہند میں ایسی شخصیات بڑی تعداد میں پیدا ہوئیں، جنہوں نے اپنے فکر وعمل سے زندگی کے ہر شعبہ میں ملت اسلامیہ کو نئی روشنی اور نیا جوش و

ولولہ عطا کیا۔ ملت کی یہ شخصیات اس لائق ہیں کہ ہماری نئی نسل ان سے واقف ہوں۔ چنانچہ آپ نے اپنی اس کتاب میں صرف ان شخصیات کا ذکر کیا ہے جن کے دینی و علمی کارناموں سے آپ براہ راست واقف ہوئے، یا جن سے فیضان حاصل کیا، جن کے ساتھ آپ کی زندگی کے شب وروز گذرے۔ یہ تمام مضامین آپ کے ذاتی تعلقات و تاثرات پر مبنی ہیں۔ یہ کتاب شخصیات کے عنوان سے جنوری 2006ء میں شائع ہوئی۔

10-**اسلامی معاشرہ** : یہ کتاب آپ کے ان پانچ مضامین کا مجموعہ ہے، جو مختلف مواقع پر اسلامی معاشرے کی تشکیل، اسے صحیح خطوط پر استوار کرنے اور نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے پیش نظر تحریر فرمائے تھے۔ ہمارا مسلم معاشرہ جیسا کچھ بھی ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ تہذیب مغرب کے اثرات، مادیت اور دنیا طلبی نے اسے پارہ پارہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ فکر اسلامی اور اخلاقی اقدار کے تناظر میں مسلم معاشرے کی نئی تہذیب و تعمیر کی جائے، تاکہ تزکیہ اور تربیت سے حقیقی اسلامی معاشرہ تشکیل پا سکے۔ یہ کتاب مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی نے اپریل 2007ء میں بڑے اہتمام سے شائع کی ہے۔

11-**خیابانِ خیال**: آپ کے کاغذات میں مجھے آپ کے خطوط بھی بڑی تعداد میں ملے ہیں۔ چونکہ آپ اپنے اکثر مضامین دو بار لکھنے کے عادی تھے۔ پہلی بار کی تحریر میں قطع و برید اور حذف و اضافہ پر مشتمل ہوتی تھی اسی لیے وہ بطور آفس کاپی موجود رہ جاتی تھی۔ چنانچہ خطوط میں بھی یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ اس لئے آپ کے خطوط کی تلاش مشکل نہ رہی، اکثر خطوط کی نقل فائل میں موجود ہے، یہ خطوط ملک کی مختلف شخصیات کے نام متنوع موضوعات علمی و ادبی، ملی و اجتماعی، سماجی، سیاسی اور تعزیتی و گھریلو مسائل پر تحریر کئے گئے ہیں۔ جون 2016 میں یہ مجموعہ مکاتیب نئی ترتیب اور توضیحات و حواشی کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا۔

زندگی کے آخری ایام اور وفات : میں نے جب سے ہوش سنبھالا حضرت والد ماجد علیہ الرحمہ کو بیمار اور اختلاج قلب کا مریض پایا۔ اس کے باوجود انہیں

پیشہ کی تعلیمی و تدریسی ذمہ داریوں کی ادائیگی اور شہر کی تمام ملی و دینی اور تحریکی سرگرمیوں میں متحرک کردار ادا کرتے ہوئے دیکھا، اور ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری رہتا۔ البتہ شہر سے باہر کہیں کا سفر یا آنا جانا نہیں ہوتا تھا، صرف گرمیوں کی تعطیل میں اپنے آبائی گاؤں ''سملہ'' جو رفیع گنج ریلوے اسٹیشن سے 6 میل جنوب میں واقع ہے، اپنے پورے خاندان کے ساتھ ضرور جاتے تھے، مگر گذشتہ 25 برسوں سے یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ رشتہ داروں کے یہاں شادی بیاہ، جینے مرنے میں بھی انہیں کہیں آتے جاتے بہت کم دیکھا، ایسے موقع پر یا تو والدہ جاتیں یا پھر مجھے بطور نمائندہ بھیجا جاتا۔ ادھر تقریباً پندرہ برسوں سے انجائنا کے مرض میں مبتلا تھے اور قلب کی باضابطہ تکلیف رہتی تھی۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ قلب کا آپریشن کرایا جائے کیونکہ اکثر شریانیں بند ہو چکی ہیں، مگر آپ اس کے لئے کسی طرح راضی نہ ہوئے اور دواؤں سے علاج پر مصر رہے۔ آپ کے ایک تحریکی رفیق ڈاکٹر جاوید اختر صاحب جو ماہر امراض قلب ہیں جب بھی لندن سے اپنے وطن گیا آتے تو ہمارے یہاں آکر آپ کا تفصیلی معائنہ کرتے اور نسخے لکھتے۔ نسخے پر یہ بھی لکھتے کہ ضرورت قلب کے آپریشن کی ہے، مگر مریض کے اصرار پر صرف دوائیاں لکھی جا رہی ہیں۔ وہ ساری دوائیں والد مرحوم خود سے پابندی وقت کے ساتھ کھاتے۔ ڈاکٹر جاوید اختر صاحب نے لندن سے ایک ان ہیلر In Hailer لا کر دیا تھا۔ جب درد اٹھتا تو منہ میں پمپ کرتے تو دس منٹ میں آرام ہو جاتا۔ گذشتہ دو برسوں سے وہ زیادہ ذی فراش ہو گئے تھے، بہت بھولنے لگے تھے اسی لئے دوائیں ہمیشہ والدہ کھلاتی تھیں۔ اس بار مئی 2015ء میں ہماری بہن فوزیہ تاباں سلمہا اور ان کے شوہر ڈاکٹر معین الدین عارف جب گیا آئے تو والد اور والدہ دونوں عمرہ پر جانے کے لئے مصر ہو گئے۔ جب کہ ایسی صورت میں ان کا عمرہ کرنا ہم لوگوں کو بہت مشکل نظر آرہا تھا۔ بہر حال وھیل چیئر خریدی گئی اور والدین کو لے کر یہ لوگ مکہ چلے گئے۔ ایک ماہ کے اندر ہی عمرہ و مکہ و مدینہ کی زیارت کے بعد واپسی کے لئے اصرار شروع کر دیا، چنانچہ انہیں واپس لانے کے لئے یہاں سے میرے چھوٹے بھائی محمد علی غزالی سلمہ مکہ گئے، عمرہ کیا اور وہاں سے

اپنے منجھلے بھائی حماد عثمانی سلمہ کے ساتھ مل کر ان لوگوں کو گیا بخیر و عافیت واپس لائے۔ ایک ماہ ساتھ رہ کر حماد سلمہ سعودی واپس گئے، جہاں وہ طائف کے قریب الباحہ ایئر پورٹ پر بحیثیت جونیئر انجینئر کام کرتے ہیں اور بیس برسوں سے مع اہل وعیال وہیں مقیم ہیں۔ والد کی پریشانی اور بیماری کی ایک بڑی وجہ تنہائی رہی ہے۔ ہماری صرف ایک بہن مجاہدہ عثمانی سلمہا گیا میں رہتی ہیں وہی والدین کی دیکھ بھال اور خدمت کیا کرتی تھیں باقی ہم سب لوگ باہر رہتے ہیں۔ حالانکہ ادھر دو برسوں سے والد مرحوم کی خواہش رہتی تھی کہ ہم بھائیوں میں سے کوئی نہ کوئی گیا میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہے، روزی روٹی کے چکر میں ہم لوگ باہر رہتے تھے، ویسے باری باری وقت نکال کر گیا آنے کی کوشش ضرور کرتے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں زیادہ ان کے ساتھ رہوں۔ شاید انہیں مجھ سے تسکین زیادہ ہوتی تھی مگر میری مجبوری بھٹکل کی ملازمت تھی، چھٹیوں کا مسئلہ ہمیشہ دامن گیر رہتا۔ وہ گیا چھوڑنے کو کسی قیمت پر راضی نہ تھے، ایسی صورت میں غزالی سلمہ زیادہ گیا آتے جاتے رہتے تھے، کیونکہ وہ آزاد پیشہ ہیں اور اپنی تجارتی مصروفیات سے وقت نکال سکتے ہیں۔ لہذا اس بار بھی بقرعید کے موقع پر وہ مع اہل وعیال بنگلور سے گیا آئے۔ والد صاحب انہیں دیکھ کر خوش ہو گئے۔ کمزور تو بہت ہو ہی گئے تھے، تاہم المنار مسجد میں بقرعید کی نماز پڑھنے گئے واپس آ کر اپنے ہاتھوں سے بکرے کی قربانی کی۔ پھر مجھ سے ٹیلی فون پر گفتگو بھی ہوئی۔ لیکن بقرعید کے تیسرے دن شام میں اچانک قلب میں تکلیف شروع ہو گئی۔ جس کی خبر مجھے 12 بجے رات میں چھوٹی بہن مسلمہ عثمانی سلمہا نے دہلی سے دی۔ غزالی سلمہ نے ضروری دوائیں دیں اور فوری طور سے ان ہیلر بھی دیا، مگر فائدہ نہیں ہوا، پھر عارف بھائی سے ٹیلی فون پر مشورہ کیا، مزید دوائیں دی گئیں اور انجکشن لگایا گیا۔ جس سے سکون ہوا اور نیند آ گئی۔ مگر فجر کے بعد حالت زیادہ نازک ہو گئی لوگ ڈاکٹر لانے کو دوڑے مگر ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی ٹھیک 6 بجے صبح میں ۱۴ رذی الحجہ ۱۴۳۶ھ بمطابق ۲۹ رستمبر ۲۰۱۵ء کو روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بعد نماز عصر گیا میں نماز جنازہ ہوئی اس کے بعد آبائی وطن سملہ لے جایا گیا جہاں

بعد عشاء خانقاہ میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور خاندانی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی بال بال مغفرت فرمائے، تمام لغزشوں کو بخش دے، نیکیوں کو قبول فرمائے، اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین۔

سونور، ضلع ہاویری
کرناٹک

رشاد عثمانی
25-03-2017

○○○

مولانا طیب عثمانی مرحوم

□ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (لکھنؤ)

بہار کے عثمانی خاندان کے متعدد افراد نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی، ان میں قدیم ندوی فضلاء میں ایک ممتاز نام برادر گرامی مولانا طیب عثمانی ندوی کا بھی ہے، جن کا عصر اور میرا عصر ایک ہے، البتہ درجہ میں وہ مجھ سے دو تین سال پیچھے تھے، لیکن وہ زمانہ طالب علمی سے ہی سنجیدہ اور مطالعہ کے شائق تھے اور انتظامی صلاحیت کا بھی مزاج رکھتے تھے اور طلبہ کی انجمن کے تعلق سے بھی اچھی صلاحیت تھی۔ انجمن الاصلاح کے ناظم بھی منتخب کیے گئے اور یہ وہ سال تھا جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کو جمعیۃ علماء ہند کے لکھنؤ میں منعقدہ اجلاس اپریل ۱۹۴۸ء میں اس کے مندوبین اور مہمانوں کی ضیافت کا بھی موقع ملا، اور ان کی تکریم وضیافت کا ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا گیا کہ الاصلاح کی طرف سے ایک علمی وتاریخی نمائش کا انتظام کیا جائے، جس سے اچھی ضیافت طبع ہوگی۔ چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی سرپرستی ورہنمائی میں ناظم الاصلاح مولوی طیب عثمانی ندوی مرحوم اور ان کے رفقاء نے اس خدمت کو انجام دیا اور اس کا بہت مثبت اثر بھی سبھی مندوبین، مہمانوں اور قائدین ملت وعلماء پر پڑا اور اس کا سب سے زیادہ اظہار قدردانی صدر جمعیۃ علماء شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور بانی مسلم مجلس مشاورت ڈاکٹر سید محمود نے کی۔ جیسا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ڈاکٹر سید محمود

مرحوم کے تذکرہ میں ذکر کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس وقت بہار کے وزیر تعلیم تھے۔ انھوں نے از راہ قدردانی پٹنہ جا کر اپنے محکمہ کی طرف سے ''انجمن الاصلاح'' کو دو سو روپے بھجوائے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ان کی یادگار نمائش کے متعلق جو تحریر کیا ہے، وہ اس طرح ہے:

''اپریل ۱۹۴۸ء میں جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا، مندوبین اور مہمانوں کا قیام دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں تھا، مجھے خیال ہوا کہ اگر اس موقع پر معزز وذی علم مہمانوں کی ضیافت طبع کے لیے طلبہ کی ''انجمن الاصلاح'' کی طرف سے ایک علمی وتاریخی نمائش کا انتظام کیا جائے تو ہر طرح موزوں اور برمحل ہوگا۔ اس وقت عزیزی مولوی طیب عثمانی ''الاصلاح'' کے ناظم تھے، میں نے والد ماجد حکیم سید عبدالحی صاحب کی عربی تصنیفات ''**نزهة الخواطر**'' کی آٹھ جلدوں اور ''**معارف العوارف فی انواع العلوم والمعارف**'' کی مدد سے ایسے تاریخی معلوماتی چارٹ تیار کیے جن کو دیکھنے سے ایک نظر میں معلوم ہوجاتا تھا کہ ہندوستان کے ہزار سالہ اسلامی عہد میں ہر علم وفن میں کون کون سی اہم شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ علماء ہند کی وہ تصنیفات کون کون سی ہیں جو بین الاقوامی شہرت رکھتی ہیں اور تاریخ اسلام کے پورے علمی ذخیرہ میں ان کی امتیازی شان کیا ہے، ہندوستان میں کس کس دور میں کون کون سے علمی و روحانی مراکز تھے اور کہاں کہاں بڑے مدارس قائم ہوئے؟ نظام و نصاب تعلیم میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں؟ مختلف زمانوں میں کیا کیا معیار فضیلت رہے؟ غرض چند نقشوں میں ہندوستان کی علمی ودینی تاریخ کا ابھرا ہوا خاکہ اور ہزاروں صفحات کا عطر کھینچ کر آ گیا تھا، سینکڑوں آدمیوں نے ان علمی نمائش کی سیر کی، لیکن اس سب سے زیادہ دلچسپی دو صاحبوں نے لی۔ ایک صدر جلسہ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے، دوسرے ڈاکٹر سید محمود صاحبؒ نے، ڈاکٹر صاحبؒ اس وقت بہار کے وزیر تعلیم تھے، انھوں نے از راہ قدردانی پٹنہ جا کر اپنے محکمہ کی طرف سے انجمن الاصلاح کو دو سو روپے بھجوائے۔'' (پرانے چراغ، ج:۱، ص:۳۳۶)

مولانا طیب عثمانی مرحوم دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہوکر اپنے وطن گیا چلے گئے اور فکر اسلامی وصحافتی کاموں میں مشغول ہوئے۔ جماعت اسلامی کے تحت ایک رسالہ ''نئی نسلیں'' جماعت کے ایک مقامی رکن م۔نسیم صاحب کی شرکت سے لکھنؤ میں جاری کیا، جوان دونوں کی ادارت میں لکھنؤ سے نکلتا رہا، اسی وجہ سے انھیں اپنے وطن سے دوبارہ لکھنؤ آکر قیام کرنا پڑا تھا، پھر وہ واپس اپنے وطن بہار چلے گئے تھے، ان کا مزاج تحریکی تھا اور وہ اس سلسلہ میں جماعت اسلامی سے بھی وابستہ تھے اور ان کے مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ بعض کتابیں بھی لکھیں اور ان کے چھوٹوں نے ان سے تربیت بھی لی۔ بہار کے اس عثمانی خاندان کے متعدد افراد اچھے قلم کار بنے، جن میں خاص طور پر پروفیسر محسن عثمانی ندوی، امین عثمانی ندوی اور خود ان کے بیٹے شاہ رشاد عثمانی قابل ذکر ہیں۔ شاہ رشاد عثمانی نے تدریسی خدمات بھی انجام دیں اور عرصہ تک وہ جنوبی ہند میں اس کے مشہور علمی و ادبی گہوارہ بھٹکل میں ایک کالج میں استاد رہے اور اس کے ساتھ لکھنے لکھانے کا بھی سلسلہ جاری رکھا۔ اور شعر وادب پر ان کی کئی کتابیں سامنے آئیں۔ اس وقت بھی موصوف کا یہ مشغلہ جاری ہے۔ فی الحال کرناٹک میں ایک کالج میں استاذ ہیں۔

افسوس ادھر کئی سال سے مولانا طیب عثمانی مرحوم گیا شہر میں اپنے ایک چھوٹے اور سادہ مکان میں اپنی علالت اور اعذار کی بنا پر محصور ہوکر رہ گئے تھے اور اپنی ملی تحریکی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہوگئے تھے، اپنے ایک گیا کے سفر میں ان کی عیادت کو جانے کا بھی موقع ملا، وہ اپنے پرانے تعلق کی بنا پر بہت خوش ہوئے اور پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔ وہ قلب کے مریض تھے، بظاہر یہی مرض ان کی وفات کا سبب بنا۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور راضی ہو۔

۱۴/ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ مطابق ۲۹/ستمبر ۲۰۱۵ء کو ان کی وفات ہوئی۔ اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے حسنات کا انھیں صلہ عطا کرے۔ آمین!

○○○

مولانا طیب عثمانی مرحوم ایک پیاری شخصیت

❑ جناب محمد جعفر (نئی دہلی)

مولانا طیب عثمانی کی صحبت میں رہ کر اُن سے فیضیاب ہونے کا مجھے موقع تو نہ مل سکا لیکن حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے ابتدائی زمانے میں جب کہ میں پٹنہ میں طالب علم تھا گیا شہر کے رفقاء سے اُن کی تعریفیں سنتا رہا اور ملنے کا اشتیاق رہا۔ گیا میں حلقہ طلبہ کے ساتھیوں کے لئے اُن کی شخصیت کچھ ایسی ہی تھی، جیسی پٹنہ میں ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم کی۔ طلبہ ونوجوان اُن کی علمی حیثیت اور پیاری شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ موصوف بھی طلباء اور نوجوانوں کو بہت عزیز رکھتے تھے، اُن کی علمی وفکری رہنمائی اور اصلاح وتربیت بے تکلف ماحول میں کرتے رہتے تھے۔ مولانا طبعاً تنہائی پسند تھے۔ خانقاہی سلسلہ سے تعلق بھی تھا شاید اس کا بھی کچھ اثر اُن کے مزاج پر تھا لیکن علم کی گہرائی اور تحریکی ماحول نے انہیں وسیع المشرب بنا دیا تاہم وہ فیلڈ میں ایک حد تک ہی آگے بڑھے۔

قرآن وحدیث اور اسلامی لٹریچر سے شغف کے ساتھ ساتھ ادب اُن کا خاص میدان تھا۔ عربی، فارسی اور اُردو زبان پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔ میں تو سائنس کا طالب علم تھا اور زبان وادب سے اتنا آشنا بھی نہیں۔ لیکن جن کا یہ میدان ہے وہ اس میدان میں اُن کے مقام ومرتبہ سے بخوبی واقف ہیں۔ رفیقانہ تعلق وقربت کی وجہ سے مجھ جیسے بے ادب کو بھی اُنہوں نے اپنی

بعض تصانیف سے نوازا۔

صحافتی ذوق بھی اُن کا بلند تھا۔ بھٹو مرحوم کی پھانسی کے بعد کمیونسٹوں نے پورے ہندوستان میں جو وحشیانہ حرکتیں کیں اور قتل وغارت گری کا جو بازار گرم کیا، اُس سے متاثر ہو کر مولانا علی میاں مرحوم کا معرکۃ الآرا تاثراتی بیان لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہوگا اُسی موقع پر ایک شاندار مضمون مولانا طیب عثمانی مرحوم کا دعوت میں شائع ہوا۔ ان دونوں کو یکجا کر کے کثیر تعداد میں تقسیم بھی کرایا گیا جس کی بڑی پزیرائی ہوئی۔ اسی مضمون سے متاثر ہو کر دعوت نے جب ہفتہ وار ایڈیشن شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو مولانا سے یہ خواہش کی گئی کہ وہ اس کی ادارت کے لئے آمادہ ہو جائیں لیکن موصوف دہلی آنے کو تیار نہ ہوئے۔

خانقاہی مزاج رکھنے کے باوجود مولانا سیاسی ذہن کے مالک تھے اور عملی سیاست سے بھرپور دلچسپی رکھتے تھے لیکن عملی سرگرمیوں میں دلچسپی کے باوجود کبھی حصہ نہیں لیا۔ گیا کے ہفتہ وار اجتماع میں بالعموم حالات حاضرہ پر تبصرہ آپ ہی کا ہوا کرتا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ گوشہ گیر ہوتے ہوئے بھی ملی، ملکی اور عالمی سیاسی حالات سے وہ اَپڈیٹ بھی ہیں اور خاصہ فکرمند بھی۔ الیکشن کے مواقع پر شہر کے دانشوروں اور سیاست دانوں سے تبادلۂ خیال کی مجالس میں موثر حصہ لیتے تھے اور جماعت کی بہتر نمائندگی فرماتے تھے۔

مولانا گرچہ بہت سرگرم نہیں تھے لیکن اندرون وبیرون جماعت پسند کئے جاتے تھے۔ خدمت خلق کے کاموں میں بھی خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ اسلامی سوشل سروس سوسائٹی کے تحت کام کے آغاز کے فیصلے اور اُس کے نفاذ میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے رہے۔ ملت اسپتال کے قیام اور اس کی ترقی میں اہم رول ادا کیا۔ اسی طرح اقراء اسکول کے سلسلے میں بھی دلچسپی لیتے رہے۔

مولانا سے استفادہ کی خواہش مقام سے لے کر حلقہ تک جماعت کے اندر پائی جاتی

رہی چنانچہ ایک مرتبہ امیر مقامی مقرر ہوئے اور ایک مرتبہ حلقہ کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی منتخب ہوئے لیکن اپنی تنہائی پسند طبیعت کی وجہ سے وہ گوشہ نشیں ہوتے چلے گئے۔ آخر عمر میں تو وہ اپنے گھر میں بھی اپنے کمرے میں ہی محصور رہنا پسند فرماتے تھے تاہم لوگ اُن سے ملاقات کے لیے جب بھی جاتے وہ خندہ پیشانی سے ملتے اور دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ لوگوں کو بھی اُن سے مل کر خوشی ہوتی اور استفادہ کی خواہش برقرار رہتی تھی۔ اُن کی پر وقار شخصیت متضاد صفات اور عادات کے باوجود پر کشش اور پیاری سی تھی۔ گوشہ میں رہتے ہوئے لوگوں سے محبت اور احترام کا رشتہ برقرار رہا۔ دل والے تھے اور اہل دل کا احترام وخیال رکھنے والوں میں تھے۔ محترم ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب مرحوم نے جب ''انقلابی تحریک'' لکھی تو میں نے مولانا کی خدمت میں اسے پیش کرتے ہوئے گزارش کی کہ وہ اس کا علمی جائزہ لیں تو موصوف نے معذرت کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب اہل دل ہیں اُن کو چھیڑنا ٹھیک نہیں ہے۔

بہتوں کی طرح میں بھی مولانا کی خوبیوں اور صفات کا قدردان رہا ہوں، اسی لئے عزیزی شاہ رشاد عثمانی جو مولانا کے بڑے فرزند اور لائق اولاد ہیں، کی اس خواہش کا احترام کرنے پر خود کو مجبور پایا کہ اُن کی یاد میں کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کروں۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے۔ اُن کی خدمات جلیلہ کو شرف قبولیت بخشے اور بہترین اجر سے نوازے اور ہم سب کو نیک توفیق بخشے۔ آمین!

○○○

مولانا طیب عثمانی ندوی: چند یادیں چند باتیں

□ پروفیسر احمد سجاد (رانچی، جھارکھنڈ)

مولانا طیب عثمانی ندوی صاحب سے پچھلی نصف صدی سے زاید کی مخلصانہ قربت کی بنا پر سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا تذکرہ کہاں سے شروع کرکے کہاں ختم کروں۔ یہ بھی یاد نہیں آتا کہ موصوف سے کب اور کہاں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ البتہ ان کی روشن پیشانی، ستواں ناک، شہابی آنکھیں، نورانی چہرہ، گورا رنگ، مشرقی وضع قطع، کبھی شیروانی تو کبھی سادہ کرتے پائجامے میں ان کا مسکراتا چہرہ، متبسم دلنواز انداز، ان کی یاد کے ساتھ ہی پردۂ ذہن پر نقش رہتا ہے۔ طویل العمری اور کمزور صحت کے باعث مولانا اکثر اپنے کمرے ہی میں نظر آتے مگر کبھی ان کا چہرہ میلا نظر نہیں آیا۔ مسکراتے ہوئے مصافحہ کے ساتھ اپنی نشست گاہ میں نہایت محبت وشفقت سے بٹھاتے اور پھر جلد ہی کسی طرح کے پھل یا گیاوی قلچے سے خاطرداری بھی ضرور ہی کرتے۔

دوران ملاقات ان کے بعض احباب اور جونیر معتقدین آجاتے تو سب کی اسی خلوص و محبت سے پذیرائی ہوتی اور پھر ملک وملت یا ادب وتحریک کے کسی نہ کسی تازہ مسئلہ یا صورت حال پر باہمی تبادلۂ خیال کا سلسلہ چل نکلتا۔ مولانا ہر مسئلہ میں اپنی جچی تلی رائے بڑے مدلل مگر نرم اور سلیقے کے ساتھ معتدل انداز میں اس طرح پیش کرتے کہ سننے والے اختلاف رائے کے باوجود ان کی خوش اسلوبی سے مسرور اور مطمئن ہوجاتے۔ ان کے حلقۂ احباب میں بڑی وسعت تھی تحریکی، غیر تحریکی، تصوف کے موید ومخالف، سیاسی و غیر سیاسی، چھوٹے بڑے، بریلوی،

دیوبندی، ترقی پسند اور اسلام پسند غرض ہر مکتب فکر ونظر سے ان کا ربط بڑا مخلصانہ تھا، اس لیے وہ نہ کسی سے شاکی رہتے نہ دوسرے ان سے ناخوش۔

گیا کے تحریکی حلقے میں ان کی حیثیت ہمیشہ ایک مربی اور خاموش طبع مرشد و پیر کی رہی، تقسیم ملک سے قبل مولانا ندوہ اور لکھنؤ کے تعلیم یافتہ اور صحبت یافتہ تھے نیز خود ایک معروف صوفی خانوادہ سے تعلق تھا اس لیے گفتگو میں ملاحت وملائمیت کا احساس ہوتا۔ وسعت مطالعہ اور دینی وعلمی دلائل کے ساتھ بالعموم ان کی رائے ناقابل تردید ہوتی۔

بہار کے بعض شہروں کی تحریکی وعلمی اور سماجی زندگی میں نام ونمود سے بے نیاز اپنے مخلصانہ عمر بھر کے ریاض سے بعض شخصیات نے وہاں مخلصین کی ایک کارکرد ٹیم تیار کرنے میں بڑا خاموش کلیدی اور فیصلہ کن رول ادا کیا ہے۔ پٹنہ میں ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب، دربھنگہ میں حسنین سید صاحب، سہسرام میں مولانا ارتضاء الدین حاذق ضیائی صاحب، بہار شریف میں نسیم احمد صاحب اور گیا میں مولانا طیب عثمانی ندوی صاحب وغیرہم۔ پورے متحدہ بہار (بشمول جھارکھنڈ) میں جماعت اسلامی کے زیر اثر افراد واداروں کی جو سب سے جاندار ٹیم ہے وہ گیا کی ہے، جہاں ملت اسپتال، شتابدی 2+ اسکول، اقرا اکیڈمی، مولانا مودودی فاؤنڈیشن، بودھ گیا کا دعوتی مرکز وغیرہ کے فروغ وارتقا میں مولانا کا خاموش عمل کسی جسم میں تازہ خون کی طرح گردش کرتا رہا۔

ان کی متوازن شخصیت کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے گھر اور گھر سے باہر کی زندگی کو کبھی غیر متوازن ہونے نہیں دیا۔ موصوف نے اپنے چھ بچوں کی تعلیم وتربیت میں بڑے سلیقے اور توجہ سے کام لیا۔ جس کے نتیجے میں سب کے سب ماشاءاللہ دینی ودنیوی دونوں اعتبار سے ملک اور بیرون ملک میں کامیاب زندگی بسر کررہے ہیں۔ حدیث اقبال کے بعد مولانا کے اولین تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''افکار واقدار'' کے عنوان سے جولائی ۱۹۷۶ء میں چھپا اور ازراہ محبت انہوں نے محض دو ماہ کے بعد اکتوبر میں اس خاکسار کو یہ مجموعہ عنایت کیا، خاکسار کا یہ عالم

کہ سرورق پر ''طیب عثمانی'' کے نیچے بریکٹ میں ''ندوی'' لفظ تحریر کیا۔ اس مجموعہ کا ''انتساب'' ''نئی نسل کے نام'' ہے، جن کے نمائندے ان کے ''عزیز بچے'' ہیں۔ جو بقول مولانا ''انشاء اللہ مستقبل کے ادب وزندگی میں صحت مند افکار اور اخلاقی اقدار کے امین ثابت ہوں گے''۔ مولانا کے حسن نیت اور عمل خیر کا نتیجہ ہے کہ ان کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی آج اردو کے معروف ناقد و محقق ہیں اور جن کی نصف درجن سے زاید کتابیں ادبی دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

ندوہ میں تعلیم اور لکھنؤ کے قیام نے مولانا کی شخصیت میں چار چاند لگا دیے۔ وہاں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی علمی تربیت، مولانا عبدالغفار ندوی کی تحریکی صحبت، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات اور ان کی تصانیف سے استفادہ اور م۔نسیم کی رفاقت نے ان کی علمی وادبی اور صحافتی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ نئی نسلیں کی ادارت نے ادارۂ ادب اسلامی ہند کی گویا نیو رکھدی۔ اس کے علاوہ متعدد اخبار ورسائل میں صحافتی ذمہ داریاں ادا کیں۔ اور ان کا قلم پھر تو عمر بھر رواں رہا چنانچہ مندرجہ ذیل چھوٹی بڑی مختلف النوع تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں:

(۱) نقش دوام (شاہ محمد قاسمؒ کے مکاتیب کا مجموعہ)
(۲) حدیث اقبال (دوسرا ایڈیشن بنام اقبال- شخصیت و پیام)
(۳) رسول اکرمؐ
(۴) افکار واقدار (تنقیدی مقالات کا مجموعہ)
(۵) حیات دوام (سوانح قاسم فردوسیؒ)
(۶) سفرنامہ حرمین شریفین
(۷) ادبی اشارے (''نئی نسلیں'' لکھنؤ، ''پیش رفت'' دہلی کے اداریوں کا مجموعہ)
(۸) صحرا میں اذان (سیاسی، سماجی مضامین کا مجموعہ)
(۹) شخصیات

(۱۰) اسلامی معاشرہ
(۱۱) خیابان خیال (مرحوم کے مکاتیب کا زیر ترتیب مجموعہ۔ مرتب ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی)

ان کی علمی وادبی تصانیف سے ایک عامی بھی باآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ مولانا کی علمی شخصیت بڑی ہمہ جہت اور ہمہ صفت تھی۔ تنقید، تحقیق، اقبالیات، اسلامیات، تصوف اور سیاسیات میں ان کی یکساں دلچسپی تھی۔ مولانا کے قول وفعل اور تحریر وعمل میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ اپنی کتاب ''افکار واقدار'' کے فلیپ پر انہوں نے اپنی فکری وعملی زندگی کے جن عناصر ثلاثہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی پوری زندگی ان کو عملی جامہ پہنانے میں گزری:

''میری ذات کی تعمیر میں تین عناصر: ادب، مذہب اور اجتماعیت کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان عناصر نے میرے ادبی وفکری انداز نظر کی ایسی مستحکم تشکیل کی ہے جو عالمگیر دائمی اخلاقی اصولوں پر قائم ہیں اور جو آج بھی ادب وفن کے ذریعہ تہذیبی اقدار کی نئی تعمیر وتشکیل کر سکتی ہیں۔''

مولانا صوفی و ندوی خانوادے سے تعلق رکھنے کے باوجود سیاسی وسماجی تبدیلیوں، تہلکوں اور مسائل پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور ان پر برملا زبانی وتحریری اظہار خیال کرنے میں بھی نہیں چوکتے تھے، ان کے بزرگوں نے جدوجہد آزادی میں بقدر ذوق وظرف عملی حصہ لیا۔ جمعیۃ علماء ہند، امارت شرعیہ اور جماعت اسلامی ہند سے تعلق رکھا اور مسلم لیگ کی عملاً مخالفت کی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جے پرکاش نرائن کی سمپورن کرانتی کی مہم، ایمرجنسی کا نفاذ اور بابری مسجد کی شہادت کا دور اس ملک کا ایک بڑا بحرانی دور تھا۔ اس زمانے میں جماعت اسلامی ہند میں بھی سیاسی حکمت عملی اور سیاسی عمل آوری پر نظری بحثیں اپنے شباب پر تھیں۔ مولانا ان مسائل و مباحث پر گہری نظر رکھتے تھے اس لیے اس دور میں جب بھی ان سے ملاقاتیں ہوئیں ان مسائل پر انہوں نے اپنی جچی تلی رایوں کا برملا اظہار کیا اور بعض اوقات اپنی خیال انگیز تحریریں بھی عنایت

کیں۔ان مسائل پر مولانا کے علاوہ ڈاکٹر عبدالمغنی مرحوم کی آرا سے خاکسار کا بہت حد تک اتفاق تھا اس لیے ان مسائل کے مختلف پہلوؤں پر ہماری طویل ملاقات و گفتگو بھی ہوا کرتی تھی۔مولانا ادب و اخلاق کو بہرصورت لازم و ملزوم قرار دیتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ:

''زندگی صرف حسن، خیر اور آسودگی ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ اس میں شر، ناآسودگی اور بدصورتی بھی شامل ہے۔اس صورت میں ادب اور اخلاق دونوں ہی کا فرض ہو جاتا ہے کہ ان کے ذریعے زندگی میں اعلیٰ اخلاقی جذبات ابھریں اور پروان چڑھیں۔پست جذبات و محرکات دبیں اور فنا ہوں۔''

ادب میں معیار و اقدار کے مسئلہ میں ان کا نقطۂ نظر بہت واضح تھا کہ ادب محض خوش وقتی اور ذہنی عیاشی نہیں ہے بلکہ علم و دانش کا ایک حصہ اور زندگی کا ایک صحیفہ ہے۔

اپنے ادبی نقطۂ نظر کو واضح کرتے وقت وہ کہتے ہیں کہ فکر و فن باہم اس طرح ہم آمیز اور رچے بسے ہوں کہ دونوں کے درمیان کوئی خط امتیاز نہ کھینچا جا سکے۔ان کی وسعت نظری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزی زبان و ادب کا براہ راست مطالعہ نہ کرنے کے باوجود ترجمہ وغیرہ کے ذریعہ اپنی واقفیت کی بنیاد پر ان کا اصرار تھا کہ اردو کے ہر ادیب اور فنکار کو انگریزی ادب کے تخلیقی و تنقیدی شاہکاروں کا فی زمانہ مطالعہ بہت ضروری ہے۔

وہ علم و عمل کے ہر میدان میں ''وحدت فکر و نظر'' کے قائل تھے۔انہوں نے تخلیق ادب کی جن تین شرطوں پر زور دیا ہے اس کی اہمیت و افادیت سے آج ہی نہیں کسی زمانے میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔وہ ہیں: (۱) نظریہ (۲) فنی کمال اور حسن کاری نیز (۳) اخلاقی اقدار کا اتباع۔بقول اقبال:

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

ادب و تنقید کے مختلف مسائل پر مولانا کی نظر غائر تھی انہوں نے ادبی فروگذاشتوں اور ان کے تدارک پر جن نکات کو پیش کیا ہے ان کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔مثلاً (۱) ماضی کے ادب سے بے توجہی (۲) زبان و بیان کی بے راہ روی (۳) پروپیگنڈا اور گروہ بندی (۴) خود ادیب کے فکر و عمل کا تضاد۔

ان کے نزدیک فنکار ترقی پسند ہو یا جدیدیت کا علمبردار، وہ کلاسیکی شاہکار نثری و شعری کارناموں پر جہاں گہری نظر رکھے وہیں جدید عصری مسائل و معاملات سے بھی بے نیاز نہ ہو۔ان سب کے ساتھ ''اچھے ادیب کے لیے اچھا انسان بننا بھی ضروری ہے''۔

مولانا طیب عثمانی ندوی اقبال کے فکر و فن کے رمز شناس ہی نہیں ان کے عاشق زار بھی تھے۔اقبال پر ان کی تصنیف کی قدر و قیمت کا اعتراف ڈاکٹر یوسف حسین خاں جیسے ماہر اقبالیات نے بھی کیا ہے۔مولانا اقبال کو ایک عہد آفریں شاعر تسلیم کرتے ہیں۔اقبال نے برہمن زادو ہندوستانی نژاد ہوتے ہوئے بھی اسلامی نشاۃ ثانیہ کے ذریعہ فکر و نظر میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔انہوں نے خودی، خودآگہی اور خودشناسی کے ذریعہ زندگی کے بنیادی حقائق کو شاعری کا موضوع بنایا اور شاعری کو بطور وسیلہ استعمال کیا:

نغمہ کجا و من کجا، ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم، ناقۂ بے زمام را

مولانا کے خیال میں اقبال نے دور جدید کی تمام بے اعتدالیوں اور انتہا پسندیوں کے تدارک کا ایک مجرب نسخہ با ایں الفاظ پیش کیا ہے:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لاالٰہ الا اللہ

اقبال نے ملت اسلامیہ کی غفلت شعاریوں پر جس طرح گرفت کی ہے، مولانا نے ان

نکات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔انہوں نے بتایا ہے کہ اقبال نے ''الخلق عیال اللہ'' کے ذریعہ توحید کا آفاقی تصور پیش کیا ہے۔مگر خرد کی تنگ دامانی اور نگہ کی نامسلمانی نے ان پاکیزہ تصورات سے کماحقہٗ استفادہ نہیں کیا۔

انہوں نے نام نہاد جمہوریت، ناپاک قوم پرستی، ذلیل ملوکیت، جابرانہ کلیت پسندی، وطن، رنگ ونسل کے امتیاز کی نفی کی ہے اور اقبال کے اس خیال کی تائید کی ہے کہ:

جلال پادشاہی ہو یا جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مولانا کا یہ خیال بجا تھا کہ اقبال ایک ایسے بحرانی دور میں پروان چڑھے جب ساری دنیا جنگ عظیم اول سے تہہ وبالا ہوکر دوسری جنگ عظیم کے تباہ کن مرحلے میں داخل ہونے والی تھی۔اس لیے ان کی یہ پیشن گوئی صحیح ثابت ہونے والی تھی کہ:

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اس کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

مزید یہ کہ:

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

مولانا کے خیال میں مغرب نے صنعتی ترقی اور سائنسی ارتقا کے ہتھکنڈوں سے ساری دنیا پر یلغار کر رکھی ہے۔اور نئے نئے خانہ زاد نظریات سے دنیا کو اپنے شکنجے میں کس رکھا ہے کیونکہ اشتراکیت میں اگر ''خروج'' ہے تو ملوکیت میں ''خراج''۔اس کے برعکس اسلام نے احترام آدم

اور نظریہ خلافت کے ذریعہ مردم کشی نہیں باطل کشی کی بہترین تعلیم دی ہے۔اگر اس نظریہ کو فروغ حاصل ہوا تو عالم پیر کی موت کے بعد ایک جہان نو ضرور پیدا ہوگا۔اسی خیال سے اقبال نے گوئٹے کے ''دیوان مغرب'' کے جواب میں ''پیام مشرق'' کے ذریعہ امت کی خودی کو مرد مومن کے ذریعہ بیدار کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ جہان نو کی امامت کے وہ لائق بن سکیں اور یہ تاکید کی ہے کہ:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اور یہ آفاقی تعلیم پیش کی ہے کہ:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مختصر یہ کہ مولانا طیب عثمانی ندوی صاحب کے علمی وادبی کارنامے آج بھی نہ صرف لائق مطالعہ ہیں بلکہ ان کے فکر ونظر کی ہمہ گیری وہمہ جہتی سے آج کے بہت سے الجھے ہوئے جدید علمی وادبی امور ومسائل کو حل بھی کیا جاسکتا ہے۔

○○○

رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

❑ ڈاکٹر حسن رضا (رانچی، جھارکھنڈ)

مولانا طیب عثمانی صاحب مرحوم مستند عالمِ دین ، بے ریا صوفی ، اور ایک معروف ادیب تھے۔ان کی یہ تینوں صفات بہت نمایاں ، صاف اور ہموار تھیں ۔ان میں کوئی داغ دھبہ نہیں تھا اور نہ کہیں کو بڑ، اور ترچھا پن۔ ورنہ بڑی بڑی شخصیتوں میں بھی کسی نہ کسی پہلو سے کہیں نہ کہیں ترچھی لکیریں ابھر آتی ہیں۔مولانا کے جینے کا ایک فطری انداز ، رہنے کا ایک خاص سلیقہ، ملنے جلنے میں ایک نفاست، لکھنے پڑھنے میں پاکیز گی تھی۔کہیں کسی چیز میں سختی درشتی نہیں، نہ پیچ وخم ، نہ نشیب وفراز تھا۔وہ گیا شہر میں جماعتِ اسلامی کی آبرو تھے،اپنوں اور پرایوں کے بیچ انہوں نے ایک آبرومندانہ زندگی گزاری۔

میری ان سے پہلی ملاقات گیا شہر میں جنوبی بہار کے دس روزہ تربیتی کیمپ میں ہوئی۔ انیس الدین مرحوم اس وقت امیرِ حلقہ بہار تھے۔ میں پٹنہ سائنس کالج میں بی، ایس ،سی کا اسٹوڈنٹ تھا اور وہیں سے ڈاکٹر ضیاء الھدیٰ مرحوم کے ساتھ اس پروگرام میں شریک ہوا۔ میں چونکہ نووارد تھا اس لیے کیمپ میں کسی سے شناسائی نہیں تھی۔

میں نے اس اجتماع میں غور کیا کہ ایک صاحب روزانہ درسِ حدیث دینے کے لیے تشریف لاتے ہیں چونکہ وہ باضابطہ شریک پروگرام نہیں تھے اس لیے درس سے تھوڑا پہلے حاضر ہو جاتے ۔ مجھے یہ منظر آج بھی یاد ہے کہ ایک گندمی بلکہ گورے رنگ کا ایک جوان ،دراز قد ، کالی

شیروانی،ٹوپی پہنے ہوئے ،سلیقے کے ساتھ ترشی ترشائی سیاہ گھنی داڑھی جو جذبۂ دینی اور جمالیاتی شعور کا اظہار کر رہی تھی ، وقت سے تھوڑا پہلے روزانہ اس طرح حاضر ہو جاتا ہے کہ جس سے حدیثِ جبرئیل یاد آجاتی ۔اور وہ بس درس دے کر چلے جاتا۔روزانہ کا یہی معمول تھا۔وہ آتے ہی اگر چہ گوشے میں انیس الدین مرحوم کے پیچھے خاموشی کے ساتھ بیٹھ جاتے لیکن امیرِ حلقہ ان کے آتے ہی بہت پرتپاک اور گرم جوشی کے ساتھ ان کو آگے آنے کو کہتے ، جواباً ان کے کتابی چہرے پر ایک مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر پھیل جاتی ۔تکلف، حیا اور عاجزانہ حیلے بہانے کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ وہ بدن کو جنبش دیتے جیسے آگے بڑھنے والے ہیں لیکن پھر وہیں پر بیٹھے رہ جاتے ۔اطاعت و انکساری کے ساتھ بے نیازی کی یہ شان میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ۔اب تو کندھے چھلانگ کر لوگ آگے آجاتے ہیں بلکہ فوٹو اور میڈیا کے اس دور میں ہزار جتن کر کے اس جگہ بیٹھتے ہیں جہاں وہ خود لوگوں کو اور لوگ بھی انہیں دیکھتے رہیں۔اس معاملے میں انسانوں کی حماقتوں کے ایسے ایسے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں کہ ان کی یہ ادا اور بھی نکھر جاتی ہے۔بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مولانا طیب عثمانی ندوی ہیں جو ہادی ہاشمی اسکول گیا میں ٹیچر ہیں،ان کے اندر فطری انکسار اور تہذیبی شائستگی بھر پور طور پر پائی جاتی تھی ۔اس وقت ان کا چڑھتا ہوا شباب تھا۔عمر لگ بھگ پیتیس چھتیس برس کی ہوگی ۔ بے داغ جوانی کا حسن، کشادہ چشم ،سڈول جسم ،متناسب قد وقامت ،علم وزہد کی ملی جلی کیفیت ۔نرم گفتاری بلکہ ہم کلامی کا سادھیما انداز ، ذمہ داروں کے ساتھ محفل کے ایک گوشے میں سمٹے سمٹائے بیٹھنے کا اسلوب ، پورے وجود سے عجز و نیازمندی اور فروتنی جو تہذیبِ نفس کا ثمر ہوتی ہے، نمایاں تھی۔

مولانا اپنی جائے نشست میں بڑی کفایت شعاری سے کام لیتے تھے۔میں نے اکثر ان کو دیکھا کہ وہ نشست میں اپنی ذات سے کم جگہ لیتے ہیں اور سمٹ کر بیٹھتے ہیں۔ یہ سننے میں معمولی بات ہے۔قرآن نے زور دے کر اجتماعی آدابِ نشست بلا وجہ نہیں سکھائے ہیں ۔ جو لوگ قرآن کی اس ہدایت کے رمز کو جانتے ہیں وہ کسی شخص کے اندازِ نشست میں کردار کے حسن کو دیکھ سکتے ہیں۔بعض لوگ تو اپنی ذات سے دوگنی اور چوگنی جگہ لیتے ہیں نفسیاتی موٹاپا ان پر طاری

ہوجاتا ہے ویسے اس سلسلے میں کوئی فارمولا نہیں بنایا جا سکتا ہے مثلاً ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب مرحوم ایک قاموسی شخصیت کے مالک تھے اپنی گفتار میں زیادہ ٹائم اور نشست میں بھی زیادہ اسپیس لیتے تھے اور سامنے کی جو جگہ خالی ہوتی اس پر اپنی کج کلاہ رکھ کر مزید جگہ لے لیتے، جو بعض لوگوں کی کجی کی اصلاح کا ذریعہ بھی ہو جاتی ۔ غیروں کی محفل میں اکثر وہ یہ کام کرتے ۔ اس معاملے میں شخصیتوں میں بہت تنوع دیکھا گیا ہے۔ بعض وضع دار ٹوپیوں کے ساتھ اپنے خوبصورت بریف کیس کا استعمال اسپیس بنانے میں کرتے ہیں۔ پروفیسر ابوذر عثمانی صاحب ابتدا میں اتنی ہی جگہ لیتے ہیں جتنی شریف لوگوں کو لینی چاہیے۔ لیکن دھیرے دھیرے اپنے قہقہوں کے ذریعہ مزید اسپیس حاصل کرتے جاتے ہیں اور پاس بیٹھنے والا آدمی قہقہے کی تاب نہ لا کر جتنی جگہ چھوڑتا چلا جاتا اس پر وہ قابض ہوتے جاتے ہیں۔ بعض افراد اپنے خوبصورت چشمے اور اس کے کور سے یہ کام کرتے ہیں۔ بعض مولویوں کو اللہ تعالیٰ تن و توش ایسا عطا کرتا ہے کہ ڈبل جگہ لیتے ہیں۔ بعض پان کے شائقین کو اپنے آپ ہی کچھ اسپیس مل جاتا ہے جب ان کے سرخ چھینٹوں سے بچنے کے لئے لوگ جگہ چھوڑتے ہیں۔ فرشی نشستوں میں شخصیتوں کا بھرم زیادہ کھلتا ہے خصوصاً ایسے لوگ جلد گاؤ تکیے کا سہارا لے کر مزید جگہ پر قابض ہو جاتے ہیں۔ بعض بزرگوں کے لیے یہ کام ان کے مریدانِ خاص اور لیڈروں کے لیے ان کے حاشیہ برداران کرتے ہیں ۔ بہرحال مجھے مولانا مرحوم کا اندازِ نشست زیادہ اچھا لگتا تھا۔ کیونکہ مجلسوں میں اپنی ذات کو اتنا سنبھالے رکھنا کہ جب اپنے لیے کم جگہ لینی پڑے تو انسان آسانی سے سمٹ جائے، شخصیت میں یہ خوبی جوہرِ عبدیت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی اور یہ راز قرآن کی ان آیات سے معلوم ہوتا ہے جن میں مجلسی آدابِ نشست سکھائے گئے ہیں۔ اللہ کو بندے کی جو ادا سب سے زیادہ پسند ہے وہ شانِ عبدیت ہے۔ یہ عبدیت جن جن اداؤں میں اور جن جن اسلوب میں ڈھلتی ہے قرآن نے ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ حسنِ عبدیت، معرفتِ نفس، خشیت اور محبتِ الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔

مولانا طیب صاحب مشکوٰۃ سے روزانہ درسِ حدیث دیتے تھے۔ اس میں بھی ان کا ایک جچا تلا انداز اور ٹھہرا ٹھہرا اسلوب ہوتا۔ افہام و تفہیم کی بھرپور کوشش ان کا خاص وصف تھا۔

درس میں کوئی غیر ضروری باتیں نہیں ہوتیں نہ نکتہ آفرینی کا اظہار نہ چہرے پر دانشمندی کی کوئی لکیر نہ آنکھ میں دادِ تحسین کی چمک بلکہ شروع سے آخر تک ایک معصومیت کی جھلملاہٹ، چہرے پر مسکراہٹ کی آمد و رفت کے ساتھ باقی رہتی ۔ البتہ تحریر پڑھنے کے بعد اندازا ہوا کہ وہ تقریر سے زیادہ تحریر کے آدمی تھے۔ ایسا نہیں کہ وہ موثر گفتگو نہیں کر سکتے، اپنی بات سلیقے سے رکھتے، لیکن تحریر میں فصاحت و صراحت کے ساتھ ادب کی چاشنی بھی ہوتی ۔ اصل میں وہ گفتار کے نہیں کردار کے آدمی تھے صرف قال ہی نہیں حال بھی تھا۔ بعد میں انیس الدین مرحوم نے اپنی کتاب تصنیف کی تو اس پر پیشِ لفظ لکھنے کی فرمائش ان سے کی، انہوں نے حکم کی تعمیل بھی کی۔ امیر و مامور میں احترام و محبت کا یہ رشتہ زندگی بھر قائم رہا یہاں تک کہ مرحوم کے اپنے بیٹے ڈاکٹر معین عارف کی شادی بھی مولانا طیب صاحب مرحوم کی بیٹی سے ہوئی۔ ان دس دنوں میں عثمانی صاحب مرحوم کی آمد و رفت، نشست و برخواست اور درسِ حدیث نے مل جل کر ذہن کے پردے پر جو تصویر بنائی تاثرات کی وہی تصویر وقت کے ساتھ بڑھتی پھیلتی رہی اور آج جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں ، یادوں کے اندھیرے میں جھلملا رہی ہے۔ اس نصف صدی کے سفر میں جانے کتنی یادوں کے پھول مرجھا گئے، کتنی قسمیں، وعدے پیار، وفا اور جفا گہنا گئے لیکن بعض شخصیتیں، ان کی یادیں اور اسالیب ہنوز تازہ ہیں۔ جن میں ایک مولانا طیب عثمانی مرحوم کی بھی ہے۔ آدمی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اللہ کسی شخص کو وہی کام کرنے کی توفیق اور موقع دے جس کو کرنے کی استعداد و صلاحیت اس کے اندر پائی جاتی ہے۔ یہ ایک بڑی نعمت ہے جو مولانا کو حاصل ہوئی۔

عام طور سے تحریک سے وابستہ افراد میں دین، سیاست، تصوف اور ادب کے سلسلے میں جذبہ و شعور کی سطح پر کچھ نہ کچھ یک رخا پن آجاتا ہے مولانا مرحوم کے یہاں ان چاروں جہت سے ایک پختگی اور توازن تھا۔ دین کو تحریک کے طور پر پیش کرنے میں وہ فکرِ مودودی سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ رموزِ تصوف ان کو ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے والد حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی خانقاہِ مجیبیہ مقامِ سملہ کے سجادہ نشیں تھے۔ اس سلسلے میں ابوالحسن علی ندوی مرحوم کی صحبت و عقیدت نے بھی کچھ کام کیا۔ جہاں تک سیاسی امور کا سوال ہے وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے معتقد اور ادب

میں ڈاکٹر اقبال کے شیدائی تھے۔ ''اقبال شخصیت اور پیام'' ان کی ایک تصنیف بھی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار انہوں نے ایک مضمون میں کیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتداء میں اسلامی دنیا نے دو عظیم مجاہد اور دانشور پیدا کیے۔ میری مراد مولانا جمال الدین افغانی اور مفتی محمد عبدہ سے ہے۔ اسی بیسویں صدی کی ابتداء میں ہندوستان کے افق پر مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت روشن ستارے کی طرح نمودار ہوئی اور ایسا محسوس ہوا کہ عالمِ اسلامی کے وہ دونوں ستارے ایک دوسرے میں ضم ہو کر افقِ ہند پر شہاب ثاقب بن کر چمکے ہوں۔ میرے کہنے کا مدعا یہ ہے کہ مولانا مرحوم عالمِ اسلامی کی ان دونوں شخصیتوں کے جامع تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس مردِ مجاہد کی زندگی میں خدا کی فیاضی کے عجیب جلوے نظر آتے ہیں، ظاہری جلال و جمال ایسا تھا کہ مغل شہنشاہ بھی شرمندہ ہے۔ دماغ کی تابانی ایسی کہ جس سے جانے کتنی راہیں روشن ہوتی تھیں دل کی فراخی کا یہ عالم کہ اس میں دشمنوں کے لئے بھی جگہ تھی، مذہب میں نظر ایسی عمیق کہ اس کے ائینہ میں دین و دنیا کی واضح تصویر نظر آتی تھی اور عصرِ حاضر اور فکرِ جدید سے ایسی واقفیت کہ مغرب کے عالم بھی اس کا لوہا مانتے تھے۔ مولانا کی شخصیت کا یہ تنوع ان کی نادر روزگار شخصیت کا آئینہ دار ہے۔''

(ادبی اشارے ص ۱۳۹)

اسی طرح اقبال کے سلسلے میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ:

''پھر جب میں سنِ شعور کو پہنچا اور چمنستانِ شبلی و سلیمان ندوی کے ادبی ماحول میں اقبال کو تفصیل سے پڑھا تو واقعہ یہ ہے کہ اقبال کا شیدائی بن گیا اور پھر اقبال میرے لئے کسی عرب شاعر کے اس شعر کی مصداق ہو گئے۔''

اتانی الھویٰ ھا ولا اعرف الھویٰ
فصادف قلباً خالیاً فتکمنا

''محبت میرے قریب اس حال میں آئی کہ میں محبت سے آشنا نہ تھا، بس اس نے میرے دل کو خالی پا کر اپنا قبضہ جمالیا۔''

(ادبی اشارے ص ۱۰۸)

اسی طرح فکرِ مودودی سے اپنی وابستگی کا اظہار کرنے کے بعد علی میاں کے سلسلے میں وہ یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

''مگر دماغ پر سے فکرِ مودودی کا انقلابی نشہ اترتا نہ تھا۔ مولانا کے سامنے تو نہیں، ادب مانع تھا، اپنے ساتھیوں کے درمیان کہتا ''بھائی یہ مغز جو یہاں ہے وہ تو ہمارے گھروں میں موجود ہے.........اس فکری فرق کے باوجود اپنا دل مولانا کی ذات اور شخصیت کا نخچیر بن چکا تھا۔ محبت و عقیدت سے معمور یہ دل کبھی ان کے سامنے تعلقِ خاطر کے اظہار کی جسارت نہ کر سکا۔ وقت گزرتے رہے فکر و نظر میں دوری کے باوجود میری محبت و عقیدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ مولانا روحانی اور قلبی طور پر میرے مخدوم ہیں اور مرشد بھی۔'' (ادبی اشارے ص ۱۱۷)

بیسویں صدی کی ان بلند پایہ شخصیتوں میں اختلافات کے باوجود مولانا طیب عثمانی صاحب نے ان سے اخذ و استفادہ کی صحت مند روایت کو اختیار کیا اور ان سے ایک بامعنی رشتہ برقرار رکھا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ گیا کے تحریکی حلقے میں اختلاف میں اتحاد و تعلقات کی ایک صحتمند روایت قائم رہی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گیا شہر و ضلع کے تحریکی ماحول کی یہ خصوصیت ہے کہ وہاں ہر طرح کے رفقاء اپنے جاہ و جلال، جمال و کمال، رندی و پارسائی، بھولے پن اور ہوشیاری کے ساتھ مل جل کر اپنی شانِ انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اس طرح رہتے ہیں کہ ان کی انفرادیت اجتماعیت میں مانع نہیں ہوتی، وہ دودھ اور دہی کے لئے لڑ بھی سکتے ہیں لیکن دھڑی اور ہانڈی نہیں توڑتے۔ وہاں اجتماعی زندگی اختلاف کے باوجود آگے بڑھتی رہتی ہے اور دھڑے بندی کا شکار

نہیں ہوتی۔اس کا نتیجہ یہ کہ وہاں کئی بڑے ادارے کامیابی سے چل رہے ہیں اور اسی سے ٹیم بن کر کام کرنے کی خوبی پیدا ہوتی ہے۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ادارے کبھی کبھی اختلاف کی جڑ اور تحریک کی قبر بن جاتے ہیں، گیا اس سے مستثنیٰ شہر ہے۔کئی جگہوں پر اجتماعی اداروں پر انفرادی جاگیرداری قائم ہو جاتی ہے۔گیا کی خوبی یہ ہے کہ وہاں ایک فرد نے کامیاب ادارہ قائم کر کے، جب وہ پھل دینے کے لائق ہوا تو جماعت کے حوالے کر دیا۔اس میں ہمارے تربیتی نظام کا کمال نہیں ہے بلکہ بعض افراد کی کرامت ہے اور اس کرامت کے پیچھے سب سے بڑا فیض مولانا طیب عثمانی صاحب کا ہے۔ان کے دل کی پاکیزگی و بے نفسی، نیت کی طہارت، مزاج کی صلابت اور علم وفکر کی پختگی نے یہ کرامت کی ہے۔رفقاء کے عیب کو ہنر بنا دینا، خوبی کو چمکا دینا کوتاہیوں پر پردہ ڈال دینا، شکایتوں کو معاف کر دینا، منصب سے دور رہنا، رایوں کے اظہار میں تواضع اختیار کرنا عثمانی صاحب مرحوم کا خاص وصف تھا۔تواضع اور توازن کسی کی ذات میں پیدا ہو جائے تو اس کی ذات خیر کا سرچشمہ، نیکیوں کا منبع اور افراد کا مرجع بن جاتی ہے اور یہی خوبی عثمانی صاحب میں تھی۔نباہ کرنے کا ہنر اور نازک مسئلہ میں راہ نکالنے کی دینی حکمت ان کے اندر تھی۔ گوشہ گیری بھی ان کے مزاج کا حصہ تھی لیکن اس میں مردم بیزاری نہیں۔جیسا کہ ذکر کیا گیا وہ خانقاہی خانوادے کے فرد تھے اور باضابطہ ان کے خاندان میں عرس کی روایت قائم تھی۔مولانا اس میں شریک ہوتے تھے لیکن اس طرح سے کہ وہاں جا کر مسجد میں معتکف ہو جاتے۔گویا وہ خانقاہ کے عرس کے قریب بھی ہیں اور دور بھی۔غور سے دیکھئے تو یہ اس پورے سلسلۂ بیعت وارشاد کو خیر کے سلسلے سے بدلنے کی ایک لطیف کوشش تھی۔

اسی طرح ہندوستان کی جماعت میں الکشنی سیاست شجرِ ممنوعہ تو نہ تھی لیکن ابتداء میں 'ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین کی اسپرٹ کارفرما تھی۔اس لئے جب الکشنی سیاست میں کچھ شرائط کے ساتھ ووٹ دینے کی پابندی اٹھائی گئی تو بہار میں ایک فکری ہلچل اور ذہنی کشمکش شروع ہوئی اس موقع پر بھی مولانا مرحوم کی ایک علیٰحدہ رائے تھی اور ان کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں جو لوگ عملی سیاست سے دین وملت کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کی ایک

علیٰحدہ ٹیم بنا کر اس طرح انہیں اجازت دے دینی چاہیے کہ وہ تحریک کا ایک حصہ بھی رہیں۔اب 'گنگا میں اس کے بعد کافی پانی بہ چکا' اور بہت ساری باتیں دریا برد ہو گئیں، کچھ بحثیں بھی طاقِ نسیاں ہو گئیں، کچھ لوگ اللہ کو پیارے ہو گئے اور کچھ کنارے لگ گئے۔

اسی زمانے میں حلقہء بہار کی مجلسِ شوریٰ میں ایک گرما گرم بحث کا افسوسناک منظر میری نگاہوں کے سامنے ہے۔جب ارکانِ شوریٰ کی دو محترم شخصیتیں جو کہ اتفاق سے مرکزی مجلسِ شوریٰ کی رکن بھی تھیں، انتخاب کے مسئلے پر بھڑ گئیں۔ایک کے نزدیک وہ عقیدہ کا مسئلہ تھا اور دوسرے کے نزدیک حاکمیتِ الٰہ حاکمیتِ جمہور سے متصادم نہیں تھی۔ بہرحال بحث نفسِ مسئلہ سے آگے بڑھ کر ذات پر آ گئی اور کذب بیانی کی سطح پر گر گئی۔مولانا طیب عثمانی مرحوم میرے بازو میں بیٹھے ہوئے تھے وہ اندر سے بہت جز بز اور پریشان تھے، ان کا اضطراب اور چہرے پر نا گواری کی ترچھی لکیروں کے ابھرنے اور ڈوبنے کو میں دیکھ رہا تھا۔اس کے بعد وہ حلقہ کی مجلسِ شوریٰ میں شریک نہیں ہوئے اور بعد میں استعفیٰ بھیج دیا۔اس میں ان کے عارضہء اختلاج کو دخل نہ تھا وہ تو استعفیٰ کا ایک پردہ تھا۔ جماعتی زندگی میں منصب کی لذت، اسٹیج کی خواہش اور دھڑے بندی سب بڑے فتنے ہیں۔مولانا نے اس معاملے میں تقویٰ کی اس مثال کو قائم کر کے دکھایا جس کا ذکر حضرت کعب نے خاردار وادی کی مثال دے کر تقویٰ کی وضاحت کی تھی۔واقعہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں انتشار واختلاف واقع ہو جائے تو یہ بڑی خاردار ہو جاتی ہے۔اس لئے تحریک وتنظیم میں ایسے مواقع پر بڑی شخصیتوں اور مناصب پر فائز ذمہ داروں کو تقویٰ کی زرہ پہنے رہنا چاہئے۔یہ صرف کتابی بات نہیں ہے ہم لوگ اس کو دیکھ رہے ہیں، مولانا مرحوم اجتماعی زندگی میں بڑے محتاط رہتے تھے۔افراد سے برتنے میں بھی ان کا رویہ احتیاط کا تھا، اس میں ایک نرمی، گداز اور شفقت کا پہلو نمایاں رہتا۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا، گیا کے تحریکی حلقوں میں ولایت کی ہر منزل پر فائز افراد مل جائیں گے، جلالی اور جمالی دونوں قسم کے بزرگوں کی زیارت ہو جائے گی۔ملامتیہ طرز کے رکن بھی مل جائیں گے اور یارِ طرحدار بھی۔ان سب کے درمیان تنظیمی آداب میں توازن رکھنا صرف اصول و

ضوابط سے نہیں ہو سکتا، خونِ جگر بھی کافی نہیں اس کے لیے اشکِ پیازی بھی چاہیے۔ طیب صاحب مرحوم نے اپنی ذات کی حد تک یہ دونوں فراہم کیا۔ اصل میں وہ علم، عمل اور حال تینوں کے آدمی تھے۔ اجتماعی زندگی میں مسئلے کو حل کرنے میں علم کہیں حکمت کے روپ میں تدبیر، کہیں عمل کردار میں ڈھل کر مرجع اور کہیں اخلاص احوال میں بدل کر طہارتِ قلب و نظر کا کام کرتے ہیں کبھی روٹھے کو منانے اور مسئلے کو حل کرنے میں تدبیر نا کام ہو جاتی ہے تو بھیگی آنکھوں سے بغلگیر کر لینا کام آجاتا ہے۔ احوال و کیفیات سے خالی شخصیتیں اجتماعی زندگی میں کسی رشتے کی پیچیدگی کو حل نہیں کر سکتیں بلکہ رشتے کو نشو نما بھی نہیں دے سکتیں۔ بنیان مرصوص بنانے کے لئے ذمہ داران و کارکنان میں یہ تینوں خوبیاں ہونی چاہئیں۔ علم، عمل اور اخلاص۔ علم شعورِ تعلق کو مضبوط کرتا ہے اخلاص جذبۂ تعلق کی تسکین اور عمل شعور و کیفیت کو با معنی بنائے رکھتا ہے۔ شاید یہ بات ایک واقعہ سے زیادہ واضح ہو سکے۔ گیا میں تعمیری کام کے سلسلے میں I.D.B. کی ٹیم معائنہ کرتے ہوئے رانچی پہونچی۔ میں آئی، ڈی، بی کا ممبر تھا ٹیم کے سب لوگ خفا تھے کہ گیا میں جماعت اسلامی کے ایک رکن دو نام رکھتے ہیں، فہرستِ ارکان میں کچھ نام ہے اور آفس میں کچھ اور دوسرا، معاہدہ دوسرے نام سے کرتے ہیں تا کہ قانونی کارروائی نہ کی جا سکے۔ ٹیم میں اکثر لوگ حیدرآباد کے تھے اس لئے ان کو 'خوم' کے خائن کہ کر خفگی کا اظہار کر رہے تھے۔ میں بہت پریشان تھا کیوں کہ گیا کے جس شخص کا وہ ذکر کر رہے تھے میں ان کی نیکی، ذہانت اور دیانت داری کا قائل ہوں لیکن افہام و تفہیم میں قائل کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ آج جب کہ میں یہ خاکہ لکھ رہا ہوں تو اچانک خیال کا رخ مولانا طیب عثمانی مرحوم کی طرف چلا گیا کہ وہ اس مسئلے کو کیسے حل کرتے۔ اس سے ان کی شخصیت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ معاً ذہن میں ایک بات آئی کہ وہ ہوتے تو پہلے وفد کو قائل کرنے کی کوشش کرتے، اپنی معلومات سے دلائل فراہم کرتے اور اس شخص کی صفائی کے لئے پورا زور لگاتے لیکن جب بات نہ بنتی تو میری طرح صبر کر کے نہیں رہ جاتے، بلکہ وہ وضوء کرتے اور قرآن ہاتھ میں لے کر اپنے ڈرائنگ روم میں وفد کے سامنے کہتے کہ جس شخص کے بارے میں آپ الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں میں اس کی ایمانداری اور سچائی پر قسم کھاتا ہوں۔ احوال اور

کیفیات سے مالامال شخصیتیں نازک مسئلے کو کبھی اس طرح بھی حل کرتی ہیں۔ مولانا طیب عثمانی مرحوم صاحبِ حال صوفی، معتبر عالم اور پختہ ادیب تھے۔ ان کے اٹھ جانے کے بعد ہم ایک صاحبِ دل رکن، ایک عالمِ باعمل، ایک پختہ کار ادیب، ایک متوازن شخصیت سے محروم ہو گئے۔ کسی میں یہ سب باتیں جمع ہوں تو اس کو نایاب بنا دیتی ہیں:

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

اگر آج مجھ سے کوئی پوچھے کہ تم نے بایزید بسطانی کو دیکھا ہے تو میں جواب دوں گا کہ ہاں، پھر وہ دریافت کرے کیسے؟ تو میں کہوں گا کہ مولانا طیب عثمانی صاحب سے ملاقات ہوئی ہے۔ افسوس مولانا مودودی سے ملاقات نہیں ہوئی ورنہ کہتا کہ امام غزالی اور ابنِ تیمیہ دونوں سے مل چکا ہوں۔

ہماری تحریک کی نئی نسل کا سب سے بڑا افلاس یہ ہے کہ انہیں ہم جیسوں کی صحبت نصیب ہو رہی ہے۔ وہ یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ انہوں نے امت کے بڑوں کو دیکھا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب بالکل قحط الرجال ہو گیا ہے البتہ تحریک کے پہلے دور میں ہر حلقہ اور مقام پر ایسی شخصیتیں تھیں جو پورے علاقے کو روشنی اور حرارت بخشتی تھیں اب عموماً ایسا نہیں ہے وہ نوجوان انتہائی خوش قسمت ہے جس کو آج بھی ایسی تحریکی شخصیت اس کے مقام پر میسر آگئی۔ بہرحال اب ہماری ذمہ داری ہے کہ اپنے قریبی عہد کے صاحبِ کردار افراد کا جیتا جاگتا مرقع تحریروں کی شکل میں پیش کر کے نئی نسل کو اخلاقی و روحانی دولت عطا کریں تا کہ اللہ توفیق دے تو وہ عزیمت و دعوت کی راہ پر چل کر اپنے بعد آنے والوں کے لیے نمونہ بن سکیں۔

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

○○○

مولانا شاہ طیب عثمانیؒ ...کچھ یادیں کچھ باتیں

□ ڈاکٹر تابش مہدی (نئی دہلی)

حضرت مولانا شاہ محمد طیب عثمانی ندوی رحمۃ اللہ علیہ (1930-2015) ہمارے عہد کے اُن علما میں تھے، جن کی پہچان ایک سے زائد حوالوں سے ہوتی ہے۔ ہر پہچان اپنی جگہ روشن اور نمایاں ہے۔

مولانا بہار کے ایک ایسے خانوادے کے چشم و چراغ تھے، جو اپنے علم وفضل اور تدین و روحانیت کے لیے دور دور تک جانا جاتا رہا ہے اور ہر مسلک و مکتب فکر کے علما و عوام نے اُسے عزت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ اُن کی پوری زندگی اپنے خانوادے کی روحانی روایات و اقدار کی امین ومحافظ رہی ہے۔

مولانا ایک جید عالم دین تھے۔ عالم اسلام کی مشہور دینی درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلما سے انھوں نے سندِ فراغ حاصل کی تھی۔ وہاں کے محترم ومعتبر اساتذہ سے خصوصی طور پر کسبِ فیض کیا تھا۔ اُن کی شخصیت، رکھ رکھاؤ اور اعمال واقوال سے ان کی مادرِ علمی کی بھرپور نمایندگی ہوتی تھی۔ جب وہ کسی دینی وملی موضوع پر گفتگو کرتے تھے تو سامنے والے کو اِس بات کا احساس ہوتا تھا کہ اُس سے ایک عالمِ محوِ کلام ہے۔ ایسا عالم جو علم وعمل کا بھی غازی ہے اور گفتار وکردار کا بھی۔

مولانا جماعتِ اسلامی ہند کے سرگرم وفعال خادم تھے۔ اس کی مختلف قومی و ریاستی

سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتے تھے۔ ایک سے زائد بار جماعت کی ریاستی مجلس شوریٰ کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ جماعت کے زیر اہتمام چلنے والے ملت ہسپتال گیا سے اُنھیں خصوصی دل چسپی تھی۔ اس کے فروغ وترقی کے لیے وہ ہمیشہ ساعی وکوشاں رہے۔

مولانا طیب عثمانی چوں کہ ندوی تھے اور دبستانِ شبلیؔ وسلیمانؔ سے ان کا علاقہ تھا، اس لیے ادب وتنقید کو ان کی زندگی میں خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ اِس ذیل میں انھوں نے متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔

غرض کہ ہم مولانا طیب عثمانی کو جہاں اور جس میدان میں بھی دیکھتے ہیں، وہ اپنی ایک روشن اور تاب ناک پہچان کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ادب کے عالمی ناقد ودانش ور رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ 'جسم کبھی جسم کے قابو میں نہیں آیا ہے۔ اُس کو سیدھے راستے، سلامتی کے راستے اور نجات کے راستے پر صرف مذہب واخلاق کے ذریعے سے ہی لایا جاسکتا ہے۔' ادب و تنقید میں مولانا طیب عثمانی کی بھی یہی سوچ تھی۔ وہ آج کی بھٹکی ہوئی انسانیت اور بداخلاقی اور بدچلنی میں ڈوبے ہوئے سماج کو مذہب واخلاق کے ذریعے سے ہی سیدھے اور پرامن راستے پر لانے کے قائل تھے۔ وہ اپنی پوری علمی وادبی زندگی میں اپنے اِسی نظریے پر عامل رہے۔

مولانا طیب عثمانی اربابِ علم ودانش کے اُس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، جو ادب میں مقصدیت پر اصرار کرتا ہے۔ وہ ادب کو سماج کا معلم، مصلح اور مربی تصور کرتے تھے۔ وہ ادب اور سماج کو باہم لازم وملزوم سمجھتے تھے۔ جیسا کہ میں نے گزشتہ سطور میں عرض کیا کہ چوں کہ وہ ندوی تھے، دبستانِ شبلیؔ وسلیمانؔ سے اُنھوں نے کسبِ فیض کیا تھا، اُس دبستاں کے بزرگوں خصوصاً نام ور عالم وادیب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے اُنھیں خصوصی قرب حاصل تھا، تحریک اسلامی سے بھی اُنھیں عملی وابستگی تھی اور اس کے بانی حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے علمی، فکری اور ادبی نظریے کو اُنھوں نے ہضم کیا تھا، اس لیے انھوں نے پوری عمر صالح اور تعمیری ادب کی تعمیر وتوسیع میں صرف کردی۔

مولانا کی ذات کی تعمیر و تشکیل میں تین عناصر کی واضح کارفرمائی ملتی ہے:

(۱)ادب (۲)مذہب (۳)اجتماعیت

یہ تینوں عناصر ہمیشہ اُن پر سایہ فگن رہتے تھے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

’ادب میرا عشق ہے، مذہب میرا عقیدہ ہے اور جمہوری اجتماعیت میرا مزاج ہے۔‘

انھوں نے اِن عناصر سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ وہ جہاں اور جس میدان میں بھی رہے، اِن تینوں عناصر نے ان کی رہ نمائی کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ عناصر ہیں، جو کسی بھی انسان کو ایک عظیم اور مثالی انسان بناتے ہیں۔ مولانا کو یہ تربیت خاندان کے روحانی پس منظر، ان کی مادرِ علمی ندوۃ العلما اور آخر دم تک ان کی زندگی سے جڑی رہنے والی تحریک جماعت اسلامی سے حاصل ہوئی تھی۔

مولانا طیب عثمانی ادب کا عالمی تصور رکھتے تھے۔ ان کا صاف اور واضح نظریہ تھا کہ جب ادب میں اخلاقی و روحانی اصولوں اور ادبی و فنی قدروں کی بات آتی ہے تو ذہن میں خود بہ خود تہذیبی روایات اور سماجی زندگی میں عقیدے کی قدر و قیمت کا احساس اجاگر ہو جاتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہر تہذیب کے پس منظر میں کسی نہ کسی نظریے یا کسی نہ کسی اصول یا عقیدے کی کارفرمائی رہتی ہے۔

مولانا کا یہ احساس لائقِ تسلیم ہے کہ عالمی ادب میں کوئی بھی اچھا یا بڑا ادیب و شاعر ایسا نہیں ہے، جس نے ادب کو زندگی کی بہتری کے لیے نہ برتا ہو۔ اس کے ہاں حسن پرستی یا حسن بینی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔ بل کہ قدم قدم پر حسن افزائی یا حسن آفرینی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی تخلیق حسن افزائی یا حسن آفرینی کا بہترین مظہر ہوتی ہے۔ اس کی روح ہمیشہ آزاد اور متحرک رہتی ہے۔ وہ اپنی ذات سے ماورا ہو کر اپنے سے اعلیٰ و بالاتر مقصد کا جویا ہوتا ہے۔ یہ چیز اس کی زندگی میں مشن کی حیثیت سے شامل ہوتی ہے۔

صالح، اعلیٰ اور تعمیری ادب کے سرخیل و علم بردار سید عبداللہ اور سلیم احمد کی طرح مولانا طیب عثمانی کا بھی خیال تھا کہ آج انسانی زندگی میں جو پراگندگی، ناہمواری یا بے یقینی کی صورتِ حال نظر آتی ہے، اس نے آج کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی اس میں مبتلا کر دیا ہے اور ان کے شعری و نثری فن پاروں کو بھی۔ ان کے ادب کی بنیاد بالکل بے ستون ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ انھوں نے اپنے اس کھوکھلے پن اور اپنی ذہنی و فکری ناہمواری کو داخلیت کا نام دے دیا ہے۔

مولانا طیب عثمانی سے میری غائبانہ واقفیت کب سے تھی؟ قطعیت کے ساتھ یہ بتانا مشکل ہے۔ ادارۂ ادب اسلامی ہند کے اولین ترجمان ماہ نامہ ’نئی نسلیں‘ لکھنؤ کی مجلس ادارت میں بھی ان کا نام نگاہ سے گزر را تھا (ہفت روزہ ’نقیب‘ پھلواری شریف میں بھی)، یاد پڑتا ہے کہ بر سبیلِ تذکرہ ایک سے زائد بار استاذِ محترم مولانا عامر عثمانیؒ کی مجلس میں بھی ان کا نام آیا تھا اور دعوت دہلی، تعمیر حیات لکھنؤ اور بعض دوسرے رسائل میں بھی گاہ بہ گاہ اُن کے مضامین مطالعے میں آتے رہتے تھے۔ اُن سے یک گونہ تعلق خاطر ہو گیا تھا۔ اِس تعلق خاطر یا قلبی انسیت کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ عثمانی تھے۔ اس نسبت سے خصوصی تعلقِ خاطر ہونے کی وجہ سے ان کے نام کے آگے عثمانی کا لاحقہ دیکھ کر ایک عجیب سی مسرت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ یک طرفہ اور غائبانہ ہی تھا۔ انھیں دیکھنے یا ان کے پاس بیٹھنے اور استفادہ کرنے کا موقع غیر معمولی خواہش کے باوجود بہت دنوں تک نہیں میسر آسکا تھا۔ البتہ موقعے کی جستجو مسلسل رہی۔ خوبیِ قسمت سے مارچ 1978 میں رانچی سے ایک مشاعرے کا دعوت نامہ آیا۔ میں نے موقعے کو غنیمت جانا اور اِس سفر میں اپنے دونا دیدہ بزرگ ’محبوبوں‘ کی زیارت کا بھی عزم مصمم کر لیا۔ ایک حضرت ناوک حمزہ پوری اور دوسرے مولانا طیب عثمانی۔ علامہ سید ناوک حمزہ پوری کا معاملہ تو یہ تھا کہ گرچہ انھیں دیکھا نہیں تھا، تاہم کافی دنوں سے خط کتاب کا سلسلہ قائم تھا اور ہے۔ جس زمانے میں میں ماہ نامہ ذکریٰ رام پور میں کام کرتا تھا، اس وقت سے ہی اُن سے رابطہ قائم ہو گیا تھا، پھر جب میں ادارۂ تجلی دیوبند سے جاری ہونے والے پندرہ روزہ اجتماع دیوبند کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا اور پھر ماہ نامہ

الایمان کی ادارت تفویض ہوئی تو وہ مسلسل و مستقل کالم نگاری کے ذریعے سے تعاون فرماتے رہے اور رابطہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا گیا۔لیکن مولانا طیب عثمانی سے میری قلبی وابستگی محض یک طرفہ تھی۔کبھی خط کتابت کی نوبت نہیں آ سکی تھی۔فون کا تو اس وقت تک تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھااور موبائل تو اس کے بہت بعد کی چیز ہے۔

رانچی سے واپسی پر ایک روز میں ضلع گیا کے قصبے شیر گھاٹی سے متصل گاؤں حمزہ پور میں ٹھہرا۔اس کے بعد پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق حضرت ناوک حمزہ پوری سے رہ نمائی حاصل کر کے شہر گیا میں سیدھے اُس اسکول میں پہنچا، جہاں مولانا طیب عثمانی معلّمی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔جب میں پہنچا تو اسکول بند ہونے کا وقت قریب تھا۔مولانا طیب عثمانی سے ملاقات ہوئی اور میں نے اپنا نام بتایا تو ایسا محسوس ہوا کہ ہم دونوں ایک طویل مدت سے ایک دوسرے سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔انھوں نے بڑی شفقت و محبت کا مظاہرہ کیا۔میں نے بھی ایک خرد کی حیثیت سے احترام و عقیدت کا انداز اختیار کیا۔مجھے یاد پڑتا ہے کہ مولانا چھٹی کا انتظار کیے بغیر ہی مجھے لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔رات کو وہیں قیام کیا۔مولانا نے اپنی کئی تصانیف سے سرفراز کیا۔اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے نوازا اور میرے ذوق و رجحان کو محسوس کرتے ہوئے اپنے روحانی خانوادے فردوسی کے سلسلے اور شجرے سے بھی تفصیل کے ساتھ آگاہ کیا۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ رائے بریلی کے حسنی خاندان کے ایک اہم بزرگ مجدد العصر حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی رحمۃ الہ علیہ سے میں ذہنی و قلبی مناسبت رکھتا ہوں، میرے جدّ امجد حضرت میاں ثابت علی ناجیہ پوری رحمۃ اللہ علیہ اُن کے خصوصی منتسبین میں تھے تو ان کی خوشی و مسرت کی انتہا نہ رہی۔کافی دیر تک اُس خانوادے کے بزرگوں کے تذکرے میں رطب اللسان رہے۔حضرت سید شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد واقعات سنائے۔امیر المومنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے جہادی کارناموں کا ذکر کیا اور اپنے استاذِ محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے خاندانی و روحانی اوصاف بھی بیان کیے۔غرض کہ میں جتنی دیر ان کی

صحبت میں رہا ایک عجیب روحانی و نورانی فضا کا احساس ہوتا رہا۔اِسی احساس و سرور کے ساتھ میں ان سے جدا ہوا۔جی تو چاہ رہا تھا کہ یہ صحبت اور طویل ہو، لیکن حالات اجازت نہیں دے رہے تھے۔

مولانا محترم سے مذکورہ بالا ملاقات کے بعد بھی ایک سے زائد بار شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔مگر بہت مختصر۔بل کہ مختصر ترین۔لیکن جب بھی شرفِ نیاز حاصل ہوا میں نے وہی کیف و سرور محسوس کیا، جو پہلی ملاقات میں محسوس کیا تھا۔وہ نہایت سادہ لباس و سادہ مزاج انسان تھے۔گفتگو کا انداز بھی سادہ و بے آمیز ہوتا تھا۔کسی بات پر ہنستے یا مسکراتے بھی تھے تو اس میں بھی سادگی و بے تکلفی نظر آتی تھی۔تکلف، تصنع یا ظاہر داری کا شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا۔لیکن ان کی شخصیت میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ میرا احساس ہے کہ جو بھی ان سے ملتا رہا ہوگا، وہ میری ہی طرح ان کی طرف کھنچتا رہا ہوگا۔

مولانا طیب عثمانی 30/ستمبر 1030 کو اِس دنیائے فانی میں آئے اور کم و بیش پچاسی برس کی بھرپور زندگی گزار کر 29/ستمبر 2015 کو یہاں سے رخصت ہو گئے۔اب وہ ہم سے اتنے دور ہو گئے ہیں کہ جہاں ہم میں سے کسی کی رسائی اِس زندگی میں ممکن نہیں۔لیکن اُنھوں نے محبت و اخلاص، تقویٰ و طہارت، تدین و روحانیت، دانش و حکمت اور علم و ادب کی جو روشنی بکھیری ہے، وہ تادیر باقی رہے گی۔اُسے یاد بھی کیا جاتا رہے گا اور اس کا فیض بھی جاری رہے گا۔اب یہ نئی نسل کے ذوق و ظرف پر منحصر ہے کہ وہ اس روشنی سے کس حد تک کسب نور کر سکتی ہے۔

میں ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کے اِس ذوق و شوق اور حوصلہ و ہمت کو سلام کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنے پدر بزرگ وار اور ہم سب کے مشفق و بزرگ مولانا طیب عثمانی کی زندگی اور کارناموں سے متعلق مضامین لکھوا کر انھیں کتابی شکل میں پیش کر کے آئندہ نسلوں کے لیے سرمایہ فیض فراہم کیا۔

○○

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

□ ڈاکٹر محمد بدیع الزماں (گیا، بہار)

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر، میرِ کارواں کے لئے

اس شعر کے مصداق تھے مولانا شاہ طیب عثمانی ندوی، جن کے پڑوس میں کرایہ کا مکان لے کر اگست 1979ء سے میں رہ رہا تھا۔ مولانا جماعت اسلامی گیا کے ابتدائی فعال رکن تھے۔ پیشہ سے وہ معلم تو تھے ہی لیکن انہوں نے حقیقی معنوں میں پوری زندگی ایک مثالی معلم کا کردار ادا کیا، اور نوجوانوں کی تعلیم و تدریس کے ساتھ ان کے ذہن وفکر کو بدلنے میں بڑا رول ادا کیا۔ ان کے تربیت یافتہ درجنوں افراد گیا اور ملک کے باہر پھیلے ہوئے ہیں۔

مولانا مرحوم کے پڑوس میں رہنے سے میرا بڑا فائدہ ہوا۔ فائدہ ان معنوں میں کہ انہو ں نے میری زندگی کے رخ کو ایک نئی سمت عطا کی جس سے میں پہلے ناآشنا تھا۔ ان کے گھر کے بازو میں رہتے ہوئے ابھی چند مہینے ہی گذرے تھے کہ غیر محسوس طور پر ان کی صحبت نے میری زندگی میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کردیں۔ معلم تو میں بھی تھا لیکن مطالعہ کا رخ صرف اپنے سبجیکٹ تک محدود تھا۔ لیکن مولانا کی صحبت نے میرے مطالعہ کے رخ کو بہت وسعت دی۔ نیو کریم گنج مسجد میں مولانا ہر جمعہ کو درس قرآن دیتے تھے میں اس میں شریک ہونے لگا، پھر دھیرے دھیرے مولانا نے مجھے جماعت اسلامی کے ہفتہ وار اجتماع تک پہنچادیا، اب میرے مطالعہ کا رخ

قرآن، سیرت اور اسلامی لٹریچر کی طرف مڑ گیا، مولانا اس سمت میں میری رہنمائی کرتے رہے، تفہیم القرآن سے جو مطالعہ شروع ہوا تو کئی تفسیریں پڑھ ڈالیں اور سیرت کی کتابیں بھی۔ اس مطالعہ کے دوران جو سوالات اٹھتے اور جو مشکلات پیش آتیں تو مولانا سے گفتگو کے بعد وہ دور ہو جاتیں۔ ان کی گفتگو بڑی مدلل، لاجیکل اور کنونسنگ ہوتی تھی۔ جماعت کے ہفتہ وار اجتماع میں تربیت کے پیش نظر مطالعہ قرآن کے لئے ایک دن مولانا نے میرا نام پیش کردیا، میں بہت گھبرایا، مولانا نے ہمت بندھائی اور فی ظلال القرآن کے تیسویں پارے سے مطالعہ پیش کرنے کا مشورہ دیا۔ مولانا کی حوصلہ افزائی اور تربیت نے بڑا کام کیا اور یہی وجہ ہے کہ میں اب تک اس کام کو آگے بڑھا رہا ہوں۔ مولانا طیب عثمانی صاحب نے جماعت کی بڑی فعال ٹیم بنا رکھی تھی، جس میں پروفیسر زیارت حسین خان، نصیر الدین خاں، منظور عالم، محمد الیاس، شبیر عالم، پروفیسر سید محمد اقبال، پروفیسر ایاز احمد خاں اور پروفیسر مسرور احمد صاحبان شامل تھے۔ یہ سب لوگ مولانا طیب عثمانی صاحب کے ساتھ دعوتی، سماجی، تعلیمی اور خدمت خلق کے کاموں میں لگے رہتے تھے۔ میں بھی ان کے کاموں میں مولانا طیب عثمانی صاحب کی حوصلہ افزائی سے شریک ہوگیا۔ پھر مولانا جب ملت اسپتال کے سکریٹری ہوئے تو انہوں نے مجھے نائب سکریٹری بنایا۔ آہستہ آہستہ مولانا کی رہنمائی میں ان کے سارے ادارہ جاتی کاموں کو میں انجام دینے لگا۔ مولانا کی سوچ وفکر کا نتیجہ گیا شہر میں ملت اسپتال، اقراٗ اسکول، اسلامک سنٹر، اسلامک انفارمیشن سنٹر بودھ گیا اور شتابدی پبلک اسکول ہے۔ مولانا کے کام کا انداز بڑا نرالا اور تعمیری تھا۔ کبھی بھی مشورے اور میٹنگوں میں مولانا اختلاف نہیں کرتے، بلکہ حوصلہ دیتے، اس کام کو کرنے کی ترغیب دیتے اور نیک مشورے سے نوازتے، گویا:

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب ، اس کی نگہ دلنواز

ادارہ جاتی اور تعلیمی کاموں کے ذکر میں مولانا نے ایک دن مجھے بتایا کہ 1970 کی

دہائی میں مدرسہ انوار العلوم گیا کی ذمہ داری ان کے حصے میں آئی تھی، تھوڑی سی کوششوں سے انوار العلوم کے معیار تعلیم اور بچوں کے قیام وطعام میں بڑی نمایاں تبدیلی آئی۔ مولانا اسے شہر گیا کا ایک چھوٹا سا ندوہ بنانا چاہتے تھے۔ ندوہ کے فارغ کئی معلمین جمع کئے گئے، مولانا معین الدین ندوی اور پھر دوسرے لوگوں نے طلبا کی بہترین تعلیم وتربیت اور بہترین رہنمائی کی، ان کو چندہ سے فارغ کر دیا گیا۔ گیا جو مچھروں کا شہر ہے، ان کو مچھر دانی دستیاب کرائی گئی۔ لیکن گیا شہر کے رہنماؤں کو بچوں کی یہ اچھی صورت حال پسند نہیں آئی، ایک صاحب نے کہا کہ بچے مچھر دانی لگا کر سوئیں گے؟ دراصل ان کو تو بھیک منگوں کی ٹیم تیار کرنی تھی۔ جو ان لوگوں کی چاپلوسی میں لگے رہیں۔ تھوڑے ہی عرصے برداشت کرنے کے بعد مدرسے پر راتوں رات قبضہ کرلیا گیا۔ اور اساتذہ اور بچوں کو نکال باہر کیا گیا۔ طیب عثمانی صاحب اور ان کے رفقاء بڑی افسردگی کے ساتھ ادارہ سے الگ ہوگئے۔ اب تک بڑی وسیع زمین اور عمارت کے باوجود انوار العلوم صرف ایک مکتب اور حفظ خانہ کا نام ہے۔

مولانا طیب عثمانی صاحب اور ان کے رفقاء نے اس تجربے کی روشنی میں کام کا پھر ایک نیا منصوبہ بنایا اور یہ طے کیا کہ ہمیشہ اپنے ہم فکر لوگوں کے ساتھ مل کر براہ راست جماعت اسلامی کے بینر کے تحت ملی وسماجی اور تعلیمی کام کرنا چاہئے۔ چنانچہ اسی فکر کو لے کر اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر 1974 میں جماعت اسلامی سوشل سروس سوسائٹی بنائی گئی جو بہار سرکار کے محکمہ میں رجسٹرڈ بھی ہوگئی۔ اس وقت ان کے ساتھ جناب سید خورشید عالم ایڈوکیٹ، جناب عبدالخالق ایڈوکیٹ، جناب سلیمان صادق، جناب منظور عالم، جناب نصیر الدین خاں، جناب زیارت خاں، جناب محمد الیاس صاحب، ڈاکٹر اظہر حسین جہاں آباد، جناب شبیر عالم وغیرہم تھے۔ سوسائٹی نے شہر کے قلب میں آٹھ (8) کٹھا زمین خریدی اور سوسائٹی کا پہلا کام صحت کے میدان میں ملت اسپتال کے قیام کے ذریعہ شروع کیا۔ اور اس کی بنا بھی اس طرح ہوئی کہ گیا شہر میں میڈیکل کالج کھل جانے کی وجہ سے لیڈی الگن ہوسپٹل میں مرد ڈاکٹر اور طلبا آنے لگے، پردہ کا نظام ختم

ہوگیا۔ عورتوں کے ولادت کے وقت بھی لڑکے رہنے لگے، مسلم خواتین کو دقت ہونے لگی چنانچہ ملت اسپتال میں آؤٹ ڈور کے ساتھ لیڈی ڈاکٹر کے ذریعہ زچہ خانہ بھی شروع ہوا، جواب تک کم خرچ پر اچھی خدمات دے رہا ہے، ایمرجنسی 1975 کے زمانے میں تھوڑے وقفہ کے لئے یہ اسپتال بند ہوگیا تھا، اس لئے کہ جماعت اسے چلا رہی تھی، البتہ 1978 میں یہ اسپتال دوبارہ شروع ہوگیا، اور 1984 میں طیب عثمانی صاحب اس کے سکریٹری بنائے گئے اور میں ان کا نائب بنا۔ مولانا کے سکریٹری شپ کی مدت میں ملت اسپتال کی نئی عمارت کی تعمیر ہوئی، اور کام بھی بہتر طریقے سے ہونے لگا۔ مولانا اور ان کے رفقاء کا یہ خواب بھی پورا ہوا۔ اب بھی یہ اسپتال بہتر طریقہ پر طبی میدان میں بہترین خدمات انجام دے رہا ہے۔

مولانا ہمیشہ مسلمان لڑکے لڑکیوں کی تعلیم کے سلسلے میں فکرمند رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک ایسا اسکول ہو جہاں جدید اور اسلامی تعلیم کا امتزاج ہو، جہاں لڑکے لڑکیوں کو جدید نصاب بھی پڑھایا جائے اور اردو و دینیات کی تعلیم بھی ہو۔ یہ زبان مسلمانوں کے تہذیب وتمدن اور ثقافت کا ذخیرہ ہے، اسے زندگی عطا کی جائے، ساتھ ہی بچوں کی ذہن سازی ہو اور ان کے اخلاق وکردار کو درست کیا جائے، ان کی بہترین تربیت بھی ہو، اس کے لئے نصاب میں دینی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ مولانا کے اس فکر کو بڑھانے میں پروفیسر زیارت حسین خاں نے موقع فراہم کیا۔ اور 1986 میں اقراء اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا اس کی انتظامیہ میں روزِ اول سے شریک رہے، زیارت صاحب نے اقراء اکیڈمی کو 1992 میں جماعت اسلامی سوشل سروس کے حوالے کر دیا اور اسکول ملت کیمپس میں منتقل ہوگیا۔ اور اب یہ اسکول اقراء پبلک اسکول کے نام سے بہار بورڈ سے ملحق ہے۔ طیب عثمانی صاحب اس کے سکریٹری رہے، اور مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔

طیب عثمانی صاحب کا منصوبہ تھا کہ ایک ایسا اسکول قائم کیا جائے جو دوسرے مشن اسکولوں کی طرح CBSC کی طرز کا ہو۔ لیکن اس کی خصوصیت یہ ہو کہ دینیات، اردو بھی اس کے

نصاب میں شامل ہو۔ اوردوسرے برادران وطن کے لڑکے لڑکیاں بھی اس میں تعلیم حاصل کریں،جن کے اخلاق وکردار پر ہم مثبت اثر ڈال سکیں۔ اس مقصد کے لئے اقراء کی ٹیم نے شتابدی فاؤنڈیشن گیا رجسٹرڈ کرایا۔اور بورڈ آف اسلامک ایجوکیشن بہار نے اس کام کو آسان کیا ۔علی گنج کے آخری حصہ میں ایک وسیع قطعہ آراضی پر دومنزلہ عمارت تعمیر کرائی گئی۔ اسکول کے نام رکھنے کے سلسلے میں رفقاء میں کافی اختلاف ہوا۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ شتابدی نہ رکھا جائے بلکہ اقراء ہی ہو۔لیکن مولانا اور شبیر صاحب کی حکمت عملی نے کام آسان کیا اور اسکول کا نام شتابدی پبلک اسکول ہوا۔اسکول کے قیام کے وقت نئی صدی یا شتابدی شروع ہوئی تھی اسی مناسبت سے اس کا نام رکھا گیا۔ جب اسکول نے دسویں کلاس اور بارہویں کلاس کا سی بی ایس سی سے الحاق حاصل کیا تو مولانا بہت خوش ہوئے ،شتابدی اسکول مولانا کے خواب کی تعبیر تھی جو اس شہر کے لئے انہوں نے دیکھا تھا۔

مولانا بڑے نرم مزاج ، رقیق القلب ،حلیم و بردبار اور حکمت و تدبر کے آدمی تھے۔ بگڑی باتوں کو بنانا ان کا خاصہ تھا، اقراء اسکول کے عمارت کی تعمیر میں پڑوسی نے رکاوٹ ڈالی ، میں نے مولانا سے کہا، چلئے اب آپ ہی بات کیجئے۔فوراً تیار ہوگئے ،وہ میرے مزاج کی تیزی اور سختی سے واقف تھے ،راستے بھر مجھے سمجھاتے رہے الجھنے سے کام نہیں بنتا، کام کرنا ہے تو کچھ باتوں کو نظر انداز کرو۔مصالحت کا رویہ اپناؤ، گرچہ اس میں اپنی ہار نظر آتی ہے لیکن مولانا نے کہا:

نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو
رزم ہو کہ بزم ہو ، پاک دل و پاک باز

دورانِ گفتگو بات تلخ ہوگئی ،اوران کے بیٹے نے بھی مداخلت کی ،مولانا نے کہا ہم لوگ ہم عمر ہیں ، بات کرلیں گے۔لڑکے کی مداخلت بے جا ہے۔ہم لوگ تھوڑے سے کام کرنے والے ہیں اگر آپس میں جھگڑتے رہے تو لوگوں کی نظروں میں ہم دونوں بے اعتبار ہو جائیں گے ،اتنا سننا تھا کہ ان صاحب نے یوٹرن لیا اور معافی مانگ کر گلے مل گئے۔ یوں مولانا نے مسئلہ کو

اپنے فکری تدبر سے حل کردیا۔اس طرح کے اور بھی بہت سے واقعات یاد آرہے ہیں جس کو بیان کرنے سے احتراز کرتا ہوں ، کیونکہ ایک تو طوالت کا خوف ہے دوسرے اپنی خودنمائی کا خطرہ محسوس ہوتا ہے۔

مولانا خانقاہوں اور صوفیت کے سلسلے میں بہت واضح تصور رکھتے تھے، گرچہ ان کا تعلق صوفی خانوادے سے تھا، مجھ سے ہمیشہ کہتے قرآن وسنت کا راستہ آسان اور بے خطر ہے، اس پر سب لوگ چل سکتے ہیں، اگر کوئی صوفی غیر معمولی کام کرتا ہے تو وہ اس کی عبادت وریاضت کا نتیجہ ہے، اس پر چلنا سب کے لئے مشکل ہے، یہ اس کا انفرادی عمل ہے، ہر زمانے میں دین کی اشاعت کا کوئی نہ کوئی ذریعہ رہا ہے، اپنے وقت میں یہ صوفیائے کرام بھی شاندار خدمات انجام دے رہے تھے لیکن اب اس نظام میں بڑی اصلاح کی ضرورت ہے۔

مولانا طیب عثمانی صاحب سے ہم لوگوں نے بھرپور استفادہ کیا، جماعت کا کام ہو یا سماجی ،ادارہ جاتی کام ، ہر مشکل وقت میں وہ ہم لوگوں کی رہنمائی کرتے رہے، خاص کر میرے مزاج کی سختی کو ختم کرنے میں مولانا کا زبردست ہاتھ ہے۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ میں کرایہ کا مکان بدلتے بدلتے ایک دن ان کے پڑوس میں آگیا اور ان کے حلقۂ اثر میں آتے ہی میرے سامنے دین ودعوت کی تمام راہیں روشن ہوگئیں۔ملت کے کاموں کو انجام دینے کے سلسلے میں ملت کے لوگوں سے جو کچھ سننا پڑتا ہے اس سے ہم لوگ اکثر دل برداشتہ ہوجاتے تھے مولانا ہم لوگوں کو سمجھاتے ۔کہتے یہ تنقید بتاتی ہے کہ ہمارا کام بڑھ رہا ہے اور ہم صحیح رخ پر جارہے ہیں صبر کے ساتھ سب کی سنئے اور اپنا کام کئے جائیے ، یہی ہر تنقید کا صحیح جواب ہے اور دینی طریقہ بھی۔
مولانا بڑے صابر تھے۔آخری ایام میں مسائل سے گھرے ہوئے تھے، لیکن کبھی اظہار نہیں کیا ،رشاد اور غزالی ان کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ اس کے لئے آمادہ نہیں تھے، دراصل گیا شہر اور ہم لوگوں کی محبت نے انہیں روک رکھا تھا۔آخری وقت میں یعنی ماہ جون 2015ان کے بچوں نے اپنے والدین کو عمرہ بھی کرایا۔مولانا انہماک سے مقدس مقامات پر دعا کرتے نظر

آئے۔

29 ستمبر 2015 کی صبح تقریباً 6 بجے غزالی کا فون آیا فوراً آ جائیے۔ ابی کی طبیعت بہت خراب ہے، لیکن جب میں پہنچا تو وہ اپنے رب اعلیٰ سے جا ملے تھے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آخر عمر بھر کی اس بے قراری کو قرار آ ہی گیا۔ مولانا عبدالحفیظ امام المنار مسجد واستاد و دینیات اقرأ اکیڈمی، نے عصر کے بعد نیو کریم گنج مسجد کے پاس نمازہ جنازہ پڑھائی، بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے، تجہیز وتدفین اپنے آبائی وطن سملہ میں ہوئی، خانقاہ کے میدان میں مولانا کے چھوٹے بھائی پروفیسر شاہ حسن عثمانی نے دوسری نماز جنازہ پڑھائی، وہاں بھی کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ گیا سے میں بھی سملہ جانے والوں میں شریک رہا۔ راستے بھر مولانا کی رفاقت جو 35 برس کی تھی یاد آتی رہی، ہم لوگوں نے ملت اور تحریک کے ایک بڑے محسن اور ہمدرد کو کھو دیا۔ جب کبھی مشکل مسائل درپیش ہوں گے، مولانا بہت یاد آئیں گے۔ رات 10 بجے تجہیز وتدفین کا کام مکمل ہوا اور ہم لوگ مولانا کو خاموش وادی میں چھوڑ کر واپس چلے آئے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

○○○

مولانا طیب عثمانی ندوی: چراغ دل سے منور رہی محفل

□ **محمد شبیر عالم خاں** (گیا، بہار)

ہر حال میں شاکر، جو پورے چہرے پر نمودار ہونے والی مسکراہٹ سے ظاہر۔ زیادہ خوش ہوئے تو ہونٹ بھینچ کر گول کر لیا۔ حساس طبیعت دل مضطرب کے ساتھ، جو ہاتھ کی بار بار جنبش سے عیاں، زیادہ تشویش ہوئی تو نچلا ہونٹ دانتوں تلے ہلکے سے دبا لیا۔ ملک، امت اور تحریک کے لئے دماغ ہر وقت متحرک۔ کسی مسئلے کا حل نظر آیا یا کوئی نئی معرفت پائی تو فوراً اپنے حلقے کے کسی فرد کو فون کیا اور کہا ''ضروری بات کرنی ہے''۔ ان کا حلقہ تحریکی، تبلیغی، ادبی، صوفیانہ، تدریسی اور عوامی افراد پر مشتمل تھا۔ سب کے ساتھ مل کر رہنے والے، مل کر چلنے والے اور اگر کسی نے راہ الگ کر لی تو بھی تعلق نبھانے والے۔ ہر بزم میں شریک، ہر رزم سے دور۔ گھر اور سماج دونوں کے مسائل سے ساری زندگی واسطہ رکھا اور گہرا واسطہ۔ ملی اور تحریکی اداروں کی ذمہ داریاں قبول بھی کرتے اور اس کی انجام دہی کے لئے کسی نہ کسی کو اپنا رفیق بنا کر آئندہ کے لئے تیار کرتے۔ صوفیاء کے مشہور اور معتبر خانوادہ کے ایک معزز بزرگ، ندوۃ العلماء سے فارغ التحصیل، علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کے اسلوب نگارش کے ترجمان، مولانا ابوالکلام آزاد کے تلمیذ خاص قاضی احمد حسین کے فیض یافتہ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی فکر وتحریک کے علمبردار، ان گونا گوں خصوصیات اور رنگوں کی یکجائی سے جو شخصیت نکھر کر پوری زندگی سرگرم عمل رہی اس کا نام تھا مولانا طیب عثمانی فردوسی ندوی۔

مولانا نے اپنے بارے میں لکھا ہے:

''میری زندگی میں دو شخصیتوں کا بڑا اثر رہا ہے جن سے میری ذہنی وفکری اور عملی تربیت ہوئی ہے اور جس کے پروان چڑھانے میں ان کا فیض رہا ہے۔ عمر کا ابتدائی زمانہ جو ذہنی نشو ونما کا تھا وہ مرشد اور شفیق والد ماجد حضرت محبوب الاولیاء مولانا شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی کے زیر تربیت رہا اور آپ کی وفات کے آخری لمحوں تک آپ کی خدمت میں مجھے رہنے کی سعادت اور آپ کی شخصیت اور روحانیت سے شعوری و غیر شعوری طور پر فیض اٹھانے کا مجھے موقع ملتا رہا۔'' پھر مولانا اپنے والد کے افکار و سلوک کو بیان کرتے ہوئے ان کے خطوط کے اقتباسات دیتے ہیں جس نے مولانا کا فکری منہج طے کیا ہوگا: ''یاد الٰہی صرف مسجد کے گوشوں اور خانقاہ کے حجروں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کا نام نہیں ہے، یہ بھی ہے مگر غریب آدمی کے لئے کام کاج چھوڑ کر ایسا کرنا گمراہی ہے۔ ہر شخص کا اس کے مناسب حال راہ سلوک ہے۔ مسلمان وہ ہے جو رات کو عبادت گذار اور دن کو میدان کا شہسوار ہو اور یہ دونوں محض خدا کے لئے ہوں۔'' مزید اقتباس خط نقل کرتے ہیں آپ قیام دین کو دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ نماز سے اگر رضائے الٰہی مقصود نہیں تو نماز سے بڑھ کر کوئی چیز دنیا نہیں ہے اور اگر حصول سلطنت سے رضائے الٰہی مقصود ہو تو حصول سلطنت سے بڑھ کر کوئی چیز دین نہیں ہے۔''

مولانا دوسری مؤثر شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دوسری عظیم شخصیت عم مکرم جناب قاضی سید احمد حسین صاحب رحمہ اللہ علیہ کی تھی۔ ندوہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد امارت شریعہ بہار واڑیسہ کے ترجمان ہفت روزہ ''نقیب'' پھلواری شریف، پٹنہ کی ادارت کے سلسلہ میں تقریباً دو برس (جنوری ۱۹۵۴ تا جولائی ۱۹۵۵) جناب قاضی صاحب کی جلوت وخلوت میں مجھے

مستقل رہنے کا موقع ملا۔ اخبار ''نقیب'' کی ادارت کے علاوہ ناظم امارت شریعہ جناب قاضی سید احمد حسین صاحب کی نظامت کی ذمہ داریوں میں شریک ومعاون رہتا۔ تنظیمی وتبلیغی خطوط لکھنا خاص طور پر میرے ذمے تھا۔ ان کاموں کے دوران ملک وملت کے مسائل اور حالات حاضرہ پر تبصرے ہوتے، دن بھر کی گفتگو اور مسائل پر ان کے تبصرے اور نکتے کے نتیجہ میں جب میں ''نقیب'' کے لئے چھوٹے چھوٹے ادارتی نوٹ لکھ کر انہیں دکھاتا تو بہت خوش ہوتے اور مجھے دعائیں دیتے۔ اس طرح میری ذہنی وفکری اور عملی تربیت میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے۔''

مولانا اپنی مجلسوں میں قاضی صاحب اور مولانا ابوالکلام آزاد کے باہمی تعلق کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ ایک بار انہوں نے بتایا کہ قاضی صاحب کہتے تھے کہ تحریک وقوم کا قائد ٹھس نہیں ہوتا بلکہ اس کا اجتہادی ذہن ہر وقت نئی راہیں تلاش کرتا رہتا ہے۔ قاضی صاحب کہتے تھے کہ دیکھو میاں طیب مولانا مودودی کا کمال کہ کل تک انتخاب میں شرکت غلط تھی لیکن پاکستان میں جمہوری انتخابی عمل کو اقامت دین کے لئے ضروری قرار دیا اور اس کے لئے ایک معقول شرعی راستہ قرارداد مقاصد پاس کروانے کا اختیار کیا اور پھر اعلان کر دیا کہ چونکہ ریاست نے کلمہ پڑھ لیا ہے اس لئے اسے اسلام کے راستے پر چلانے کے لئے جمہوری انتخاب میں عملی شرکت ضروری ہے، حالانکہ پاکستان عملاً اپنی پرانی ڈگر پر قائم تھا۔

مولانا سے میری پہلی ملاقات ایمرجنسی کے بعد ۱۹۷۷ء میں محترم نصیر الدین خان صاحب، جنہیں ہم سب زیارت بھائی کے حوالے سے ماما کہتے ہیں، کے ساتھ ہوئی۔ پہلی ملاقات میں ہی مولانا نے مجھے متاثر کیا۔ اس کے بعد جب حلقہ طلبہ اسلامی بہار سے ربط قائم ہوا تو اس کے طور پر استفادہ کا موقع بار بار ملتا رہا۔

مولانا اپنی صحت کی وجہ سے بھاگ دوڑ تو نہیں کر سکتے تھے لیکن عملی اور ذہنی طور پر سماجی، ادبی، سیاسی اور تحریکی سرگرمیوں میں ہمیشہ شریک رہے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۸۰ کی دہائی میں وہ

نوجوانوں کے ساتھ گشتی اجتماعات میں بھی شریک رہتے اور گھر گھر جا کر سبھوں کے ساتھ دعوتی ملاقاتیں کرتے۔ کوئی ذمہ داری لیتے تو پابندی اور مستقل مزاجی کے ساتھ اسے لگاتار ادا کرتے۔ چنانچہ کئی برسوں تک نیو کریم گنج مسجد میں جمعہ کی تقریر اور ہفتہ وار درس قرآن کا سلسلہ چلاتے رہے جسے بعد میں برادرم اقبال صاحب مرحوم نے برقرار رکھا اور ان کے بعد تاحال پروفیسر محمد بدیع الزماں صاحب جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مولانا کی ایک بڑی خوبی نوجوانوں اور باصلاحیت لوگوں کو آگے بڑھانے اور انہیں ذمہ داریاں دے کر ہمیشہ ان کی پشتیبانی کرنے کی تھی۔ چنانچہ گیا شہر میں تحریک اسلامی کے زیر اثر چلنے والے تعلیمی اور رفاہی اداروں کے جب وہ ذمہ دار رہے تو انہوں نے غیر رکن افراد کو اپنا نائب بنا کر سارے اختیارات تفویض کئے اور ہمیشہ انہیں آزادانہ طور پر کام کرنے کا موقع دیا۔ اس کے نتیجے میں نئے نئے افراد ان اداروں کو چلانے کے لئے ملتے رہے۔ خورشید عالم ایڈوکیٹ مرحوم، اقبال صاحب مرحوم اور بدیع الزماں صاحب کو ذمہ داریاں دے کر انہوں نے گیا شہر میں افراد سازی کا کامیاب تجربہ کیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایمرجنسی کے بعد جب وہ امیر مقامی تھے تو ملت اسپتال کی کھنڈر نما عمارت کے ایک کمرے میں چند سن رسیدہ افراد کے ساتھ بعد نماز مغرب کراسن لیمپ کی روشنی میں ہفتہ وار اجتماع ہوتا تھا۔ اس زمانے میں میں شائد واحد نووارد نوجوان تھا جو ان بزرگوں کے ساتھ جماعت اسلامی کے ہفتہ وار اجتماع میں زیادہ پابندی کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ انہوں نے بہت خاموش انداز میں مجھے رکنیت کے لیے مائل کیا اور ۱۹۸۲ء میں جب میں ۲۷-۲۸ سال کا تھا انھوں نے مجھے رکنیت ملتے ہی امیر مقامی بنوا کر ساری ذمہ داریاں سونپ دیں اور مستقل اپنے مشوروں سے مجھے سرگرم عمل رکھنے کا کام کرتے رہے۔

مولانا ہمیشہ جماعت کو ملک کے سیاسی عمل میں سرگرم کردار ادا کرنے اور ملت کے درمیان نچلی سطح سے قیادت ابھارنے پر زور دیتے رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے گیا ضلع کی حد تک منصوبہ بھی بنایا اور گیا شہر میں شانتی منچ اور ملی فورم کے سلسلے میں تحریکی نوجوانوں کی پشت پر

رہے۔ ایاز بھائی کو شانتی منچ کی ذمہ داری نبھانے کے دوران بار بار بلاتے، ان سے پیش رفت پر گفتگو کرتے اور اپنے مشورے سے ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا عبدالفتاح صاحب مرحوم جو بنگال کے امیر حلقہ اور مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن تھے دہلی جاتے ہوئے مولانا سے ملاقات کرتے اور مولانا ان سے جماعت کی سیاسی عمل میں شرکت پر تفصیلی مذاکرہ و مشورہ کرتے۔ مولانا کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دوسروں کی قدردانی اور حوصلہ افزائی میں کافی فراخ دل تھے۔ وہ اکثر کہتے ''میں تو اب بھاگ دوڑ کا آدمی نہیں رہا، فلاں فلاں لوگ بہت قیمتی ہیں ان کی قدر کرنی چاہئے'' اور ان کی قدر افزائی محض زبانی نہ تھی بلکہ وہ عملی طور پر دوسروں کے پیچھے چل کر کاموں میں شریک بھی رہتے۔

ادبی محاذ پر ایک زمانے میں وہ کافی سرگرم رہے لیکن اپنے بارے میں ہمیشہ انکساری کا اظہار کیا اور پروفیسر عبدالمغنی صاحب، م۔ نسیم صاحب اور ابن فرید صاحب کی ادبی خدمات سے نئے ادیبوں کو واقف کراتے۔ ادب اسلامی کے ترجمان کی حیثیت سے انہوں نے ملکی رسائل و جرائد میں بھی لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور مقامی سطح پر ادبی مباحثوں اور قلمی معرکہ آرائیوں میں بھی شریک رہے۔ اپنا ادبی نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ادب میں اخلاقی اقدار کی اہمیت یوں بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے جب ہم اس مسئلہ کو زندگی سے قریب ہو کر دیکھتے ہیں۔ اس لئے کہ زندگی صرف حسن، خیر اور آسودگی ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں شر، بدصورتی اور ناآسودگی بھی شامل ہے۔ ایسی صورت میں ادب اور اخلاق دونوں ہی کا فرض ہو جاتا ہے کہ ان کے ذریعے زندگی میں اعلیٰ اخلاقی جذبات ابھریں اور پروان چڑھیں، پست جذبات و محرکات دبیں اور فنا ہوں۔ ادب کی عظمت اور اس کا حسن یہ ہے کہ انسان کی اچھی خواہشوں اور روحانی محرکات کا وہ آئینہ دار ہو اور یہ اس وقت ممکن ہے جب ہم ادب کو اخلاقی اقدار کے تابع بنائیں۔ اس طرح ہمارے ادب کا معیار باوقار ہوگا اور قابل وقعت سمجھا جائے گا۔''

ایک زمانے میں گیا شہر کے رفقاء کے درمیان بھی یہ بحث رہتی تھی کہ تحریک کو اداروں کے کام سے کیا فائدہ ہے، اس میں تو ہماری انرجی ضائع ہوتی ہے، اصل کام تو دعوت وتحریک کا ہے۔ مولانا کہتے سب کام ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں اور ہر کام کی اہمیت ہے، ان کے درمیان موازنہ اور مقابلہ میں اپنی قوت لگانے کے بجائے افراد کو ان کی صلاحیت اور ذوق کے مطابق کام کرتے رہنا چاہئے، بس بنیادی فکر تحریک اسلامی کی رکھنی چاہئے۔ چنانچہ وہ ادارہ سازی کے کاموں میں آخری ایام تک شریک رہے اور بھرپور شریک رہے۔ اور کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی اور ان اداروں کی خاکہ سازی کرتے رہے۔ ادارہ سازی اور اداروں کی اہمیت ان کے نزدیک مسلم تھی۔ اسی لئے وہ نصیر ماما کی اس خوبی کا برملا اظہار کرتے کہ نصیر صاحب بہت ہمت والے آدمی ہیں کہ وسائل کے بغیر بھی بڑے بڑے ادارے قائم کرنے میں مستقل لگے رہتے ہیں۔ نصیر ماما بھی مولانا کے بڑے مداح تھے چنانچہ سب کچھ تو خود کیا لیکن جامعہ البنات کا سنگ بنیاد مولانا سے رکھوایا اور مولانا بھی جو تھوڑی دور کا سفر کرنے میں بھی اختلاج محسوس کرتے تھے محض حوصلہ افزائی کے لئے اس تقریب میں پورے جوش وجذبہ سے شریک ہوئے۔ اداروں کے سلسلے میں مولانا کا ذہن واضح تھا کہ تحریک کے ذریعہ قائم اداروں کا کلید بردار تحریکی فرد کو ہی ہونا چاہئے ورنہ بعد میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ملت اسپتال کے انتہائی سرگرم عمل سکریٹری خورشید عالم صاحب ایڈوکیٹ، جو ان سے قلبی تعلق رکھتے تھے لیکن ملت اسپتال کے لئے غیر متعلق با صلاحیت فرد کو ذمہ دار بنانے کا رجحان رکھتے تھے، مولانا دوٹوک انداز میں کہتے کہ دیکھو بھئی خورشید اگر کل کلاں کو طیب اور خورشید تحریک سے کنارہ کش ہو جائیں تو جو بھی زید بکر تحریک کا ہوگا اسی کے ہاتھ میں ملت اسپتال کی کلید ہوگی۔

مولانا اپنے آپ کو لیے دیے رہنے والے آدمی نہ تھے بلکہ ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ تعلق رکھتے اور ان کو برتنے کا سلیقہ جانتے تھے۔ تیز مزاج، اکھڑ، مرنجاں مرنج، باتونی، کم آمیز، بذلہ سنج، تنقیدی، راست گو، کم فہم، بلند آہنگ، منکسر المزاج ہر قسم کے لوگوں سے ان کے

مراسم رہے اور پوری زندگی انہیں اپنا بنا کر رکھا۔ مولانا تھے تو سنجیدہ مزاج لیکن کبھی کبھی ان کی حاضر جوابی میں بذلہ سنجی کا عنصر بھی شامل ہوتا، خاص طور پر اپنے قریبی دوستوں کے درمیان۔ محترم قیوم اثر مرحوم جو مولانا سے عمر میں بڑے اور سوشلسٹ انقلابی فکر کے حامل تھے اور قریبی رشتہ دار بھی، ان سے پر لطف مباحثہ ہوتا۔ قیوم اثر صاحب کہتے طیب میاں، لیکن لہجے میں احترام ہوتا اور مولانا کہتے قیوم بھائی اور دونوں اپنے اپنے نکتہ نظر کی وکالت کرتے، کبھی نوک جھونک تو کبھی ایک دوسرے کی باتوں سے اتفاق۔ محترم منظور الحسن خاں صاحب، جماعت کے یکسو اور ٹھیٹ اور بلند آہنگ قسم کے کارکن اور مولانا مرنجاں مرنج اور دھیمے لب ولہجہ کے بزرگ۔ دونوں میں اچھی نبھتی۔ ایک بار گشتی دعوتی ملاقات کے دوران مختلف گھروں میں چائے بسکٹ لینے پر محترم منظور صاحب نے مولانا کو چھیڑا کہ آپ لوگوں کے پیٹ میں کتنی جگہ ہے کہ ہر جگہ چائے بسکٹ مارتے جا رہے ہیں۔ مولانا نے جواباً کہا منظور صاحب اصل میں ہم لوگ مسنون طریقے سے کھاتے ہوئے پیٹ کا ایک تہائی خالی رکھتے ہیں، اس لئے گنجائش رہتی ہے۔ منظور صاحب بھی مسکرا دیئے۔

مولانا پوری زندگی ذہنی طور پر فعال رہے اور قرطاس وقلم سے تعلق رکھا لیکن آخری دو سال انہوں نے دماغی کمزوری کے ساتھ گذارے۔ چند منٹ یکسوئی سے کسی موضوع پر بات کرتے، پھر بھولتے اور انہیں باتوں کو دہرانے لگتے اور پھر کمزوری سے نیند آنے لگتی۔ ان سے آخری ملاقات موت سے ایک دن پہلے بدیع الزماں صاحب کے ساتھ ان کے گھر پر ہوئی۔ دس منٹ تک بات کرتے رہے اور لیٹتے ہوئے کہا آتے رہیے گا، ضروری بات کرنی ہے۔ بہرحال ہم سب کو ایک محدود دنیوی زندگی ملی ہے لیکن مولانا اس محدود زندگی کو بھرپور جیئے اور دوسروں کو بھی سرگرم جینے کا حوصلہ دیتے رہے۔

○○○

مولانا طیب عثمانی مرحوم اوران کی اقبال شناسی

❑ پروفیسر ابوذر عثمانی (رانچی، جھارکھنڈ)

مولانا طیب عثمانی جدید اردو ادب میں اپنی متنوع اور فکر خیز علمی وادبی نگارشات خصوصاً اپنے معتدل نظریۂ ادب اور اسلوب نقد کی وجہ سے اپنی ایک منفرد اور واضح شناخت رکھتے ہیں۔انھوں نے ادبی تنقید اور سیرت وسوانح نگاری کے علاوہ جن میں انھیں خصوصی درک رہا اور جن دوسری جہتوں سے ادبی خدمات انجام دی ہیں ان کی قدر و قیمت اپنی حدود میں مسلم ہے۔ انھوں نے ادب کے ساتھ صحافت سے بھی ایک حد تک دل چسپی لی اور عصری حالات کے تناظر میں مذہب، سیاست اور زبان وتعلیم کے مسائل پر خاصے اہم اور کارآمد مضامین لکھے جوان کی گہری علمی وفکری بصیرت پر دال ہیں اور ان کے مخصوص طرز استدلال اور دل کش اور سحر آگیں انداز بیان سے بین طور پر متاثر کرتے ہیں۔انھیں مطالعۂ اقبال سے بھی گہرا شغف رہا اور کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اس ضمن میں اقبال کی متضاد فکری تعبیرات کے درمیان تفہیم اقبال کی نسبتاً صحیح سمت اور بنیاد کی نشان دہی کی جس پر اس سے قبل غالباً کسی صاحب نقد ونظر کی نظر توجہ نہیں گئی تھی۔

طیب عثمانی صاحب تعمیر پسند مکتب فکر کے اہم نقادوں میں رہے ہیں۔انھوں نے تعمیر پسند ادبی رجحان کو فروغ دینے میں اس لحاظ سے بلاشبہ اہم کردار ادا کیا اور ان کے اس سلسلے کے بصیرت افروز اور خیال انگیز مضامین اور اداریئے تعمیر پسند ادب کے ترجمان رسائل میں برسہا برس تک شائع ہوتے رہے۔ان کی یہ نگارشات ’ادبی اشارے‘ کے نام سے باضابطہ کتابی شکل

میں شائع ہو کر منظر عام پر آگئی ہیں جس سے ان کے ادبی موقف اور رویے کی بابت زیادہ واضح رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ڈاکٹر حسن رضا کے اداریئے جو ادھر چند برسوں سے ’پیش رفت‘ میں تواتر کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں اسی سلسلے کی ایک کڑی تصور کیے جائیں گے۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ یہ مولانا طیب عثمانی مرحوم اور ان کے ساتھ دوسرے تعمیر پسند ادبا اور ناقدین کی کاوشوں ہی کا نتیجہ ہے کہ آج یہ ادبی رجحان دوسرے رائج ادبی رجحانات کے درمیان اپنی متوازن اور واضح نظریاتی بنیاد سے پہچانا جاتا ہے اور اردو ادب کے قارئین کے ایک بڑے حلقے میں محبوب اور مقبول ہے۔میرے نزدیک طیب عثمانی صاحب کے مطالعے کا یہ پہلو خصوصیت کے ساتھ اہم ہے کہ ان کی علمی وادبی کاوشیں اپنے تنوع کے باوجود اپنی اندرونی ہم آہنگی اور فکری وحدت کی وجہ سے ایک نمایاں نقش اور اثر چھوڑتی ہیں جس نے ان کی ادبی شخصیت کو فی الواقع ایک امتیازی حیثیت عطا کی اور وہ اپنے منفرد نظریۂ ادب اور انداز نقد کی بنا پر تعمیر پسند مکتب فکر کے ایک اہم اور نمائندہ نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔اس باب میں ان کے یہ الفاظ قابل غور ہیں۔

> ’میرے ادبی اور تہذیبی مزاج کو بنانے اور سنوارنے اور پروان چڑھانے میں جہاں میری خاندانی، دینی روایات و دبستان شبلی سے ذہنی و ادبی وابستگی اور عالمی اسلامی ادب وتحریک سے فکری ہم آہنگی شامل رہی ہیں وہیں میری زندگی ادب وتہذیب، دین و مذہب اور سیاست و اجتماعیت کا ایک ایسا مرکب ہے جو باہم اس طرح ہم آمیز اور رچے بسے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جاسکتے۔اس طرح میری ذات کی تعمیر میں ان تین عناصر ادب، مذہب اور اجتماعیت کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ان عناصر نے میرے ادبی وفکری انداز نظر کی ایسی مستحکم تشکیل کی ہے جو عالم گیر اخلاقی اصول پر قائم ہیں اور جو آج کے ادب وفن کے ذریعے تہذیبی اقدار کی نئی تشکیل کر سکتے ہیں‘

طیب عثمانی صاحب نے ان فقروں میں اپنی ادبی شخصیت اور فنی معتقدات کے باب میں چند نکات کی طرف بدیہی طور پر اشارے کر دیے ہیں۔ یہاں اس ذیل میں ان کے مضامین 'ادب میں معیار و اقدار کا مسئلہ' اور 'ادب میں اخلاقی اقدار کا تصور' کا خصوصی طور پر حوالہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جن میں انھوں نے ادب کو اخلاقیت اور جمالیت کا مرکب بتاتے ہوئے اس کی مفصل اور مدلل انداز میں توجیہہ کی ہے اور اپنے ادبی نظریے کو بہ خوبی واضح کر دیا ہے۔ طیب صاحب اخلاقی اقدار سے بنیادی روحانی تجربات مراد لیتے ہیں جو انسان کو اعلیٰ صفات اور انسانی اقدار سے متصف کرتے ہیں اور اس بنیاد پر وہ اخلاق کو مذہبی عقیدے کا ایک جزو قرار دیتے ہیں اور مذہب و اخلاق کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ تصور کرتے ہیں۔ اس باب میں ان کی یہ توجیہہ توجہ طلب ہے کہ ہر بڑے فن کار کے یہاں اخلاقی اقدار کسی تہذیب اور عقیدے کے پس منظر ہی میں کافی گہری اور رچی بسی اور اس کی شخصیت میں پیوست نظر آتی ہیں اور اس کے فنی کارناموں میں لازماً جلوہ گر ہوتی ہیں۔ طیب عثمانی صاحب نے شعر و ادب کے تہذیب اور اخلاق سے فطری ربط و رشتے کی بنیاد پر اپنے ادبی مطالعے کو ایک نمایاں فکری سمت اور جہت عطا کی ہے۔ مولانا موصوف ادب کے فکری پہلو کو بہ ظاہر اس کے تخلیقی عمل کے ایک جزوی حیثیت سے خصوصی اہمیت دیتے ہیں مگر وہ ادب کے فکری اور فنی پہلوؤں کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ادبی تخلیق کو ایک کل کی حیثیت سے دیکھتے اور خیال و جمال اور فکر و فن کی مکمل ہم آہنگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس طرح ادب میں مقصدی شعور کے ساتھ معنوی گہرائی پیدا کر کے جو اعلیٰ ادب کا بین امتیاز ہے ادب کے حقیقی منصب کو بہ روئے کار لایا جا سکتا اور اس کی زیادہ بہتر شعور و بصیرت کے ساتھ تفہیم اور جانچ پرکھ کا کام انجام دیا جا سکتا ہے۔

میں نے یہ چند باتیں طیب عثمانی صاحب کی اقبال شناسی کے ذیل میں تمہیداً عرض کی ہیں تاکہ ان کی فکری اساس اور پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے مطالعۂ اقبال کے امتیازی نقش کو قرار واقعی اجاگر کیا جا سکے۔ میں یہاں ان کی تصنیف 'حدیث اقبال' پر سیارہ لاہور میں اپنے

شائع شدہ مضمون کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں جس میں میں نے ان کی تعبیر و تاویل سے دو ایک مقامات پر جزوی اختلاف کرتے ہوئے اقبال کے فکری پس منظر اور مقصد حیات کی نسبتاً صحیح اور مثبت ترجمانی کی بنیاد پر اسے ایک معتبر اور قابل قدر کوشش قرار دیا تھا۔ مصنف کی موجودہ تصنیف 'اقبال - شخصیت اور پیام' جو ان کی اول الذکر تصنیف 'حدیث اقبال' کے نقش ثانی کے طور پر چند مزید ابواب اور مباحث کے اضافے کے ساتھ منظر عام پر آئی ہے، اقبال کے افکار و تصورات کا یقینی طور پر زیادہ بہتر اور جامع انداز میں احاطہ کرتی ہے۔ طیب صاحب کی یہ تصنیف اس لحاظ سے بالخصوص قابل تحسین قرار دی جائے گی کہ اس میں ان کی ادبی فکر جس پر فکر اقبال کا پرتو واضح ہے، زیادہ بھرپور شکل میں اجاگر ہوئی ہے اور ان کی اس کاوش کو ایک منفرد حیثیت عطا کرتی ہے۔ طیب صاحب مطالعۂ اقبال کے باب میں اپنی اس گراں مایہ تصنیف کا مدعا اس صاف اور دوٹوک انداز میں واضح کرتے ہیں۔

'اس مجموعے میں زندگی کے مختلف مسائل اور گوشوں کی اقبال کے نقطۂ نظر سے وضاحت کی گئی ہے اور اقبال نے جو کچھ کہا ہے اس کو ویسا ہی پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح سے اقبال کا حقیقی فکر اور اس کا حقیقی نظریہ اس کے کلام کی روشنی میں اجاگر ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ اس کتاب کا مدعا یہ ہے کہ اقبال جو کچھ اور جیسا کچھ تھا اس کی صحیح تصویر کلام اقبال کے آئینے میں سامنے آ جائے۔'

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے پیش لفظ میں طیب صاحب کے اس نقطۂ نظر اور انداز کار کو بدیں الفاظ سراہا ہے۔

'طیب عثمانی صاحب نے اپنی اس تصنیف میں فکر اقبال کا تجزیہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کا یہ طریقۂ کار درست اور لائق تحسین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے کلام و پیام کو اسلامی تعلیم کی روشنی ہی میں

سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح جیسے دانتے کی شاعری کو مسیحی مذہب کو جانے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی تصنیف سے اپنے پیش نظر جو مقصد رکھا ہے اس میں انھیں کامیابی حاصل ہوگی اور ملک کے نوجوانوں کو شاعرِ مشرق کے کلام و پیام کی روح تک رسائی حاصل ہو جائے گی۔'

یہ مجموعہ مضامین کل 13 ابواب پر مشتمل ہے جو علی الترتیب درج ذیل ہیں۔

(1) فکر اقبال (2) اقبال کا نظریۂ شعر و ادب (3) اقبال کی شخصیت کے تخلیقی عناصر (4) اقبال کا پیام عصر حاضر کے نام (5) اقبال کی شاعری میں آدمی کا مقام (6) انسان کامل اقبال کی نگاہ میں (7) اقبال اور عشق رسول (8) اشتراکیت اور اقبال (9) عورت اور اقبال (10) اقبال اور مسلمان نوجوان (11) تعلیم اور اقبال (12) فقر اسلامی اقبال کی نگاہ میں (13) اقبال اور عالمی ادب (14) اقبال کی چند منتخب نظمیں۔

عنوانات پر ایک نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہو جائے گا کہ ان کی حدود میں وہ سارے تصورات آگئے ہیں جن پر اقبال کی شاعری کی اساس ہے اور جیسا کہ موضوعات کے انتخاب اور ترتیب سے ظاہر ہے یہ کتاب اقبال کے خیالات و افکار کی صحت فہم و شعور کے ساتھ ترجمانی کی ایک منفرد کوشش قرار دی جائے گی۔ مصنف کا مقصد دراصل کلام اقبال کی روشنی میں شاعر کی حقیقی فکر اور نظریے کو نمایاں کرنا رہا ہے جس کے بغیر اقبال کی شاعرانہ شخصیت کی کلیتاً تفہیم و تعبیر کا دعوی نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں یہ نکتہ پیش نظر رہنا چاہیے جس کی طرف موصوف بہ جا طور پر اشارہ کرتے ہیں کہ ان کے مطالعۂ اقبال کا اصل مدعا اقبال کی شاعرانہ خوبیوں کے تناظر میں ان کے افکار و عقائد سے روشناس کرنا رہا ہے جو ان کی شعری تخلیق کے عمل کا اساسی محرک رہے ہیں جنھیں نظر انداز کر کے اقبال کے کلام و پیام کی روح تک رسائی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

یہاں طیب عثمانی صاحب کا ان کے پیش رو اور معاصر اقبال شناسوں سے موازنہ مقصود

نہیں۔ طیب عثمانی صاحب کا اس باب میں یہ اختصاص بہ ہر حال واضح ہے کہ اقبال پر ڈھیر ساری کتابوں کے انبار میں جو چند قابل قدر اور یادگار کتابیں ہیں ان میں یہ کتاب اقبال کی مقابلتاً صحیح تفہیم و تعبیر اور اپنے منفرد انداز پیش کش کی وجہ سے یاد رکھی جائے گی۔ طیب عثمانی صاحب کی یہ تصنیف جیسا کہ ان کے اپنے الفاظ سے ظاہر ہے فکر اقبال سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے مطالعۂ اقبال کے باب میں ایک نیا نور اور نئی نظر عطا کرتی ہے اور اپنے دل نشیں اور سحر انگیز انداز بیان کی وجہ سے واقعتاً متاثر کرتی ہے۔

مصنف کا مقصد جیسا کہ قبل واضح کیا جا چکا ہے فکر اقبال کے مطالعے کی صحیح سمت اور خطوط کو زیادہ منضبط شکل میں پیش کرنا رہا ہے اور کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس جہت سے اپنی اس کاوش کو اپنی فکر و نظر کی حدود میں صحت اور احتیاط کے ساتھ بہ روئے کار لانے میں کامیاب رہے ہیں۔ طیب عثمانی صاحب اپنے اس اصول اور موقف کے پیش نظر کہ مطالعۂ اقبال کے جس پہلو سے بحث کی جائے اقبال کے فکری پس منظر اور ان کے تصور حیات کو نظر انداز نہ کیا جائے، مذکورہ کتاب کے تمام مباحث میں اس پر سختی سے کاربند رہے ہیں۔ فکر اقبال خصوصاً اسی نکتے کی توضیح پر مبنی ہے کہ اقبال کو سمجھنے کے لیے ان کے فکری پس منظر اور ان کی شخصیت کے تخلیقی عناصر کو سمجھنا ناگزیر ہے۔ مصنف نے اس سلسلے میں جو اشارے کیے ہیں بہت ہی معنی خیز ہیں اور ان سے اقبال کی فکر کے اصل اور امتیازی خط و خال نمایاں ہو جاتے ہیں اور ان غلط تاویلات اور توجیہات کا پردہ چاک ہو جاتا ہے جو ان کے اپنے الفاظ میں اقبال کی شاعری کے ظاہری خول اور فلسفیانہ زبان کی لفظی اصطلاحات تک محدود رہنے کا نتیجہ ہیں۔ مصنف کے خیال میں اقبال نے حیات و کائنات کے مطالعے اور مشاہدے میں ہمیشہ قرآن کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھا اور ان کا ادب و فن بھی قرآنی ادب و فن ہی کا خوشہ چیں ہے۔ اقبال نے خود بھی متعدد مقامات پر اس کی وضاحت کر دی ہے کہ انھیں جن نظام سے عملاً دل چسپی ہے وہ اسلام ہے اور انسانیت کی فلاح و نجات وہ صرف اسلام میں پاتے ہیں۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ 'میری شاعری کے مطالعے سے پہلے

حقائق اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تصریحات کے بعد اقبال کے فکر وفلسفے کی تعبیر میں کسی طرح کے مغالطے اور غلط بیانی کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا جسے مصنف کے الفاظ میں چشم غلط بیں کے فساد ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں بال جبریل کی نظموں 'شاہین'، اور 'مسولینی' کے حوالے سے فاشزم کی طرف ان کے میلان کی جس گم راہ کن اور مبالغہ آمیز انداز میں تشہیر کی گئی ہے، اس کی لغویت کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ دراصل یہ نظمیں اردو نظم نگاری کے عمومی اور روایتی طرز سے ہٹ کر لکھی گئی ہیں اور یہ ان کے اندرونی رمزی پہلو کو نظر انداز کرنے ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کی مغالطہ انگیز تعبیر کی گئی جس کی علامہ اقبال نے آل احمد سرور کے استفسار پر اپنے ایک مکتوب میں بدیہی طور پر نشان دہی کر دی ہے (ملاحظہ ہو ماہ نو، کراچی بابت 12/مارچ 1937ء) جس کے بعد اس معاملے میں اس نوع کی بحث وتمحیص کی کوئی گنجایش نہیں رہ جاتی اور اسے فضول اور بے معنی ہی کہا جائے گا۔ اب رہا اشتراکیت کا ایک نظریے، نظام اور تحریک کی حیثیت سے ابھار تو انھوں نے اس سے یقیناً دل چسپی لی جس کا پرتو ان کے اردو اور فارسی کلام پر واضح ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اس کے مقابلے میں اسلامی فکر کی آفاقیت کو جو روحانی اور مادی زندگی کے توافق پر مبنی ہے صریحاً ترجیح دی اور اشتراکیت کو اس کی مادی فکری اساس اور روحانیت سے بیگانگی اور خدا ناشناسی کی بنا پر یکسر رد کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے اشتراکیت سے متعلق ان کے خیالات کو اس نظریے اور نظام کی طرف ان کے بڑھتے ہوئے میلان سے تعبیر کرنا کسی طرح درست نہیں کہا جا سکتا جیسا کہ جواہر لال نہرو کی مشہور زمانہ تصنیف DISCOVERY OF INDIA میں اقبال سے متعلق ان کے ان فقروں سے ظاہر ہے جسے ہمارے اشتراکی دوستوں نے اپنی خیال آرائیوں سے رائی کا پہاڑ بنا دیا۔

> During his last years Iqbal turned more and more towards socialism. The great progress that soviet Russia had made attracted him. Even his poetry took a different turn. (The Discovery of India by Pandit Jawahar lal Nehru)

ترجمہ: اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اقبال اشتراکیت کی طرف تیزی سے مائل ہوتے گئے۔ سوویت روس کی عظیم ترقی ان کی دل چسپی کا باعث ہوئی یہاں تک کہ ان کی شاعری ہی نے ایک نیا موڑ لے لیا۔

طیب صاحب نے اس غلط اندیشی کا ازالہ کرتے ہوئے اشتراکیت سے اقبال کے ربط ورشتے کی حقیقت بہ خوبی واضح کر دی ہے جس کے بعد اس سلسلے میں خلط مبحث کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

یہ بات قابل غور ہے کہ اقبال کے مطالعے میں ہمارے ترقی پسند ادبا کا رویہ ادھر خاصا بدلا ہے اور اب وہ اقبال کی شاعری کو اسلامی فکری روایات سے الگ کر کے نہیں دیکھتے اور اس سلسلے میں اشتراکی فکر کی رنگ آمیزی ضروری نہیں سمجھتے۔ سردار جعفری اور احمد ندیم قاسمی اقبال کی فکری تعبیر میں اسی مثبت رویے کا اظہار کرتے ہیں۔ عزیز احمد اقبال کے خیالات کی حقانیت اور ان کے وسیع اور بلند تفکر کی بنا پر انھیں گیٹے اور دانتے جیسے دنیا کے عظیم شاعروں کی اول ترین صف میں جگہ دیتے ہیں جس میں ان کے خیال میں صدیوں کے بعد کسی شاعر کو جگہ ملتی ہے۔ آل احمد سرور جو اپنے آپ کو کسی گروہ اور مکتب فکر سے وابستہ نہیں کرتے اسلام اور قرآن کو قطعیت کے ساتھ مطالعۂ اقبال کی حقیقی بنیاد قرار دیتے ہیں اور اس حقیقت کے اظہار میں جھجک محسوس نہیں کرتے کہ اپنے نظریے اور عقیدے کے مطابق اقبال جس عالمی برادری اور مساوات انسانی کے تصور پر یقین رکھتے اور اسے بہ روئے کار لانا چاہتے ہیں اس کے لیے ان کے نزدیک اسلام کا راستہ ہی سب سے زیادہ موزوں اور مناسب ہے جو ہمیں ان کی منزل اور راستے سے آگاہ کرتا ہے (ملاحظہ ہو سرور صاحب کی کتاب دانشور اقبال ص 115)

اس کتاب کا ایک بہت ہی اہم باب 'اقبال اور عشق رسول' ہے۔ اقبال کو رسول اکرم کی ذات اقدس سے جو والہانہ عقیدت اور محبت تھی اس سے فکر اقبال کا ہر اداشناس واقف ہے۔ عشق رسول کی کارفرمائی ان کے ذہن وفکر اور مزاج وشعور کی تہذیب وتربیت میں واضح ہے۔ طیب

صاحب کے یہ الفاظ اس ضمن میں خاص طور پر توجہ کش ہوتے ہیں۔

’اقبال کے کلام میں جو عشق کی سوزش، اس کی سرمستی و سرخوشی، سوز و ساز اور درد و داغ پایا جاتا ہے وہ دراصل عشق رسول ہی کا نتیجہ ہے۔ اس حقیقت پر غور کیا جائے تو اقبال کے فکر و تخیل کے بہت سے گوشے از خود واضح ہو جاتے ہیں اور ان کی زندگی اور فکر کا رخ بھی متعین ہو جاتا ہے اور پھر یہ شعر تو گویا اس بحث کا فیصلہ ہی کر دیتا ہے۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اونہ رسیدی تمام بولہبی است

کہہ سکتے ہیں کہ طیب عثمانی صاحب نے اس موضوع کی اہمیت کو سمجھا ہے اور اقبال کے نظام فکر میں اس کی صحیح جگہ متعین کر دی ہے۔

مصنف نے عورت، تعلیم، اور فقر کے باب میں بھی اقبال کے تصورات کی صاف اور صریح انداز میں ترجمانی کی ہے۔ اقبال عورت اور مرد کی مساوات مطلق کے قائل نہیں اور ایک واضح نقطۂ نظر کے تحت آزادیٔ نسواں کے بڑھتے ہوئے میلان پر معترض ہیں جس نے ان کے خیال میں عورت کی نسوانیت کے تحفظ کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عورتوں کی آزادی سے جڑے ہوئے ان کی اعلیٰ تعلیم کے عمومی فروغ کے غیر عملی تصور نے اسے مزید بڑھاوا دیا ہے جس سے خاندانی وحدت کا رشتہ جو بنی نوع انسان کی روحانی زندگی کا لازمی جزو ہے، ٹوٹ رہا ہے اور یہ یقیناً ایک بڑا المیہ ہے۔ طیب صاحب نے اس پس منظر میں اسلام نے عورت کو معاشرے میں جو اعلیٰ مقام عطا کیا ہے اس کی معقول اور مدلل انداز میں توجیہہ کی ہے۔

طیب عثمانی صاحب نے اقبال کے تصورات وافکار کے ضمن میں ان کے کلام و پیام کے ایک جزو کی حیثیت سے ان کے تصور تعلیم پر بھی توجہ مرکوز کی ہے اور اس کی اہمیت واضح کی ہے۔ اقبال کے نزدیک تعلیم کا حقیقی مقصد انسان کی خودی کو پروان چڑھانا، دوسرے لفظوں میں

انسان کی داخلی اور اندرونی زندگی کو جلا دینا اور اس کے روحانی اوصاف کو اجاگر کرنا ہے جس کے بغیر انسانیت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ ان کا پختہ خیال ہے کہ موجودہ علم و سائنس، مذہب و اخلاق سے بیگانہ اور انسان کی خارجی اور بیرونی دنیا تک محدود رہنے کی وجہ سے مذکورہ خصوصیات سے کلیتاً عاری ہیں اور حقیقی معنوں میں انسانی سیرت کو جلا اور پاکیزگی عطا نہیں کر سکتے۔ وہ موجودہ تعلیم کے اس پہلو پر بالخصوص نکتہ چیں ہیں کہ اس نے زندگی کو تمام تر معاش کے دائرے میں محدود کر دیا ہے اور ہمارے نوجوانوں کی تمام تر قوتیں اور توانائیاں صرف کسب معاش کی تگ و دو میں زائل ہو رہی ہیں جس کے نتیجے میں ان کی علمی و فکری صلاحیت کا حقیقتاً نشو و نما نہیں ہوتا اور اس کے سوتے خشک ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اقبال اس پس منظر میں موجودہ نظام تعلیم کو متوازن اور نتیجہ خیز بنانے پر زور دیتے ہیں جو ان کے نقطۂ نظر سے دین و اخلاق کی آمیزش کے ساتھ صنعت اور سائنس کے التزام کا بین طور پر تقاضا کرتا ہے۔ طیب عثمانی صاحب نے موجودہ نظام تعلیم کے باب میں جس کا نقص و ناتمامی عیاں ہے اقبال کے اس نقطۂ خیال کو بڑی خوبی اور عمدگی سے واضح کر دیا ہے۔

اقبال کا تصور فقر جسے وہ فقر قرآنی سے موسوم کرتے ہیں ان کے تصور تعلیم سے بالکلیہ ہم آہنگ ہے اور اصلاً اسی کی توسیع و ترفع قرار دیا جائے گا۔ ان کے نزدیک فقر بھی خودی کو نشو و نما و جلا دینے کے عمل سے عبارت ہے اور یہ اسی کا اثر ہے کہ ایک مرد مومن کلیتاً رضائے الٰہی کے تابع رہ کر ہر دو جہاں سے بے نیاز ایثار، بے نفسی اور بے خوفی کی ممیّز خصوصیات کے ساتھ مولا صفات بن کر ابھرتا ہے۔ اقبال فقر کو گدائی اور سربزیری کے روایتی مفہوم کو خیر باد کہہ کر اسے الوہی شان بے نیازی، اصل شہنشاہی اور میری سے تعبیر کرتے ہیں جس سے ایک مرد مومن کے جسور و غیور پیکر اور اس کے ارفع و اعلیٰ کردار کا اندازہ ہوتا ہے اور وہ فقر و درویشی کی حقیقی صفات اور خصوصیات کے ساتھ آدمیت کے مثالی تصور اور نقش کو اجاگر کرتا ہے۔

طیب صاحب کے مضامین ’اقبال کا پیام عصر حاضر کے نام‘ اور ’اقبال کی شاعری میں آدمی کا مقام‘ بہ شمول ’انسان کامل اقبال کی نگاہ میں‘ جو مولانا ابوالحسن ندوی کے عربی مقالے کا

ترجمہ ہے دراصل ان کے اسی اساسی مبحث کی مزید توضیح وتنقیح کی حیثیت رکھتے ہیں اور اقبال کے کلام کی اندرونی تہوں تک پہنچنے میں قرار واقعی معاون ہوتے ہیں۔طیب صاحب نے اس ضمن میں ایک بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ اقبال کا سارا کلام ہی ایک پیام ہے جسے وہ مجملاً توحید کے آفاقی تصور الخلق عیال اللہ کی تفسیر احترام آدم سے موسوم کرتے ہیں جس نے انسانی تہذیب و تربیت کے ایک با قاعدہ نظام کی بنیاد ڈالی اور احترام آدم، اس کی حفاظت اور آدمیت کی تکمیل کو اس کا اصل اصول ٹھہرایا۔ اقبال اس باب میں رسول کریمؐ اور اسلام کی تعلیمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسانی فضیلت کے تصور ہی کو ایک صالح انسانی معاشرے کی تکمیل کی اصل بنیاد قرار دیتے ہیں جس سے انسانیت کا فروغ اور صلاح وفلاح حقیقتاً وابستہ ہے۔طیب عثمانی صاحب بہ جا طور پر معترف ہیں کہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ روحانی اور اخلاقی اجتماعیت کا جو نظام پیش کیا ہے وہ احترام وتوقیر آدم کے تصور ہی پر مبنی ہے اور آدمی کو ساری کائنات سے بلند تر مقام عطا کرتا ہے۔

طیب صاحب آدمی کو اقبال کی شاعری کا اصل موضوع قرار دیتے ہیں اور حیات و کائنات میں آدمی کے رشتوں اور اس کے حدود وامکانات کے تعین اور اس کے مقصد وجود اور نصب العین کے فہم وادراک کو اقبال کے کلام و پیام کے اساسی اور مرکزی نقطے کی حیثیت سے اجاگر کرتے ہیں۔ان کے خیال میں اقبال مشرق کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے آدمی کو کائنات کے مرکز کی حیثیت دی ہے اور انسان کو جس وسیع وبلیغ مفہوم میں اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے وہ بنی نوع انسان سے شاعر کی گہری وابستگی اور ہم دردی اور انسان دوستی کی غمازی کرتا اور اس کی شاعری کے آفاقی اور اجتماعی ہونے پر دلالت کرتا ہے جس کی کوئی اور مثال فکر ونظر کی اس وسعت کے ساتھ اردو شاعری میں نہیں ملتی۔واقعہ یہ ہے کہ اقبال کی شاعری اپنی منظم فکری اساس اور اپنے تفکر کے پھیلاؤ، بلندی اور عظمت کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ یہاں اس نکتے کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے جس کی طیب صاحب نے پیام اقبال کے حوالے سے خصوصیت کے ساتھ نشان

دہی کی ہے کہ انسانی زندگی کا اصل منشا ومقصد انسانیت کے شرف ووقار کو بڑھانا ہے جو اقبال کی شاعری میں ان کے شعری شعور اور فکر کے ایک اساسی جزو کی حیثیت سے شامل ہے۔

اقبال اس پس منظر میں روحانی اور اخلاقی اقدار واوصاف کے حامل افراد پر مشتمل ایک ایسے عادل، منضبط اور مثالی معاشرتی نظام کا تصور پیش کرتے ہیں جو فرد وملت کے ربط باہمی کا نمونہ بن کر اور انسانی رشتوں میں توافق اور ہم آہنگی پیدا کر کے انسانیت کو اس کا مفروضہ شرف ووقار اور بلندی عطا کر سکے اور انسان آدمیت کے معراج کو پالے۔انھوں نے اسی احساس کے تحت قوم وملت کی شیرازہ بندی کے عمل میں اسلامی تعلیمات کو رہ نما بنایا اور توحید ورسالت کے اصول کو مقدم رکھ کر انسانی وحدت کے حقیقی شعور سے روشناس کیا۔وہ اپنے اس عندیے پر کوئی پردہ نہیں رہنے دیتے جیسا کہ طیب صاحب نے وضاحت کی ہے کہ رسول کریمؐ کے نظریہ وطریقۂ زندگی اور آپ کی حریت، اخوت ومساوات پر مبنی تعلیمات کے عملی نمونے کو سامنے رکھ کر ہی ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جا سکتی ہے جس میں طیب صاحب کے الفاظ میں انسان اخلاقی و انسانی شرافتوں اور فضیلتوں کی انتہا پر پہنچ سکے اور وہ غیر اخلاقی اور نامناسب امتیازات معدوم ہو جائیں جو آج ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان حد فاصل بنے ہوئے ہیں جس نے انسان کو انسان سے بیگانہ کر دیا ہے۔انسان کامل کا تصور جسے علاحدہ موضوع بحث بنایا گیا ہے اقبال کے مثالی معاشرے کے مفروضہ مثالی انسان کے مفہوم اور اس کے فلاح انسانیت پر مبنی آفاقی نصب العین کو زیادہ واضح شکل میں اجاگر کرتا ہے۔اقبال انسان کامل کے تصور کو صالح افراد کے مثالی عملی نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں اور معاشرتی تعمیر وتہذیب کے وجود وفروغ اور انسانی فلاح وبہبود کو اس سے ناگزیر طور پر وابستہ سمجھتے ہیں۔

یہاں اس سلسلے میں یہ واضح کرنا شاید غلط نہ ہوگا کہ طیب صاحب اقبال شناسی کے باب میں دوسری ممتاز شخصیات کے ساتھ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی سے خصوصیت کے ساتھ متاثر اور ان کے گرویدہ رہے۔ندوہ کی طالب علمی ہی کے زمانے میں ان کی مولانا سے قربت اور

آشنائی بڑھی اور ایک قد آور ادبی شخصیت اور اقبال شناس کی حیثیت سے انھیں ان کے اعلیٰ مقام و مرتبے کا احساس ہوا جس کے باعث انھوں نے اپنی اس کتاب میں مولانا کے دو بے حد اہم اور کلیدی نوعیت کے مضامین 'انسان کامل اقبال کی نگاہ میں' اور 'اقبال کی شخصیت کے تخلیقی عناصر، جو ان کے عربی مضامین کے ترجمے ہیں، التزاماً شامل کیے۔ اول الذکر مضمون کا ذکر قبل آچکا ہے لہذا یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ موخر الذکر مضمون 'اقبال کی داخلی شخصیت اور شعری وجدان کے پہلو کی وضاحت پر مبنی ہے جس نے اقبال کے کلام میں حقیقتاً درد و سوز، جوش و ولولہ، تب و تاب اور قوت و توانائی پیدا کی۔ مصنف اقبال کی شاعری کی تخلیق و تعمیر میں مشرقی اور مغربی افکار و علوم کے وسیع تر پس منظر اور اس کے اثرات سے انکار نہیں کرتے مگر وہ اس باب میں ان کے ایمان و یقین کے پہلو اور ان کی شعر گوئی کی وہبی صلاحیت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اسی کو ان کے اصل تخلیقی جوہر سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا واضح خیال ہے کہ شاعر کا ایمان و یقین، قرآن کا مطالعہ، عرفان نفس ہی اس کی شخصیت کے اصل تخلیقی عناصر ہیں جنھوں نے اقبال کو مضبوط عقیدہ اور سلیم فکر عطا کی اور اقبال کو اقبال بنایا۔

اقبال کی تخلیقی کارگزاریاں جیسا کہ سطور بالا میں ان کی شخصیت کے تخلیقی عناصر کے تجزیے سے ظاہر ہے، ان کے واضح فکری مقاصد کے تابع اور ان کے عقیدے اور ایمان سے ہم آہنگ رہی ہیں اور یہ اسی کا فیضان ہے کہ ان کی شاعری ایک منفرد لہجے، تب و تاب اور قوت و توانائی سے متاثر کرتی ہے۔ طیب عثمانی صاحب ان کے نظریۂ شعر و ادب کو واضح طور پر ان کی فکر اور عقیدہ و ایمان کا پرتو قرار دیتے ہیں جس نے ان کی شعری تخلیق کے عمل کو حقیقتاً متحرک رکھا اور اسے ایک نمایاں اساس اور سمت عطا کی۔ طیب عثمانی صاحب اسی تناظر میں اقبال کے افکار و تصورات کو ان کی شاعری کی تفہیم اور قدر شناسی کے عمل میں مقدم رکھتے ہیں اور ان کی متفرق نظموں سے مصورانہ فن کاری، تخیلی پیکر تراشی اور نادر تشبیہات کی مثالیں دے کر ان کی فنی خوبیوں کو استثنائی حیثیت سے نمایاں کرتے ہیں۔ ان کا یہ خیال درست ہے کہ اقبال کی شاعرانہ

انفرادیت کا اصل سبب یہ ہے کہ ان کے اشعار میں فکر و فن باہم آمیز ہو کر جذبہ بن گئے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی شاعری غیر معمولی تاثیر کی حامل ہوگئی ہے۔ ان کی غزلیں بھی ان کی شاعری کا بڑا اہم سرمایہ ہیں۔ انھوں نے اردو غزل میں کچھ ایسے جان دار عناصر داخل کیے جس کی وجہ سے اردو غزل کی معنوی فضا یکسر بدل گئی اور اس میں جدت، تازگی حسن ادا اور حسن تاثیر کی وہ صفات پیدا ہوئیں جو ان سے پہلے اردو غزل میں نہیں ملتیں۔ مصنف نے اقبال کی غزلوں سے رمز و ایما، فکر انگیز جوش بیان اور صحت مند قوت و توانائی کی مثالیں دے کر ان کی غزلوں کی ادبی و فنی اہمیت کو بہ خوبی اجاگر کر دیا ہے۔ اقبال کے نظریۂ شعر و ادب کے ذیل میں مذکورہ خصوصیات کی نشان دہی کے ساتھ یہ نکتہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ اقبال کا فن دلبری یا قاہری کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ مصنف اسے بدیہی طور پر ان کی شاعری کا ایک امتیازی نشان قرار دیتے ہیں اور اس کی ان الفاظ میں توجیہہ کرتے ہیں۔

> 'اقبال کے شعر و ادب اور آرٹ اور زندگی کے تصور میں قوت و توانائی کی روح کارفرما ہے۔ ان کی شعری تخلیق کا سب سے بڑا محرک ان کا تصور جلال و جمال ہے۔ قوت ہی میں اسے حسن دکھائی دیتا ہے۔ اور جلال ہی میں جمال کی عکاسی نظر آتی ہے۔''

اقبال کی شاعری کا یہ پہلو ان کی فکری بلندی اور بلوغت کے ساتھ ان کی فن کارانہ عجوبہ کاری کی ایک نادر مثال پیش کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جہاں تک میرا اپنا خیال ہے اقبال کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کم نگہی کا شکار رہا ہے۔ حالاں کہ اقبال نے بہ قول احمد ندیم قاسمی فن شعر کے جمالیاتی مطالعے سے کبھی صرف نظر نہیں کیا اور ان کے صناعانہ کمال کا امتیاز اس لحاظ سے بالکل واضح ہے جس پر مزید خیال آرائی کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اقبال کی شعر گوئی کا یہ بین امتیاز ہے کہ وہ معنی کی صحت اظہار و بیان کے ساتھ ادائیگی پر خصوصی توجہ دیتے ہیں یہاں تک کہ قافیے کے استعمال کو بھی شعری اظہار کا لازمی جزو سمجھتے ہیں اور ردیف کی التزاماً پابندی سے بھی احتراز نہیں

کرتے جب کہ مولانا حالی جنھوں نے اردو شعریات کی اولاً تشکیل کی، قافیہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ سید عابد علی عابد مصنف 'اصول انتقاد ادبیات' اقبال کی شعر گوئی کے باب میں اس نکتے کی نشان دہی ضروری سمجھتے ہیں کہ اقبال نے قافیے کے ساتھ صنائع لفظی و معنوی کے استعمال میں بھی گہری ہنر مندی اور چابک دستی کا مظاہرہ کیا ہے، اس طرح کہ پرکھنے والے کی توجہ مطالب اور مفہوم کی طرف سے ہٹتی نہیں اور یہ ان کے اسی فنی رویے کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اردو کی کلاسیکی شعری روایت کی سختی سے پابندی کرتے ہوئے اصولاً پابند نظم کے پیرائے ہی کو اپنے شعری اظہار کی اساس بنایا اور اسے پوری فنی پختگی اور مہارت کے ساتھ برتا۔ یہ بڑی بات ہے کہ ان کی متنوع فنی نادرہ کاریاں باوجودے کہ ان پر ادبیات عالم کے اسالیب کے مطالعے کا بھی ایک حد تک اثر رہا ہے جیسا کہ انھوں نے آل احمد سرور کے نام اپنے ایک خط میں جس کا قبل حوالہ دیا جا چکا اشارہ کیا ہے، اسی روایتی فارم میں وجود میں آئیں جس میں اظہار و بیان کے اعتبار سے کسی طرح عجز و نارسائی کا احساس نہیں ہوتا۔

یہاں یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ مصنف کا مقصد اس تصنیف کے ذریعہ تمام تر اقبال کی شاعری کے فکری پہلو اور اس کی جزئیات سے روشناس کرنا رہا ہے جو اس کا اساسی تخلیقی محرک اور سرچشمہ رہا ہے جس سے صرف نظر کر کے اس کے حقیقی مفہوم و معنیٰ اور اس کی گہرائیوں تک رسائی حاصل نہیں کی جا سکتی اور اس کے تشفی بخش مطالعے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب کا اختتامی حصہ جو دو الگ ابواب پر مشتمل ہے اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس کے تحت اولاً پروفیسر عبد المغنی کی کوئی چھے سو صفحات پر محیط خاصی ضخیم تصنیف 'اقبال اور عالمی ادب' کا بسیط فاضلانہ جائزہ لیا گیا جس میں اقبال کی شاعری کے زیادہ بلیغ، جامع اور پر مغز فکری و فنی تجزیے کے ذریعے ان کے اعلیٰ شاعرانہ مقام اور مرتبے کو بین طور پر نمایاں کیا گیا ہے اور انھیں دنیائے ادب کی چند مسلم الثبوت عظیم اور بلند پایہ شعرا کی صف میں امتیازی حیثیت سے جگہ دی گئی ہے۔ آخری باب میں 'اقبال کی چند منتخب نظمیں' کے زیر عنوان متعلقہ نظموں 'مسجد قرطبہ، ذوق و شوق،

جبریل و ابلیس اور خضر راہ وغیرہ کے مفہوم و مطالب اور فنی امتیاز کو بہ درجۂ احسن واضح کیا گیا ہے جس سے اس کتاب کی فکری و فنی معنویت اور قدر و قیمت میں قرار واقعی اضافہ ہوا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اب یہ کتاب اپنی موجودہ صورت میں اپنے موضوع پر ایک منفرد اور معتبر کتاب کی حیثیت سے اقبالیات کے سرمایے میں گراں قدر اضافہ تصور کی جائے گی۔ پروفیسر عبد المغنی کی مذکورہ تصنیف جیسا کہ کتاب کے شروع میں عرض ناشر کے تحت مذکور ہے اس لحاظ سے استثنائی اہمیت کی حامل قرار دی جائے گی کہ اس میں پہلی بار عالمی ادب کے بنیادی تصورات کا تنقیدی جائزہ لے کر ان کے پس منظر میں اصولی و فنی طور پر اقبال کے اعلیٰ مقام کی نشان دہی کی گئی ہے جس نے اس تصنیف کو نہ صرف اقبالیات بلکہ عام ادبیات کے تنقیدی مطالعے میں ایک بالکل منفرد اور امتیازی حیثیت عطا کر دی ہے۔ عبد المغنی کی اس کتاب کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ یہ اردو کے ممتاز ترین نقاد کلیم الدین احمد کی تصنیف 'اقبال - ایک مطالعہ' کے جواب میں لکھی گئی۔ یہ اور بات ہے کہ عبد المغنی اس سے درگزر کرتے ہوئے اقبال کے مطالعے میں اپنے منفرد رویے اور مخصوص نقطۂ نظر کی وجہ سے اس کتاب کو اقبال کے مرتبہ و مقام پر ایک مستقل بحث قرار دیتے ہیں جو ان کے خیال میں بہ یک وقت ادب کے عالمی تصورات اور کلام اقبال کے مضمرات کا احاطہ کرتی ہے۔

طیب عثمانی صاحب عبد المغنی کے اس دعوے سے اتفاق کرتے ہیں اور ایک اقبال شناس کی حیثیت سے مطالعۂ اقبال کے باب میں ان کے تخصص، گہری بصیرت اور ماہرانہ صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی مذکورہ تصنیف کو فکری و فنی اعتبار سے اردو تنقید میں ایک نئے اضافے سے تعبیر کرتے ہیں۔ طیب صاحب کلیم صاحب کی تنقید نگاری پر اس بنا پر معترض ہیں کہ وہ انگریزی اور مغربی ادبیات سے اثر پذیری اور مرعوبیت کی وجہ سے اردو شعرا و ادبا کو پرکھتے ہوئے مشرقی ادبیات اور معیاروں کو فراموش کر جاتے ہیں اور انھیں ان کا صحیح اور جائز مقام نہیں دیتے۔ اردو کے برگزیدہ نقاد آل احمد سرور بھی اس سلسلے میں کلیم صاحب سے اصولی بنیاد پر

اختلاف کرتے ہیں اور ان کے اس رویے کو درست تسلیم نہیں کرتے کہ مشرقی معیاروں سے صرف نظر کر کے صرف مغربی معیاروں کی بنیاد پر فیصلے کیے جائیں جسے اطمینان بخش نہیں کہا جا سکتا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کلیم صاحب اقبال کے مطالعے میں مشرقی ادبی معیاروں سے روگردانی اور اپنے مفروضہ آفاقی معیاروں کی تحدید کی وجہ سے عالمی ادب میں ان کے حقیقی مقام کے اعتراف میں صریحاً ناکام رہے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ کلیم صاحب اپنے استاد مشہور انگریزی نقاد اف آر لیوس کے اس مقولے پر کاربند رہے ہیں کہ شاعر کی پہچان درحقیقت اس کی شاعری کی وجہ سے ہے نہ کہ اس کے فکر و فلسفے کی وجہ سے جسے اس کے فنی مطالعے کی اساس نہیں بنایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اقبال کے فکر و فلسفے اور خیالات سے ہٹ کر صرف اس کے جزوی فنی جائزے تک اپنے آپ کو محدود رکھا اور ان کے واقعی مقام و مرتبے تک نہیں پہنچ سکے۔ عبدالمغنی ان کے اس نظریے کو کلیتاً رد کرتے ہیں اور شعری تخلیق کے عمل کو فکری اور فنی دونوں پہلوؤں کے مرکب کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ان کا واضح خیال ہے کہ جس چیز کو ادب عالیہ (Classics) کہا جاتا ہے وہ اکثر و بیشتر کسی نہ کسی فلسفے، پیغام اور خیالات پر مبنی ہوتا ہے اور بیش تر شاہکار تخلیقات وہی ہیں جو مذہبیات سے جذبہ حاصل کر کے تصنیف کی گئی ہیں اور اس کا ماحصل کچھ اعلیٰ اخلاقیات ہی ہیں۔ یہ صورت دانتے، گیٹے اور ملٹن سب ہی پر صادق آتی ہے۔ وہ کلیم الدین احمد سے صریحاً اختلاف کرتے ہوئے اقبال کی طویل تمثیلی نظم 'جاوید نامہ' کو دانتے کی 'ڈیوائن کامیڈی' اور ان کی دوسری نظم 'ابلیس کی مجلس شوریٰ' کو ملٹن کی تمثیلی نظم 'پیراڈائز لوسٹ' میں شیطان کی مجلس شوریٰ کے مقابلے میں رکھ کر ان نظموں کا دو سو صفحات پر محیط مفصل تجزیہ کرتے ہیں اور ان میں شعری صداقت اور حسن کے پہلو کو نمایاں کر کے انھیں شعریت کے اعتبار سے زیادہ بہتر قرار دیتے ہیں۔ عبدالمغنی اردو کے ان چند قابل ذکر ناقدین میں ہیں جو واضح دلائل اور شواہد کی بنا پر اقبال کو دنیا کے عظیم شعرا میں امتیازی حیثیت سے شمار کرتے ہیں اور ان کے نسبتاً بلند تر قد و قامت کی بنا پر انھیں دانتے اور گیٹے جیسے دیوزادوں کے دوش بہ دوش رکھ کر عالمی ادب میں ان کی شاعرانہ

فضیلت اور برتری کا واضح لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ عالمی ادب میں اقبال کے مقام و مرتبہ کے تعین پر اس سے قبل سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی تھی اور نہ اس موضوع پر کوئی ایسی منضبط، وقیع اور مدلل کاوش منظر عام پر آئی تھی جو واقعی لائق اعتنا ہو۔ گو عزیز احمد اور آل احمد سرور اپنے مطالعات میں اقبال کے تفکر کے پھیلاؤ اور ان کی شخصیت کی عظمت اور بلندی کی طرف ضمناً اشارہ کر چکے تھے۔ عبدالمغنی نے پہلی بار زیادہ مثبت انداز میں اقبال کی شاعری کی آفاقی حیثیت کو واضح فکری اور فنی بنیادوں پر موضوع بحث بنایا اور مشرقی اور مغربی ادبیات کے وسیع تر تناظر میں ایک باضابطہ پیمانہ نقد متعین کر کے اس کے مطالعے کو ایک نئی سمت اور جہت عطا کی۔ وہ ادبی تخلیق میں جسے وہ مواد اور ہیئت کے ایک مرکب کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، موضوع اور اسلوب کے درمیان عضویاتی ارتباط کے پہلو کو خصوصیت کے ساتھ مدنظر رکھتے ہیں اور صرف مواد یا ہیئت کو اس کے مطالعے کی بنیاد بنانا درست نہیں سمجھتے اور اس باب میں خاص کر فارم پر کلیتاً انحصار کرنے کی بہ جائے جو کلیم الدین احمد کے طرز تنقید کا خاصہ ہے اصلاً شعریت ہی کے پہلو کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اقبال کے اشعار شعریت کے کسی بھی معیار کے مطابق اعلیٰ قسم کے اشعار ہیں۔ چناں چہ کلام اقبال کی اس اساسی خصوصیت کی بنا پر وہ انھیں شیکسپیر، دانتے، گیٹے اور ملٹن جیسے عظیم شعرا پر فوقیت دیتے ہیں اور جاوید نامہ، پیام مشرق، ابلیس کی مجلس شوریٰ اور مسجد قرطبہ کو ان کی مثالی تخلیقات میں شمار کرتے ہوئے انھیں عالمی ادب میں اختصاصی طور پر اہم مقام عطا کرتے ہیں اور ان کے مقابل دانتے اور ملٹن کی شاعری کو شعریت کے اعتبار سے کم تر درجے کی چیز سمجھتے ہیں۔ مسجد قرطبہ جسے وہ لازوال فنی حسن اور فکری بصیرت کی بنا پر دنیا کی بہترین نظم تصور کرتے ہیں اس کے مقابلے میں شیلی اور کیٹس کے سارے ODES اور دیگر نظمیں انھیں گرد نظر آتی ہیں۔ عبدالمغنی اقبال کی شاعری کے ان امتیازات کے واضح شعور کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انھوں نے مشرقی اور مغربی تمام ادبیات کی بہترین روایات اور عظیم تجربات کو اپنی منفرد تخلیقات میں ترکیب دے کر

ایک بہتر اور عظیم تر فن کا ثبوت دیا اور ادبی و شعری اظہار و بیان کے امکانات بے حد وسیع کر دیے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اقبال دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں تنہا اور منفرد شاعر ہیں جنھوں نے آفاقی قدروں کو سامنے رکھ کر ایک عالمی شاعری کا نمونہ کمال تخلیق کیا۔ ان کے خیال میں اقبال کی شاعری درحقیقت مشرقی اور مغربی ادبیات کا ایک آفاقی پیمانے پر نقطۂ اتصال بھی ہے اور نقطۂ عروج بھی۔ وہ اپنے اس تصور کو مزید واضح کرتے ہوئے اقبال کی شاعری کو مشرقی ادبیات کی عظیم ترین فنی روایت کی امین اور ورثہ دار سمجھتے ہیں جس کی ترکیب و تشکیل میں عربی، سنسکرت اور فارسی شاعری کے صدیوں کے فنی تجربات شامل رہے ہیں جنھیں انھوں نے اپنے فن کا جزو بنا کر اردو شاعری کو وہ فکری اور فنی قدریں عطا کیں جو بین الاقوامی ادب کا ایک مثالی معیار پیش کرتی ہیں۔ وہ اقبال کو اس لحاظ سے دانتے، شیکسپیئر اور گیٹے جیسے مغربی اساطین ادب پر فائق سمجھتے ہیں جنھیں یورپ کی قدیم کلاسیکی زبانوں یونانی اور لاطینی سے کوئی ایسی زبردست اور زرخیز شعری روایت ورثے میں نہیں ملی جو مغرب میں ان کے پیش رووں کے کارناموں کی توسیع و تجدید کا باعث بنتی۔ عبدالمغنی اپنے اس مفروضے کے تحت جیسا کہ ابھی ذکر کیا جا چکا مشرقی روایات ہی کو اصلاً بین الاقوامی ادب کا مثالی معیار تصور کرتے ہیں اور اردو شعر و ادب کو صرف مغربی اصناف ادب اور ہیئتوں کی بنیاد پر پرکھنا قرین انصاف نہیں سمجھتے، اس لیے بھی کہ ان کے خیال میں ادب کی ہیئتیں ایک زبان کے ایک خاص سماج میں پروان چڑھنے کی وجہ سے مخصوص تہذیبی اور معاشرتی اقدار کے مطابق تشکیل پاتی ہیں۔ لہٰذا اس صورت میں کسی ادب کی ہیئت کو الگ سے لے کر کسی دوسرے ادب کی ہیئت سے اس کا موازنہ درست نہیں ہو سکتا۔ ان کا یہ خیال بھی قابل غور ہے کہ اہل مغرب کی ادبی نوآبادیت اور سامراجیت بھی مشرقی ادبیات کے آفاقی نظام کی تعیین میں حائل رہی (اگرچہ وہ اسے ایک سیاسی اور سراسر غیر ادبی تصور سمجھتے ہیں) اور مشرقی ادبیات کو 'ناقص محض' سمجھ کر اس کی تشکیل نو تمام تر مغربی ادبیات کے معیار پر کی گئی۔

عبدالمغنی نے اپنے ان تصورات کے ذریعہ اصولی بنیاد پر کلیم الدین احمد کے نظریۂ تنقید

کو منہدم کرنے کی کوشش کی ہے جو عمومی طور پر اردو شعر و ادب کے معیار و اقدار خاص کر عالمی ادب میں اقبال کے اعلیٰ مقام و مرتبے کی نفی پر منتج ہوتی ہے۔ میں مولانا طیب عثمانی کا اسے بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں کہ انھوں نے ایک جینوئن (genuine) اقبال شناس اور بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے عالمی ادب میں اقبال کے مقام و مرتبے کی تعیین کے موضوع پر عبدالمغنی کی اس بزرگ کاوش کا گہری علمی سنجیدگی اور فکری و فنی بصیرت کے ساتھ صاف، شستہ اور معروضی انداز میں جائزہ لے کر اس کی حقیقی اہمیت اور قدر و قیمت سے اولاً روشناس کیا جس سے اقبال کی شاعری کی آفاقی معیار پر پہچان اور پرکھ کے رجحان کو تقویت ملی۔ طیب صاحب کا یہ عالمانہ تبصرہ عبدالمغنی صاحب کی مذکورہ تصنیف کا لازمی جزو بن چکا ہے اور بجا طور پر اس کا تکملہ تصور کیا جائے گا۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ طیب صاحب اقبال کے مطالعے میں اپنے صحت مند اور منفرد فکری انداز اور رویے کی وجہ سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں اور ان کی معروف اور معتبر تصنیف 'اقبال- شخصیت اور پیام' تفہیم اقبال کے باب میں اپنی مثال نہیں رکھتی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے دقیق، گہرے اور حقیقت پسندانہ مطالعے نے انھیں برصغیر کے اقبال شناسوں میں ایک اہم مقام عطا کر دیا ہے اور وہ اپنے اس وقیع کارنامے کی بہ دولت جس کا امتیاز اور اہمیت واضح ہے مسلمہ طور پر ممتاز ماہرین اقبالیات میں شمار کیے جائیں گے۔

ooo

طیب عثمانی کا ادبی وتہذیبی مزاج

□ ڈاکٹر سید عبدالباری (سلطان پور، یوپی)

''میرے ادبی اور تہذیبی مزاج کے بنانے، سنوارنے اور پروان چڑھانے میں جہاں میری خاندانی دینی روایات، دبستان شبلی سے ذہنی وادبی وابستگی اور عالمی واسلامی ادب وتحریک سے فکری ہم آہنگی کو دخل ہے وہیں میری زندگی ادب وتہذیب، دین و مذہب، سیاست و اجتماعیت کا ایسا مرکب ہے جو باہم اس طرح ہم آمیز اور رچے بسے ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جاسکتے۔ اس طرح میری ذات کی تعمیر میں ان تین عناصر ادب، مذہب اور اجتماعیت کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ادب میرا عشق، مذہب میرا عقیدہ اور جمہوری اجتماعیت میرا مزاج ہے۔''

ان تین عناصر، ادبی ذوق، دینی و مذہبی شیفتگی اور تحریکی واجتماعی شغف سے وجود میں آنے والی شخصیت مولانا طیب عثمانی آج زندگی کی آخری سیڑھیوں پر ہیں۔ لیکن انھوں نے گزشتہ پچاس سالوں میں اپنی ادبی، دینی اور تحریکی سرگرمیوں اور کاوشوں سے جن اقدار وافکار کی آبیاری کی ہے وہ آج ملک گیر وآفاق گیر بنتے جارہے ہیں اور نئی صدی کا تابناک مستقبل ان سے وابستہ ہوچکا ہے۔ طیب صاحب یقیناً خوش قسمت ہیں کہ انھوں نے جس صبح کی آرزو میں ایک طویل رات ایک پرخطر سفر میں گزاردی۔ آج وہ سحر ان کے فکر وتخلیق کے ہیکل بلند وبالا کے دروازوں پر دستک دے رہی ہے مگر جہد وکاوش کی اس طویل رات کے اس سخت کوش مسافر کی شخصیت کی تعمیر کب اور کہاں اور کس طرح ہوئی یہ داستان بھی دلچسپ ہے۔

حضرت طیب کے بقول انھیں جو کچھ علم واخلاق ہاتھ آیا وہ ان کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ محمد قاسم فردوسی عثمانی کی ابتدائی تربیت کا فیضان تھا جن کی رہنمائی میں، ان کی وفات ۱۹؍جولائی ۱۹۴۷ء تک طیب صاحب کی تعلیم وتربیت ہوئی۔ ۱۹۵۲ء میں ندوۃ العلماء سے صرف سندِ فضیلت ہی نہیں حاصل کی بلکہ اسی مرکز فکر وتخلیق سے جسے اکبرالہ آبادی نے زبانِ ہوشمند کا خطاب دیا تھا اظہار وابلاغ کا سلیقہ لے کر وطن روانہ ہوئے۔ ندوہ کی تربیت، تحریکی مزاج اور فکر معاش نے صحافت کے کوچہ میں لے جاکر کھڑا کردیا۔ ابتداء اردو روزناموں کے اداریوں اور مضامین سے ہوئی۔ ان کے ادبی ذوق کو مہمیز اس عہد میں لکھنؤ میں اسلامی ادب کے حلقہ سے ملی جس کے سرخیل م۔ نسیم تھے۔ جن کی ادارت میں ۱۹۵۴ء میں ایک نہایت جاذب نظر اور معیاری ادبی ماہنامہ ''نئی نسلیں'' شائع ہوا تھا۔ طیب عثمانی حضرت م۔ نسیم کے ثانی اثنین بن گئے اور نئی نسلیں کے معاون مدیر کی حیثیت سے اس رسالہ کے آغاز سے ۱۹۵۸ء تک وابستہ رہے۔ اس ادبی پلیٹ فارم سے اردو ادب میں عین اشتراکیت کے ڈھلتے ہوئے سورج کے بالمقابل اہل قلم کو اقبالؔ، حالیؔ اور شبلیؔ کی ادبی روایات اور فکری اثاثہ سے وابستہ کرنے کی کامیاب کوششیں ہوئیں۔ 'نئی نسلیں' میں جناب طیب عثمانی ہر دوسرے مہینہ اسلامی ادب کی ماہیت پر روشنی ڈالتے تھے۔ اسی عہد میں حقیر کو اس پختہ مشق قلم کار کی دید وشنید کا موقع ملا، اس لیے کہ شبنم سبحانی کے قلمی نام سے یہ نااہل بھی 'نئی نسلیں' کی ادارت میں شامل تھا اور حصہ آزاد نظم کا معاون مدیر بنایا گیا تھا۔ لکھنؤ میں پابندی سے ادارہ ادب اسلامی کی ادبی نشستیں ہوتی تھیں۔ دوسری طرف ترقی پسندوں کے اکابرین کا مجمع آل احمد سرور اور پروفیسر احتشام حسین کے دولت کدہ پر ہوتا جو یونیورسٹی میں میرے استاد تھے۔ ادارہ ادب اسلامی ان شہر یاروں کے بالمقابل اپنی کج کلاہی میں پیچھے نہ تھا۔ میں ادارہ کا سکریٹری حضرت ابوالمجاہد زاہد صدر اور م۔ نسیم روح رواں تھے۔ شہر کا ایک بڑا حلقہ اس سے وابستہ تھا۔ کئی ادبی کانفرنسیں ہوئیں جن میں مولانا طیب عثمانی شریک ہوئے، پھر ادارہ کی کل ہند مجلس اعلیٰ میں جس کے وہ بھی رکن تھے بار بار شریک ہوئے۔ میں جنرل سکریٹری کی ذمہ داری

کے سبب ان سے برابر رابطہ استوار کیے ہوئے تھا۔ نئی نسلیں کے علاوہ 'دانش' اور 'دوام' میں بھی ان کی تحریریں برابر شائع ہوتی رہیں جن کی ذمہ داریاں بھی مجھ پر تھیں۔

حضرت طیب عثمانی کے ذہنی وفکری ارتقاء میں جو شخصیتیں معاون ہوئیں اور جنھیں وہ اپنے پسندیدہ مصنفین میں شمار کرتے ہیں وہ -- علامہ شبلی نعمانیؒ، سید سلمان ندویؒ، ابوالکلام آزادؒ، عبدالماجد دریابادیؒ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، پروفیسر رشید احمد صدیقیؒ، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور مولانا ابوالحسن علی ندویؒ۔ اپنے نظریہ فن کا تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ان عناصر (ادب، مذہب اور جمہوری اجتماعیت) نے میری ادبی وفکری اندازنظر کی ایسی مستحکم تشکیل کی ہے جو عالمگیر دائمی اخلاقی اصولوں پر قائم ہیں اور جو آج بھی ادب وفن کے ذریعہ تہذیبی اقدار کی نئی تعمیر وتشکیل کرسکتی ہے۔''

ان کا خیال ہے کہ زندگی سے موجودہ انتشار کو دور کرنا اور توازن کو بروئے کار لانا جو اجتماعی زندگی کے لیے درکار ہے، ہر صاحب قلم کی ذمہ داری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس افتادِ طبع کا آدمی گردوپیش کے احوال سے کیوں کر بے نیاز ہوسکتا تھا۔ جناب طیب صاحب ایامِ طالب علمی ہی سے خاندانی روایات ورجحان کے مطابق جمعیۃ علماء اور امارت شرعیہ سے ذہنی طور پر وابستہ ہوئے۔ آزادی سے پہلے قومی تحریکوں میں کانگریس سے دلچسپی لینے لگے۔ پھر پختگیٔ شعور کی منزلوں میں قدم رکھا تو اسلام اور مسلمانوں کے مسائل کو عالمی تناظر میں سمجھنے اور بڑے دائرے میں کام کرنے کا شوق پیدا ہوا اور برصغیر میں تحریک اسلامی ان کی آرزوؤں کا محور بن گئی۔ آزادی کے بعد جس کا ذکر آچکا ہے تحریک ادب اسلامی سے ان کا گہرا تعلق استوار ہوا جو اب تک قائم ہے۔

طیب عثمانی کی پہلی تصنیف ''رسول اکرمؐ' جنوری ۱۹۶۱ء میں دارالکتاب، گیا (بہار) سے منظر عام پر آئی۔ یہ ان کے چار مقالات کا مجموعہ ہے، ان میں 'نبوت محمدیؐ کی ضرورت' اور 'سرور عالم اور انقلابِ عالم' کافی فکر انگیز ہیں۔ زبان دلکش وفصیح ہے۔ ان کی دوسری اہم تصنیف

'حدیث اقبال' بھی ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آئی۔ اس مجموعہ میں اقبالؒ کے فکروفن پر دس مقالات شامل ہیں۔ اس میں طیب صاحب کا تخلیقی وتنقیدی جوہر نکھر کر سامنے آتا ہے۔ اقبالؔ کے وہ پروفیسر عبدالمغنی کی طرح زبردست شیدائی ہیں۔ اسی رشتہ سے فکر اقبال کے ممتاز شارح ڈاکٹر یوسف حسین کے بھی نیاز مند ہیں، جنھوں نے اس کتاب پر مقدمہ لکھا ہے۔ یوسف حسین اعتراف کرتے ہیں کہ طیب عثمانی نے اقبال کے بنیادی تصورات کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ خاص طور پر اس دور کے تہذیبی مسائل پر واضح اشارے ملتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اقبالؒ نے سائنس کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود عہد جدید کے انسان کے اندرونی تضادات اور اخلاقی کھوکھلے پن کو سامنے رکھتے ہوئے روحانی اور مادی زندگی کی مفاہمت کا تصور پیش کیا ہے اور ایک اخلاقی توازن کی ضرورت محسوس کی ہے۔ طیب صاحب نے تقریباً ان تمام تہذیبی مسائل پر جو اقبال کے کلام میں ملتے ہیں روشنی ڈالی ہے۔ ان کی زبان حسب معمول دلکش، شستہ اور رواں ہے۔ اس میں شبلی وابوالکلامؔ کی خوش آہنگی اور کھنک موجود ہے۔ 'حدیث اقبال' ان کے لیے حدیث دلبراں سے کم نہیں، اگرچہ وہ اپنی زبان وقلم کی بے مائیگی اور عجز کا اظہار کرتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ انھوں نے اقبالؔ کا حق ادا کیا ہے۔ اقبالؔ ان کے نزدیک ایسے حدی خواں ہیں جو کاروان ملت کو تیز گام رکھتا ہے، وہ ایسے شاعر ہیں جو پیامبر حیات ہے اور ناقد حیات بھی۔ وہ عروج آدم کے آرزومند بھی ہیں اور زوال آدم سے دل گرفتہ بھی۔ ان کے کلام سے قاری کو ایک نظریہ حیات اور نظام زندگی کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ غرض یہ کتاب فکر اقبال کی اس طرح تشریح کرتی ہے جو انھیں خلیفہ عبدالحکیم اور یوسف حسین خاں کے بعد اقبال کا ایک ممتاز شارح بنادیتی ہے۔ یہ بجا طور پر نئی نسل کے طلبہ اور نوجوانوں میں بے حد مقبول ہوئی اور اقبال کے کلام کی تفہیم میں راہنما ثابت ہوئی۔ طیب صاحب کا یہ دعویٰ درست ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں میر وغالب اور اقبالؔ کے بعد کوئی دوسرا شاعر اس قد وقامت کا نہ پیدا ہوسکا جو اردو شاعری کا چوتھا ستون بن سکے۔ ۱۹۹۶ء میں اس کتاب کے مندرجات میں طیب عثمانی نے کچھ اضافے کیے اور یہ ''اقبال

--شخصیت اور پیام'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی۔

طیب صاحب کی دوسری اہم تصنیف ''افکار و اقدار'' ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی جس میں ان کے بارہ مضامین شامل ہیں۔ اس میں نظریاتی تنقید سے متعلق مضامین ''ادب میں معیار و اقدار کا مسئلہ''، ''ادب میں اخلاقی اقدار کا تصور''، ''فن - مقصد اور کردار'' اور ''ادب و تحریک'' بے حد اہم مسائل پر سپرد قلم کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ ''نئی نسلیں'' کے اداریوں کی شکل میں تحریر کیے گئے تھے۔ عملی تنقید سے متعلق مضامین جگر مراد آبادی، رشید احمد صدیقی، اختر اورینوی، نذیر احمد، سید قطب شہید، ابوالکلام آزاد اور اقبال کی فکر و فن کا مطالعہ بھرپور اور جامع ہیں۔ ان میں کچھ مضامین ماہنامہ ''دوام'' (ٹانڈہ) میں شائع ہوئے تھے جو میری اور جناب مختار احمد مظاہری کی ادارت میں اس صدی کی ساتویں دہائی میں شائع ہوتا تھا اور ادب اسلامی کا ترجمان تھا۔ طیب عثمانی نے بڑی اچھی ادبی بحثیں چھیڑی ہیں اور ان کے بہت سے جملے گرہ میں باندھ لینے کے لائق ہیں۔ لکھتے ہیں:

''روح کی حقیقی آزادی اس کا کسی حقیقی نصب العین سے وابستہ ہونا اور اس کا اظہار کرنا ہے۔''

''انسان کی تخلیقی صلاحیت کے لیے آزادی درکار ہے، خیال کے اظہار کی آزادی، روحانی زندگی کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔''

''ہر تہذیب کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی عقیدہ، اصول اور قدر کارفرما ہوتا ہے۔ تہذیب ان عقائد و اقدار کی حفاظت بھی کرتی ہے اور اظہار بھی۔''

''ادب کا مقصد اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے کہ انسانوں کے لیے لطف و مسرت کا ذریعہ اور بصیرت و برکت کا باعث بنے۔''

''ایک سچا ادیب لفظوں سے محبت اور ان کا احترام کرنا جانتا ہے، لفظ ذہن کی آزادی کی علامت ہے۔''

''حسین ہیئت کا وجود حسین خیالات کے بغیر ممکن نہیں۔''

''غیر صحت مند ادب روح کی زیاں کا موجب ہوسکتا ہے۔''

''فن کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ انسانی تہذیب کو حیوانی عناصر سے پاک کرے اور انسان کو روحانی بلندی تک پہنچائے۔''

''عالمی ادب میں کوئی بھی بڑا ادیب و فنکار ایسا نہیں جس نے ادب کو زندگی کی بہتری کے لیے استعمال نہ کیا ہو۔''

''آج کے فن کاروں کا یہ کام ہے کہ وہ زندگی سے انتشار اور بے یقینی کو دور کریں اور اس توازن کو بروئے کار لائیں جو اجتماعی زندگی کے لیے درکار ہے۔''

اس مجموعے کا غالباً سب سے اہم مضمون جو طیب عثمانی کی فکری بالیدگی اور ان کے پختہ شعور کا ترجمان ہے ''ادب میں اقدار و معیار کا مسئلہ'' ہے۔ یہ مضمون اس لائق ہے کہ ہر نوجوان ادیب اس کو غور و فکر و تخلیق بنائے۔ اس سے طیب صاحب کے نہ صرف مشرقی اور اسلامی ادبیات پر گہری نظر کا پتہ چلتا ہے بلکہ عالمی ادب پر بھی ان کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ترقی پسندوں کے نشریاتی اور جدید ذہن کے ابہام و تشکیک سے آلودہ، نا آسودگی، ہیجان و نامرادی سے آلودہ ادب پر طیب صاحب ایک حساس نقاد کی حیثیت سے اپنے کرب کا اظہار کرتے ہیں:

''یہ دور پر آشوب ہے، وحدت فکر و نظر معدوم، ابہام، تشکیک اور بے یقینی مرض کی حد تک آزار بن گئی ہے۔ زندگی کے انتشار، نا آسودگی، برہمی، بیزاری اور بے یقینی نے ادب میں انتشار و تشکیک کی آبیاری کی ہے۔ کسی صحت مند نظریہ کے نہ ہونے کی وجہ سے آج کے شعراء و ادباء جو جدیدیت کے علم بردار نظر آتے ہیں اپنے ذہنی ویرانے میں بھٹک رہے ہیں۔ دور تک بے کراں تاریکی ہے نہ راہوں کا پتہ، نہ منزل معلوم۔''

(افکار و اقدار، ص:۲۴)

جو لوگ اس صدی کے ساتویں و آٹھویں دہائی کے جدیدیت زدہ ادب سے واقف ہیں

وہ ان تاثرات کو حق بجانب سمجھیں گے۔طیب صاحب کا خیال ہے کہ کسی بھی اعلیٰ ادب کی تخلیق کے لیے تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔اول ادب میں ایک نظریہ کا وجود، دوسرے ادب کا فنی کمال اور تیسرے نظریہ وفن کے امتزاج سے بروئے کار آنے والی تخلیق کا اخلاقی اقدار کے تابع ہونا۔اب سوال یہ ہے کہ کون سا نظریہ عالم انسانیت کے لیے باعث فلاح ہے،اس پر طیب صاحب نے اچھی بحث کی ہے مگر یہ بھی ضروری قرار دیتے ہیں کہ فنکار کی فکر، جذبہ میں تبدیل ہو جائے جس کے بغیر فنی حسن کی شعائیں نہیں پھوٹتی ہیں۔ادب اور اخلاق پر طیب صاحب نے بڑی فکر انگیز بحث کی ہے۔ بلکہ ان کے تنقیدی مباحث کا یہ مرکز خیال ہے جس کی طرف وہ بار بار لوٹتے ہیں۔ان کے نزدیک اخلاقی اقدار سے مراد انسان کے وہ بنیادی روحانی تجربات ہیں جو اسے اعلیٰ صفات سے متصف کرتے ہیں جیسے محبت، انسان دوستی، صداقت، عدالت، شجاعت، ایثار، رواداری وغیرہ۔وہ لکھتے ہیں:

''ادب میں فطری طریقے پر اخلاقی اقدار کے انعکاس کے لیے ادیب وشاعر کی عملی زندگی میں اس کا اظہار ضروری ہے۔اچھا ادب اچھا انسان ہی پیدا کر سکتا ہے۔''

یہ بحث اس صدی کے وسط میں کافی گرما گرمی سے چھڑی ہوئی تھی۔کچھ نام نہاد روشن خیال لوگ ادیب کی ذاتی زندگی کو اس کے ادب سے الگ رکھنے کے قائل تھے،ان کے نزدیک اچھا ادب ایک بے کردار انسان بھی تخلیق کر سکتا ہے۔طیب عثمانی نے اس غلط تصور کو عالمی ادب کے جائزہ کی روشنی میں مضبوط دلائل کی مدد سے رد کر دیا اور بے کرداری کی تائید کرنے والوں کی دلیلوں کے اندرونی تضادات کو نمایاں کیا۔

طیب صاحب نے ادب کی تخلیق کے رشتے کو توحید یعنی وحدت اللہ سے استوار کیا ہے۔یہ وہ آفاق گیر نکتہ ہے جو عصر رواں میں مشکل سے لوگوں کی سمجھ میں آتا ہے۔لکھتے ہیں:

''ہر عظیم ادب کا سوتا کسی نہ کسی عظیم تصور ہی سے پھوٹتا ہے اور حیات وکائنات کا سب سے عظیم تصور خدا کا تصور ہے۔اس لیے تصور خدا کے بغیر اعلیٰ شعر وادب کی تخلیق ممکن نہیں۔یوں بھی کائنات کے تخلیقی عمل پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت درخشاں نظر آئے گی کہ فطرت کے اعلیٰ

حسن اور اس کی تخلیق میں خدا کی قوت تخلیق کار فرما ہے۔اس طرح آرٹ کی اعلیٰ تخلیق میں خواہ وہ شاعری ہو یا مصوری، رقص ہو یا موسیقی، انسان اور خدا دونوں شریک نظر آتے ہیں۔اقبالؔ نے سچ کہا ہے:

سفال آفریدی ایاغ آفریدم''

طیب صاحب جمالیات واخلاقیات کے باہمی ربط سے ایک اہم نکتہ واشگاف کرتے ہیں:

''آرٹ کا سرچشمہ انسان کی جمالیاتی جبلت ہے اور اخلاق کا منبع بھی انسان کی صالح فطرت ہے جو خیر وشر، معروف ومنکر کے درمیان خط امتیاز کھینچتی ہے اور اس کی اصل مذہب ہے۔اس طرح آرٹ اور مذہب دونوں کا بنیادی حقیقی تعلق انسانی ضمیر ووجدان سے ہے اور دونوں انسان کی اسی لازوال جمال پسندانہ جبلت سے فیضیاب ہوتے ہیں، جس سے انسان کا اندروں روشن وتابناک ہے۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ طیب صاحب کے نزدیک ادبی اقدار اور اخلاقی اقدار کا سرچشمہ ایک ہی ہے یعنی فطرت کے جمال اور انسانی شخصیت کے جمال میں انھیں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔اقبال کو بھی مسجد قرطبہ کے جلال وجمال میں مرد خدا کے جلال وجمال کی جھلک نظر آتی ہے۔ان کے نزدیک ادب واخلاق دونوں کا مقصود یہ ہے کہ ہماری زندگی میں پاکیزگی وشادابی آئے۔اس بحث کے ضمن میں طیب صاحب ادب اور جنس کے موضوع پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں۔اس صدی کے بڑے حصہ میں رومان پرست اور کچھ ترقی پسند جنس ورومان کے کوچہ میں ادب کے نام پر کھل کھیلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ایک جمال پرستی کے نام پر دوسرا حقیقت نگاری کے عنوان سے۔اسلام پسند شاعروں اور ادیبوں کی یہ آواز نرا واعظ تصور کی جاتی تھی:

شرم و غیرت ہے آبروئے جمال
اے مرے شاہد پری تمثال

(ماہر القادری)

طیب صاحب نے اس پر بیباکی اور مضبوط دلائل کے ساتھ گفتگو کی اور حقیقت نگاری کو عریانی کی حدتک لے جانے کی مخالفت کی۔انھوں نے قرآن حکیم سے سورہ یوسف کے ایک حصہ کا ترجمہ پیش کیا اور یہ ثابت کیا کہ جنسی واقعات اگر ضروری ہوں تو لذتیت اور عریانی سے محفوظ رکھ کر کس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔انھیں افسوس ہے کہ لوگ اپنی انفرادی جنسی گھٹن، کج روی اور ذہنی بیماری کی وجہ سے جنسی حمام میں کود پڑتے ہیں لیکن اگر بلند مقاصد کی کشش ان کے سامنے ہو تو وہ پستیوں کے بجائے بلندیوں کی طرف جانا زیادہ پسند کریں۔

طیب صاحب فن برائے فن پر، فن برائے زندگی کو فوقیت دیتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے حوالے سے مغرب کے کچھ باشعور مفکرین کے خیالات کو نقل کرتے ہیں۔فن کے لیے فنکارانہ خلوص اور خون جگر کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔اردو کے تعمیر پسند مصنفین کے موقف کی بڑی خوش اسلوبی سے ترجمانی کی گئی ہے۔

طیب صاحب نے ادب میں پروپیگنڈہ کی مخالفت کی ہے اور اس صدی کی چھٹی دہائی میں ترقی پسندوں کے اس رجحان پر اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ کہیں ادب میں نظریہ کی یکسر مخالفت کرنے والے اہل قلم نہ غالب آجائیں۔ان کا یہ اندیشہ ٹھیک ثابت ہوا اور اردو شعروادب میں بیس سال تک نوجوان اہل قلم میں یہ وبا پھیلتی رہی کہ ہر طرح کی نظریاتی وابستگی شعروادب کے لیے زہر قاتل ہے اور ادیب کو ہر طرح کے ابلاغ کے تقاضوں اور ماحول کے مطالبات سے بے نیاز ہوکر صرف اپنے لیے لکھنا چاہیے۔طیب صاحب ایک نعرہ بازی اور پروپیگنڈہ کا آلۂ کار ادب کو ماننے والوں کی مذمت کرتے ہیں، دوسری جانب زبان و بیان کی بے راہ روی میں مبتلا ہونے والے اور قدیم ادبی سرمایہ پر حقارت کی نگاہ ڈالنے والوں کو خبردار کرتے ہیں کہ اس سے ادب میں انتشار اور نراج کی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے۔

عملی تنقید میں حضرت طیب عثمانی کی بلندیٔ ذوق اور قدرت کلام کا اظہار ان کے مضامین سے ہوتا ہے۔اچھے اشعار کے انتخاب کا ان کو ملکہ حاصل ہے۔حضرت جگر کی شاعرانہ

عظمت پر ان کے خیالات سے ہمارے نوآموز اہل قلم کی تربیت ہوسکتی ہے۔رشید احمد صدیقی سے طیب صاحب کو خاص لگاؤ ہے، جنھیں وہ زندۂ جاوید نثر نگار قرار دیتے ہیں، جنھیں قدرت نے دل دردمند، فکر ارجمند اور زبان ہوشمند سے نوازا ہے۔ان کی ہمہ جہت شخصیت کو وہ کئی پہلوؤں سے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ان کی تنقید، شخصیت نگاری، سراپا نگاری، مذہب و اخلاق پر گفتگو اور سب سے بڑھ کر ان کے بلند ذوق مزاج کا جائزہ لیتے ہوئے طیب صاحب ان کے دلکش اسلوب کا سرچشمہ ان کی دلکش شخصیت کو قرار دیتے ہیں جس میں زندگی، صالحیت، تہذیب کی نفاست، اخلاق کی پاکیزگی، فکر کی بالیدگی اور یقین کی تازگی موجود ہے۔

اپنے ایک اور مقالے میں طیب صاحب سید قطب شہید کے ادبی و علمی کارناموں کا جائزہ لیتے ہیں۔مصر کا یہ مظلوم شہید نہ صرف اسلام کا ایک دلیر و جانباز و جرأت مند خادم تھا بلکہ اس نے اپنے قلم سے اسلامی فکر و تخلیق کے شعبہ میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔اس میں شک نہیں کہ وہ بیسویں صدی میں اقبالؔ و مودودیؒ کی طرح عالم اسلام میں اسلامی ادب کے ممتاز ترین خادموں میں سے تھے، جنھوں نے اس عہد میں فکر اسلامی کے فروغ میں ناقابل فراموش کارنامے انجام دیے۔مصر کے ظالم حکمراں کے ہاتھوں انھیں حوالہ دار ورسن کرنے اور سید قطب کے جام شہادت نوش کرنے پر طیب عثمانی کا تاثر ملاحظہ ہو:

> ’’سید قطب کا جسد خاکی آج موجود نہیں مگر ان کا ادب زندہ ہے، ان کا فن زندہ ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ان کا حیات آفریں پیغام زندہ ہے۔سید قطب مر نہیں سکتے، وہ زندہ جاوید رہیں گے۔انھوں نے اپنے ادب و فن، فکر و نظر، حرکت و عمل سے زندگی کی جو شاہراہ بنائی ہے اس پر ان کے قدموں کے نشانات چمک رہے ہیں۔‘‘

طیب عثمانی اس عہد کی شخصیتوں میں مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی بے حد متاثر ہیں، ان کے فضل و کمال کی رنگارنگی، مطالعہ کی وسعت، عالمانہ رکھ رکھاؤ، پاکیزہ جمالیاتی ذوق طیب صاحب کو محوِ حیرت بنا دیتا ہے۔شعروادب، حکمت و فلسفہ، تصوف و اخلاق، رشد و ہدایت، دعوت و

عزیمت، مذہبی اصلاح وانقلاب ہر میدان میں وہ لاثانی قرار پاتے ہیں۔اس قدر والہانہ انداز سے مولانا کو کم لوگوں نے خراج عقیدت پیش کیا ہوگا۔رقم طراز ہیں:

''اس مرد مجاہد کی زندگی میں خدا کی فیاضی کے عجیب جلوے نظر آتے ہیں۔ ظاہری جلال و جمال ایسا تھا کہ مغل دور شہنشاہی بھی شرمندہ ہے۔دماغ کی تابانی ایسی کہ جس سے فکر وعمل کی نہ جانے کتنی راہیں روشن ہوتی تھیں، دل کی فراخی کا یہ عالم کہ اس میں دشمنوں کے لیے بھی جگہ تھی۔مذہب میں نظر ایسی عمیق کہ اس کے آئینہ میں دین و دنیا کی واضح تصویر نظر آتی ہے اور عصر حاضر اور فکر جدید سے ایسی واقفیت کہ مغرب کے عالم بھی اس کا لوہا مانتے تھے۔''

طیب صاحب نے 'الہلال' کے صفحات سے متعدد اقتباسات پیش کیے ہیں،اس سے ان کے مطالعہ کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں جب مغرب کے سامنے مشرق سربسجود تھا،مولانا ابوالکلام آزاد کے اس تیور پر طیب صاحب آفریں کہتے ہیں:

''ہمارے تعلیم یافتہ دوستوں کا کچھ عجب حال ہے۔ان کے پاؤں کو دیکھیے تو یورپ کی نافہمانہ اور کورانہ تقلید وعبودیت فکر کی زنجیریں لپٹی نظر آئیں گی،مگر چہرے کی طرف نظر اٹھایئے تو زبان کو ادعا و اجتہاد سے فرصت نہیں۔اس سے بڑھ کر دنیا کے جمع اضداد کا اور کون تماشا ہوسکتا ہے کہ ایک شخص آپ کے سامنے آئے اور عین اس وقت جب کہ اس کے پاؤں میں تقلید واستبعاد کی زنجیریں پازیب کی طرح صدا دے رہی ہوں،اجتہاد و فکر و حریت رائے پر بے تکان لکچر دینا شروع کردے۔''

اس طرح کے متعدد اقتباسات سے طیب عثمانی نے مولانا کی فکری عظمت اور خود اعتمادی کے ثبوت پیش کیے ہیں۔طیب صاحب نے مولانا کی دعوت کے دو پہلو قرار دیے ہیں۔اول یہ کہ مسلمانوں کو اسلام پر صحیح معنوں میں عمل پیرا بنایا جائے۔اس غرض سے مولانا نے حزب اللہ کی بنیاد ڈالی تھی اور امیر الہند کے تقرر کے آرزومند تھے لیکن یہ منصوبہ عوامی تحریک کی شکل

اختیار نہ کرسکا۔ان کی دعوت کا دوسرا حصہ طیب صاحب کے نزدیک ہندوستان کی سیاسی آزادی تھی جس کے لیے مسلمانوں کو سرگرم عمل بنانا چاہتے تھے۔انھوں نے گاندھی جی کے حوالے سے اور مولانا کے خطبہ رام گڑھ کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ آخر تک اسلام پر قائم رہتے ہوئے ملک کی آزادی کے نصب العین کے لیے کس قدر مخلص تھے۔مگر طیب صاحب کی یہ بات قابل غور ہے اور اس میں کچھ غلوئے عقیدت کی جھلک نظر آتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''مولانا آزاد کی تحریک دعوت وعزیمت کا غلغلہ ۱۹۱۲ء میں 'الہلال' سے شروع ہوا تھا وہ آخر تک جاری رہا اور مولانا کے مسلک وموقف میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔وہ برابر ایک ہی بات کہتے تھے کہ اچھے مسلمان بنو اور اچھے ہندوستانی رہو۔دنیا کی ساری عظمتیں تمھارے قدموں پر ہوں گی۔''

سوال یہ ہے کہ 'الہلال' کے عہد میں دعوت وعزیمت اور اقامت دین کا جو نصب العین مولانا کے سامنے تھا وہ کیوں برقرار نہ رہا اور آگے چل کر اس مہتم بالشان ادھورے کام کو پورا کرنے کے لیے دیگر زعماء وقائدین ومفکرین ملت کو از سرنو کاوش کرنی پڑی۔حقیقت یہ ہے کہ مولانا ۱۹۲۱ء کے بعد اس راہ پر گامزن نہ رہ سکے اور خود کانگریس کی قیادت کے ساتھ چل پڑے اور پھر اتنی دور نکل گئے کہ غریب اعلائے کلمۃ اللہ کا مشن بہت پیچھے چھوٹ گیا۔طیب صاحب خود اعتراف کرتے ہیں:

''الہلال کے بعد حقیقت یہ ہے کہ وہ زبان بند ہوگئی، وہ قلم ٹوٹ گیا لیکن اس کی روشن مثال باقی ہے اور وہ مقصد باقی ہے۔''

سوال یہ ہے کہ وہ مقصد اور مثال تو چودہ سو سال سے باقی ہے۔اصل مسئلہ اسے متحرک شکل عطا کرنے کا ہے۔طیب صاحب خواجہ الطاف حسین حالی اور کارلائل کی طرح نقاد کی ذمہ داریاں فراموش کرکے ہیرو ورشپ کا منصب قبول کرلیتے ہیں۔

طیب عثمانی صاحب کی تیسری اہم تصنیف ''حیات دوام'' ہے جو ان کے والد محترم

مولانا شاہ محمد قاسم فردوسیؒ کی سوانح حیات اور تعلیمات پر مشتمل ہے۔ یہ سوانح اتنی دلچسپ اور پرکشش ہے کہ پڑھئے تو ناول کا لطف حاصل ہوتا ہے اور طیب صاحب کے بیانیہ کی داد دینی پڑتی ہے۔ اسلام کی سیدھی و سچی تعلیمات انسانی زندگی کو کس سانچہ میں ڈھال دیتی ہے اس کا دلکش مرقع سامنے آتا ہے۔ اس کتاب میں تصوف پر فکر انگیز گفتگو ہے اور حق پرست صوفیاء کس طرح معاشرہ کی اصلاح فرماتے تھے اس کی تفصیلات سامنے آتی ہیں۔ طیب صاحب نے یہ کتاب اپنے والد کے فضائل و مراتب پر مرتب کی ہے مگر کہیں مبالغہ کی جھلک نظر نہیں آتی، اگرچہ مبالغہ آرائی بھی کرتے تو اس کی ان کو اجازت تھی کہ شریعت بیٹوں کو باپ کے سلسلہ میں اس کی اجازت دیتی ہے، لیکن انھوں نے حقیقت پسندی کی روش اختیار کی ہے، اس طرح ایک دل نواز مرقع اسلام کی عظمتِ کردار کا سامنے آگیا ہے۔ میں ان سطروں کو دیکھتا ہوں تو خود اپنے نانا سید راحت حسینؒ کو بار بار یاد کرتا ہوں جن کی ہو بہو تصویر اس آئینہ میں نظر آتی ہے اور بچپن کی یادیں تازہ ہوتی ہیں۔ وہی معمولی عصائے پیری وہی گاڑھے کا کپڑا وہی نہایت سادہ غذا وہی خدمت خلق کا بے پناہ جذبہ اور اسباب کی دنیا سے بے نیازی، لطف یہ ہے کہ وہ بھی بہار ہی کے ایک علاقہ چمپارن کے پیر اور مرجع خلائق تھے اور شریعت سے ایک انچ ادھر ادھر ہونے کی کسی کو اجازت نہیں دیتے تھے۔ طیب صاحب لکھتے ہیں:

''مسلمان بنکر کے ہاتھ کا بنا ہوا کپڑا استعمال فرماتے...... یہ سب کپڑے موٹیا کے ہوتے، سال میں ایک مرتبہ پورا تھان خرید لیتے اور صرف تین جوڑا بنواتے، ایک جوڑا پہنتے، ایک دھلنے کو دیتے اور ایک دھلا ہوا اپنے پاس گٹھری میں رکھتے۔ آپ نے کبھی اپنے لیے بکس، سوٹ کیس یا بیگ وغیرہ نہیں رکھا۔ سفر و حضر میں ہر جگہ رومال یا تہبند کی ایک گٹھری ہوتی جس میں دھلے ہوئے ایک یا دو جوڑے کپڑے ہوتے، کچھ ضروری کاغذات اور کتابیں، پیتل کی دوات جس میں سیاہ روشنائی کی سوف ہوتی تاکہ روشنائی گرے نہیں، نب کا قلم ہوتا، اس گٹھری کی کل کائنات یہی ہوتی۔ دیہاتی

گڈریئے کے ہاتھ کی بنی ہوئی دو کالی کمبل اوڑھنا بچھونا ہوتا۔ کپڑے کی وہی گٹھری تکیہ کا کام کرتی۔ گرمی میں موٹیا کی ایک چادر اور جاڑوں میں دوہرے سبز رنگ کے موٹیا کا انگرکھا، رہائش اور لباس کی یہ شان اور فقر و دُرویش کا یہ شاہانہ انداز کم دیکھنے کو ملتا ہے۔''

کھانے کی تفصیل سنئے تو اور حیرت ہوگی۔ مشائخ کی مسند پر بیٹھنے والے لذائذ دنیا سے اس طرح بے نیاز ہوتے تھے:

''سفر میں جب ہوتے تو ہمیشہ اپنے کسی غریب مرید کے یہاں ٹھہرتے اور اس کے ساتھ سوکھی غذا کھانا پسند کرتے، مالدار اشخاص اور امراء کے یہاں جانے اور ٹھہرنے سے پرہیز کرتے۔''

اس کتاب کا قاری اس تصویر کا موازنہ جدید مشائخ سے کرتا ہے تو مجسم سوال بن جاتا ہے کہ اُف یہ بلندی اف یہ پستی۔ طیب عثمانی نے حضرت فردوسیؒ کے حلم و عفو، حسن سلوک، بندگانِ خدا کے ساتھ نیکی و غم خواری، حسن اخلاق، جذبہ خدمت، تواضع و بے نفسی اور اہل دین کے احترام کی ایسی تفصیلات اس مزے سے لکھی ہیں کہ پڑھئے تو حالیؔ کی ''یادگار غالبؔ'' کا لطف آتا ہے۔ انھوں نے ایک سوانح نگار کی ساری ذمہ داریاں بحسن و خوبی نبھائی ہیں۔ باب دوم میں بیعت و طریقت، سلوک و تصوف پر پیچیدہ مضامین کو نہایت سہل بنا دیا گیا ہے۔ تصوف دور آخر میں طرح طرح کی آمیزشوں کے سبب ایک معمہ بن گیا ہے جس کی تائید و تردید میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر اس کی اصل و حقیقت فقط اس قدر ہے جو طیب صاحب نے مولانا عبدالماجد دریابادی اور خود مولانا شاہ فردوسیؒ کے حوالے سے بیان کی ہے:

''اتباع کتاب و سنت میں انتہائی سعی کی جائے، اسوۂ رسول و صحابہ کو دلیل راہ رکھا جائے اور اوامر و نواہی کی تعمیل کی جائے، طاعات و عبادات کو مقصود حیات سمجھا جائے، قلب کو محبت اور تعلق ما سوا سے الگ کیا جائے، نفس کو خشیتِ الٰہی سے مغلوب

کیا جائے اور صفائیِ معاملات وتزکیۂ باطن میں جہد وسعی کی جائے۔'' (عبدالماجد دریابادیؒ)

''تصوف سراپا عمل ہے، تصوف اتباع نبوی ﷺ کا نام ہے، تصوف مادی نعمتوں کا ترک کرنا نہیں سکھاتا بلکہ ان کا صحیح استعمال بتاتا ہے، تصوف نہ ہندوانہ جوگ ہے نہ نصرانی رہبانیت، تصوف ماسوا اللہ سے دلی تعلق کو قطع کر کے خدا کی طرف یکسو کر دینے کا نام ہے۔'' (محمد قاسم فردوسیؒ)

باب چہارم میں حضرت طیب عثمانی نے مولانا فردوسیؒ کی زندگی کے ایک اور تابناک پہلو یعنی ان کے فہم دین، عصری وسیاسی شعور اور ہم عصر ملی واسلامی تحریکات سے تعلق پر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا فردوسیؒ سیاست کی کیا دلنشیں اور خالص اسلامی تشریح کرتے ہیں:

''مجھ گمنام سے آپ سیاست کیا پوچھتے ہیں، فقیر کے نزدیک تو سیاست غیر حق کی نفی اور اثبات حق کا نام ہے۔ سیاست حقہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی فطرت کے مطابق اس کے مادی واخلاقی عروج کے لیے آسمان وزمین اور اس کے مابین جتنی چیزیں ہیں ان سب کی نگرانی کی جائے اور صحیح استعمال پر بنی نوع انسان کو مجبور کیا جائے۔ یہ خدمت اس وقت تک انجام نہیں دی جاسکتی ہے جب تک ظالموں کا دنیا پر غاصبانہ قبضہ ہے۔ اللہ والوں کی پہلی کوشش ظالموں سے اللہ کی زمین کو واپس لینا ہے تاکہ خالق کائنات فطرت کا فطری قانون چلایا جاسکے۔'' (مولانا فردوسیؒ از نقش دوام)

اس بیان کی روشنی میں طیب عثمانی کی یہ رائے درست ہے کہ اسلامی حکومت اور اقامت دین کی تحریک جس زور وشور سے برصغیر عالم اسلام میں جاری ہے اس کا کتنا واضح تصور و نقشہ آج سے تین چوتھائی صدی پہلے ایک گوشہ نشین گمنام مگر باکمال درویش کے ذہن میں موجود تھا۔ وہ رقم طراز ہیں کہ شاہ فردوسیؒ بیعت ارشاد کے ساتھ بیعت جہاد بھی لیتے تھے، یعنی شریعت کی پابندی کے ساتھ اس بات کا بھی مرید سے عہد لیا جاتا تھا کہ جب علماء جہاد کے لیے تیار ہوں گے

تو میں ان کا ساتھ دوں گا۔ حضرت فردوسیؒ مریدوں کو یہ تلقین کرتے:

''راہ جہاد عشق الٰہی کی راہ ہے اور اس راہ پر چلنے کے لیے جس زاد راہ کی ضرورت ہے وہ جانبازی ہے، خون کے رشتوں اور وطن وزمین کی فانی الفتوں کو محبت اور ایمان کے رشتہ پر قربان کرنا ہے۔''

طیب عثمانی نے حضرت فردوسیؒ کی جنگ آزادی میں شرکت، غیر مسلموں میں اشاعت اسلام کی انجام دہی اور اجتماعی طور پر دعوت دین کے لیے ان کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ غرض یہ کہ مختصر سوانح میں ہر اعتبار سے جامعیت اور کوزہ میں دریا کو بند کر دینے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یقیناً اس تصنیف نے طیب عثمانی کو بحیثیت سوانح نگار اردو ادب میں ایک اہم مقام عطا کیا ہے۔

جناب طیب عثمانی کو اللہ تعالیٰ نے اپریل ۱۹۹۸ء میں حج کی سعادت بخشی اور اس سفر حج کی روح پرور روداد ''سفر نامہ الحرمین الشریفین'' -- اب دل طواف کوئے محبت کو جائے ہے -- کے عنوان سے ایک نئی کتاب اگست ۱۹۹۹ء میں منظر عام پر آئی۔ طیب عثمانی صاحب گزشتہ چالیس برسوں سے اردو نثر کے سرمایہ میں گراں قدر اضافے کرتے رہے ہیں اور کئی اہم تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اب اپنی پختہ سالی کے دور میں دیار حبیب کے سفر کی داستان بیان کی ہے تو آنکھوں کے سامنے حرمین شریفین کے دلنواز مناظر آجاتے ہیں، ان کی سلیس ورواں نثر میں بڑی جاذبیت ہے کہ اس کتاب کو ہاتھ میں لینے والا ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ اسے پڑھ کر دیار حبیب کے عشاق کی وارفتگی، شوق اور جذبہ ومستی کی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ دلکش روداد سفر، ادب وانشاء کا مرقع، محبت الٰہی اور عشق رسول میں ڈوبی ہوئی داستان ہے، جس میں ادب کی چاشنی، برمحل اشعار کی دلکشی اور ان سب سے بڑھ کر بے ساختگی اور والہانہ پن اور ذوق وشوق نے اس کتاب کو گنجینۂ انبساط بنا دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب اردو سفر ناموں میں ایک نیا اضافہ ہے۔

طیب عثمانی کو نقاد وسوانح نگار کے علاوہ اپنے شذرات اور سیاسی تبصروں اور مضامین

سے بھی ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ان شذرات سے ایک تو ان کی عصری مسائل سے باخبری اور بصیرت کا پتہ چلتا ہے، دوسرے اختصار کے ساتھ بات کہنے پر ان کو کس قدر قدرت ہے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔جمشید پور کے المیہ پر آپ کی تحریر کافی اثر انگیز ہے۔حالات کا تجزیہ اور صحافیوں، سیاست دانوں اور نام نہاد قائدین کی چیرہ دستیوں کا ذکر تفصیل سے کرنے کے بعد وہ یہ ہوش مندانہ مشورہ دیتے ہیں:

’’اب ہم اس ملک میں ان حالات سے دوچار ہیں جہاں ہمیں اپنی مدد آپ کرنا ہے اور ایک اخلاقی قیادت کو ابھارنا اور اس اخلاقی وروحانی خلاء کو پر کرنا ہے جو اس ملک میں پیدا ہوگیا ہے۔‘‘

طیب صاحب کے لب ولہجہ میں رجائیت ملتی ہے اور حالات کی تمام تر ناسازگاریوں کے باوجود وہ ایک روشن مستقبل کی بشارت دیتے ہیں۔مسٹر بھٹو کی پھانسی کے وقت ہندوستان میں مختلف مقامات پر جماعت اسلامی ہند کے کارکنوں اور دفاتر پر کچھ شرپسند عناصر کے حملہ کی مذمت کرتے ہوئے وہ حالات کا مفصل طور پر تجزیہ کرتے ہیں اور صحیح موقف کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔طیب صاحب اس جمہوری ملک میں مسلمانوں کی سیاست سے کنارہ کشی کے مخالف ہیں۔انتخابات کے مواقع پر انھوں نے اپنے متعدد مضامین میں ووٹ کو موثر بنانے کا مشورہ دیا ہے۔اپنے ایک مضمون بعنوان ’’دشمن کو دوست بنایئے‘‘ میں وہ مسلمانوں کے ماضی وحال کا تقابل بڑی اثر انگیز زبان میں کرتے ہیں۔ یہاں ہمیں اس زبان کی چاشنی ملتی ہے جو کبھی ’’الہلال‘‘ کے صفحات پر موجود تھی۔ایک اچھے ادیب اور قلمکار کے لیے نظریاتی بالیدگی اور عصر رواں سے باخبری ناگزیر ہے۔طیب عثمانی کو مشیت نے دوررس نگاہ، حساس قلب اور بیدار دماغ عطا کیا ہے۔ملت کو پہنچنے والی ہر خراش اور خلش پر وہ مضطرب ہوتے ہیں اور ان کا ردعمل نہایت متوازن، ہوشمندانہ اور بصیرت افروز ہوتا ہے۔

طیب صاحب کے مضامین اور کتب میں ان کی نثر کا معیار کافی بلند ہے۔یعنی شبلی و

سلیمان ندوی اور ابوالاعلیٰ مودودی کے اسالیب کا دلکش امتزاج، ادبیت و بلاغت سے بھرپور اور حکیمانہ مضامین کو خوش اسلوبی سے ادا کرنے والی نثر-- وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ دبستانِ ندوہ کے ممتاز اہل قلم سے وہ طرز ادا اور زبان و بیان کے معاملے میں خاصے متاثر ہیں۔ندوہ کی تعلیم و تربیت، پھر پھلواری شریف کے قیام اور تحریک اسلامی اور ادارہ ادب اسلامی کے قلمکاروں سے رفاقت و قرب نے ان کے قلم کو وہ توانائی بخشی ہے کہ وہ بڑی خود اعتمادی سے ہر طرح کے موضوعات پر اظہار مدعا کرتے ہیں۔اور اپنی خوش آہنگ اور رواں دواں نثر سے ہمیں جذب کر لیتے ہیں۔اس میں فارسیت وعربیت کا رعب داب اور ثقالت وگراں باری نہیں۔وہ طول کلام کے عادی نہیں، نہ تو ابہام ولایعنیت کے شکار ہوتے ہیں۔ ہر اچھے نثر نگار کی تحریر میں ایک داخلی آہنگ ہوتا ہے۔ایسی روانی اور برجستگی ملتی ہے کہ بہتے ہوئے دریا کا احساس ہوتا ہے۔زبان کہیں اٹکتی،لڑکھڑاتی نہیں ہے۔کوئی بے ڈول یا ناتراشیدہ لفظ یا ترکیب ہمارے لیے سدراہ نہیں بنتی۔ طیب عثمانی کے یہاں خوب صورت نثر نگاری کے یہ سارے اوصاف سمٹ آئے ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اسلامی ادبیات میں اپنے مختصر کارناموں کے باوجود انھوں نے ایک اہم مقام بنایا ہے۔ان کی شخصیت کی طرح ان کی باتیں بھی ہمارے لیے دل پذیر ہیں، ان کی علمیت کی طرح ان کا اسلوب بھی پرکشش ہے،ان کے اخلاص اور انکسار کی طرح ان کی گفتار اور قلمی کاوشوں میں ایک حرارت، ایک تابندگی اور ایک دلنوازی ہے جو ان کے مخاطب اور ان کے قاری پر محویت کا عالم طاری کردیتی ہے۔

(ماخوذ’’از’’آداب شناخت‘‘)

○○○

مولانا طیب عثمانی ندوی: حالات اور خدمات

□ پروفیسر محسن عثمانی ندوی (حیدرآباد)

ہندوستان میں چشتی سلسلہ کے ایک مشہور بزرگ تھے حضرت خواجہ صابر کلیری، ان کے صرف ایک خلیفہ تھے، جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی، یہی مولانا طیب عثمانی ندوی کے جد امجد ہیں، جو حضرت عثمان بن عفان خلیفہ سوم کی اولاد میں سے تھے۔ اس پانی پتی عثمانی خاندان کا ایک حصہ بہار آ گیا تھا۔ پانی پت کے عثمانی خاندان میں معروف علمائے دین اور صلحاء پیدا ہوئے جیسے مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی جن کی تفسیر مظہری ہے اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی جن کی کتاب ''اظہار الحق'' ہے۔

بہار میں کئی سو سال سے ان کا خاندان آباد ہے۔ تصوف، عبادت اور رشد و ہدایت اس خاندان کا خاص امتیاز رہا ہے۔ مولانا طیب عثمانی کے والد ماجد شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی، سملہ کی خانقاہ کے سجادہ نشیں تھے۔ مولانا طیب عثمانی ابتداء میں اپنے والد کی صحبت اور تربیت میں رہے۔ خاندان عثمانی کی ایک اہم شخصیت ڈاکٹر زین العابدین عثمانی ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ مشہور عالم اور مصنف مولانا سید سلیمان ندوی کا تعلق بھی بہار سے تھا، اس طرح ندوہ کا ذکر خاندان میں ہوتا رہتا تھا، چنانچہ طیب عثمانی صاحب کو تعلیم کے لیے ندوہ بھیج دیا گیا۔

لکھنؤ میں ۱۹۵۴ء میں جناب م۔ نسیم کی ادارت میں ایک تعمیری ادبی رسالہ ''نئی نسلیں'' کے نام سے شائع ہونے لگا۔ مولانا طیب عثمانی شریک ادارت تھے اور رسالہ کے ٹائٹل پر دونوں کا نام ہوتا تھا۔ ندوہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کے صاحبزادے مولانا سلمان ندوی کے وہ ہم سبق

تھے۔ مولانا محمود الحسن ندوی کے بھی ہم جماعت تھے اور ندوہ کی کئی شخصیتیں ان کے رفقاء میں تھیں۔ اسلوب کی شگفتگی اور پختگی اسی ماحول میں پیدا ہوئی تھی۔ مطالعے کا ذوق پروان چڑھا اور شعور پختہ ہوا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں ندوہ سے فضیلت کی ڈگری لی۔ لکھنؤ سے جب وطن واپس ہوئے تو امارت شرعیہ کے جریدہ ''نقیب'' کی ادارت ان کے سپرد ہوئی۔ امارت شرعیہ کے اس وقت کے ناظم جناب قاضی احمد حسین تھے جو پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن بھی تھے۔ اس زمانہ میں طیب عثمانی صاحب نے اقبالیات پر کئی مضامین لکھے جو پہلے ''حدیث اقبال'' کے نام سے اور بعد میں ''اقبال: شخصیت اور پیام'' کے نام سے مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے کتابی شکل میں شائع ہوئی، جس کا پیش لفظ روح اقبال کے مصنف ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے قلم سے ہے۔ یوسف حسین خاں نے کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ ''مصنف نے ان تمام تہذیبی مسائل پر روشنی ڈالی ہے جو اقبال کے کلام میں ملتے ہیں۔ کتاب کا انداز تحریر دلکش ہے۔'' ماہر القادری نے لکھا ''لائق مصنف نے افکار اقبال کا تجزیہ دلنشیں انداز میں کیا ہے۔

امارت شرعیہ کے مختصر دور کے بعد وہ گیا میں ''ہادی ہاشمی ہائی اسکول'' سے وابستہ ہو گئے اور پھر شہر گیا ہی میں ان کا مستقل قیام ہوا۔ لیکن ان کے اشہب قلم کا سفر مسلسل جاری رہا، یہاں سے انھوں نے ''صدف'' کے نام سے ادبی رسالہ بھی نکالا، ان کی پہلی کتاب ''رسول اکرم'' کے نام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔ ان کی دوسری تصنیف ''افکار و اقدار'' ہے جو ۱۹۷۶ء میں منظر عام پر آئی، یہ خالص ادبی اور تنقیدی کتاب ہے۔ اس میں ادبی شخصیات پر بھی گفتگو ہے اور ادبی نظریات پر بھی۔ ان کے کئی ادبی اور تنقیدی مضامین اسلامی ادب کے ترجمان ماہنامہ ''دوام'' میں شائع ہوئے جو ''ٹانڈہ'' سے نکلتا تھا۔ مولانا طیب عثمانی کے تنقیدی نظریات کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ کتاب ان کی فکری بالیدگی کی عکاس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا طیب عثمانی کو تحریر کا سلیقہ بھی عطا کیا تھا اور ادب کا خاص ذوق بھی مرحمت کیا تھا، وہ ادبی مفکر تھے۔ انھوں نے پہلے ''نئی نسلیں'' میں اور بعد میں ادب اسلامی کے ترجمان ''پیش رفت'' میں جو اداریے لکھے تھے انھیں پڑھ کر ادبی مفکر کی اصطلاح ان کے لیے موزوں معلوم ہوتی ہے۔

ان اداریوں کا مجموعہ ''ادبی اشارے'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔طیب عثمانی پر ادبی اور تنقیدی حیثیت سے کچھ بھی لکھنے کے لیے یہ کتاب بہت اہم ہے۔

مولانا طیب عثمانی کی مجلس ملت کے مسائل اور معاملات پر گفتگو کی مجلس ہوتی تھی۔ شخصیات کا تذکرہ دینی اور ملی خدمات کے ذیل میں آتا تھا۔تنقید بھی ہوتی تھی تو خالص علمی اور نظریاتی معیار کی۔عیب جوئی اور غیبت سے ان کی مجلس خالی ہوتی تھی۔ملی مسائل اور مشکلات پر بھی اظہار خیال کرتے اور اخبارات میں مضامین شائع کرتے۔اس طرح کے مضامین کا مجموعہ ''صحرا میں اذان'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔''اسلامی معاشرہ''، ''حیات دوام'' اور ''نقش دوام'' ان کی دوسری کتابیں ہیں۔انھوں نے گیا شہر میں بیٹھ کر کئی مسلم نوجوانوں کی فکری اور اخلاقی تربیت کا کام انجام دیا۔

اردو اخبارات میں بھی عصر حاضر کے ادیبوں پر لوگوں کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ریاست بہار کے ادباء اور شعراء پر راشٹریہ سہارا اور دوسرے اخبارات میں مضامین کئی بار نئے اہل قلم نے لکھے۔ان نئے لکھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ادیب ہو جس کا قلم اس قدر شگفتہ اور اس قدر ساحرانہ اور دلبرانہ اور انشا پردازانہ مضامین تخلیق کرتا ہو۔لیکن مضمون نگاروں کی ''وسیع النظری اور فراخ دلی'' کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے ادیبوں کی فہرست میں مولانا طیب عثمانی کا کہیں نام نہیں آنے دیا کہ مبادا ان پر جماعت اسلامی کا اور رجعت پسندی کا ٹھپہ نہ لگ جائے۔اس موقع پر ایک پُر لطف شعر یاد آتا ہے:

دنیا کا جن کو درد ہے معدودے چند ہیں
باقی تمام لوگ ترقی پسند ہیں

موت ہر شخص کو آنی ہے۔یہی کتاب زندگی کی تمت اور صحیفہ حیات کا آخری ورق ہے۔ یہاں پہنچ کر ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ کس کا عقیدہ اور کس کا نظریہ درست تھا اور کون بے سود زندگی بھر باطل کے خارزار میں آبلہ پائی کرتا رہا۔اللہ تعالیٰ مرحوم کے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ فرمائے اور ان کو فردوس میں اجر جزیل اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔آمین!

○○○

مولانا شاہ طیب عثمانی کے افکار صوفیانہ

□ مولانا سید شاہ ہلال احمد قادری (پھلواری شریف، پٹنہ، بہار)

مولانا شاہ طیب عثمانیؒ، ایک صوفی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ان کا خاندان، مشہور چشتی بزرگ حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی قدس سرہ کی اولاد میں سے ہے اور وہ حضرت امیر المؤمنین عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی نسل سے تھے۔

عثمانی خانوادہ اپنے دامن میں ایک طویل علمی، ادبی اور عرفانی تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔یہ خانوادہ شروع سے فردوسی سلسلے سے وابستہ رہا ہے اور ان دونوں خانقاہوں سے صوبۂ بہار میں مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحیٰ منیری قدس سرہ کے سلسلے کی بہت اشاعت ہوئی اور آج بھی یہ خانقاہیں فعال ہیں اور اعتدال پسند صوفیانہ فکر کی حامل ہیں۔

مولانا شاہ طیب عثمانی اسی خاندان عثمانی کے قابل فخر فرزند تھے۔ان کے بارے میں یہ خیال عام رہا کہ وہ خاص جماعت اسلامی کے آدمی ہیں اور جماعت اسلامی کے متعلق سب کو معلوم ہے کہ وہ تصوف اور نظام خانقہی سے بہت مختلف جماعت ہے۔اس جماعت کے بعض فضلاء کی تصوف پر تنقیدیں راقم کی نظر میں ہیں۔

شاہ طیب عثمانی کی نشو و نما اور ان کی فکری ساخت ایک ایسے صوفیانہ ماحول میں ہوئی تھی جہاں نظام خانقاہی اپنے تمام ''بدعتی لوازم'' کے ساتھ قائم تھا، یعنی وہاں نیاز و فاتحہ ہوتا تھا، عرس و سماع کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں، اور بڑے اہتمام کے ساتھ موئے مبارک کی ہر سال زیارت

هوا کرتی، مریدین ومتوسلین کواذکار و وظائف کی تعلیم دی جاتی تھی ، اہل خاندان سلسلۂ فردوسیہ سے وابستہ تھے اور سجادہ نشینی کا سلسلہ جاری تھا۔اس ماحول سے نکل کر شاہ طیب صاحب جس ماحول میں پہنچے وہاں یہ رسوم صوفیانہ، دستور مشیخت اور معمولات خانقاہی ’’ممنوعات شرعیہ‘‘ میں شمار ہوتے تھے اور ان امور کے بارے میں اس طبقے کی رائے عام اور واضح تھی ۔ شاہ طیب صاحب، خانقاہی مسلک کی رواداری کے مطابق اس ماحول میں بغیر کسی ناخوش گواری کے سکون وانشراح کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے رہے اوراعلیٰ تعلیمی صلاحیت لے کر نکلے۔

قابل ذکر یہ ہے کہ مولانا طیب عثمانی کوفکری استقامت حاصل تھی ،مختلف غیر صوفیانہ ماحول میں رہ کر اور اس سے وابستہ ہوکر بھی ان کے صوفیانہ مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ، جماعت اسلامی سے تادم آخر وابستہ رہنے کے باوجود وہ ایک صوفی بھی رہے۔ یہ ان کے کتاب زندگی کا اہم باب ہے اور ان کی دینی اور فکری عزیمت واستقامت کا ثبوت ہے۔ بچپن میں جو سبق ان کے قلب وذہن نے اپنے بزرگوں سے سیکھا تھا اور باشعور ہونے کے بعد اپنے خاندانی اور خانقاہی ماحول کے مشاہدے نے جو کچھ ان کو سمجھایا تھا، اور اپنے بزرگوں کی اخلاص وللّٰہیت سے بھری زندگی کے جو نقوش ان کے قلب وذہن پر مرتسم ہوئے تھے وہ اتنے پراثر تھے کہ ماحول کی تبدیلی اور مطالعہ کے تنوع نے اس میں شکوک پیدا کرنے کے بجائے مزید پختگی پیدا کردی ، اور ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ یہ اگر شاہ طیب صاحب کی سلامت قلبی کی دلیل ہے تو دوسری طرف ان کے بزرگوں کی تربیت کا کمال بھی ہے۔

مولانا طیب عثمانی کو تصوف کے بارے میں جو انشراح قلب حاصل تھا وہ مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کے ساتھ روابط کے باوجود باقی رہا، ان کو خانقاہی معمولات پر کبھی معترض ہوتے یا اپنے بزرگوں کے طریقے پر شک وشبہ کرتے ہوئے میں نے نہیں سنا ، وہ اتنی سنجیدہ طبیعت کے آدمی تھے کہ کبھی مسائل مختلفہ پر گفتگو نہیں کرتے تھے اور نہ انہوں نے اپنی تحریروں میں ایسی کوئی بات لکھی ہے جس سے سمجھا جائے کہ تصوف کے کسی گوشے پر ان کو اعتراض تھا۔ ایک

مرتبہ ان کے جماعتی دوستوں نے کسی خانقاہی رسم یا عرس پر اعتراض کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا کہ ’’یہ تو خانقاہی معمولات ہیں جس طرح جماعت کے ہفتہ وار اور ماہانہ پروگرام ہوتے ہیں‘‘ یہ بات انہوں نے خود مجھ سے فرمائی تھی۔

مولانا طیب عثمانی مزاجاً صوفی تھے اور تصوف پر ان کے مضامین بھی ہیں۔ انہوں نے تصوف کو پہلے پڑھا نہیں تھا بلکہ بدو شعور سے تصوف کی عملی تصویریں دیکھی تھیں، تصوف کا سب سے جامع اور عملی نمونہ انہوں نے اپنے والد گرامی حضرت مولانا شاہ قاسم عثمانی فردوسی رحمہ اللہ کی ذات میں پایا، اور یہ مشاہدہ، تصوف کے متعلق انشراح باطن اور اطمینان قلب کا باعث ہوا۔ ان کے والد ماجد جو ان کے مرشد ومربی روحانی بھی تھے، علمی وعرفانی خوبیوں سے مزین ایک صاحب نسبت بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے عہد کی ایک عظیم المرتبت شخصیت زبدۃ العارفین قدوۃ الصالحین مولانا سید شاہ بدرالدین قادری پھلواروی قدس سرہ زیب سجادہ خانقاہ مجیبیہ، کی صحبت اٹھائی تھی ، خاندان کی میراث عرفانی وروحانی ان کو حاصل تھی ، خانقاہ مجیبی کے قطب الارشاد کی توجہ نے ان کی باطنی صلاحیتوں کو جلا بخشی ۔ مولانا طیب صاحب اپنے والد ومرشد کو تصوف کا عملی نمونہ سمجھتے تھے۔ بعد میں انہوں نے تصوف کا مطالعہ کیا ہوگا، وہ مطالعہ ان کے علم میں اضافے کا سبب ہوا اور اپنے مشاہدات کی ان کو سند بھی مل گئی۔

انہوں نے اپنے والد کی سوانح ’’حیات دوام‘‘ میں تصوف پر گفتگو کی ہے، اس وقت تصوف پر ان کا ایک مضمون ’’تصوف کی حقیقت۔ مکتوبات وملفوظات مخدوم جہاں کے تناظر میں‘‘ بھی میرے سامنے ہے ان تحریروں سے تصوف پر ان کے افکار وخیالات معلوم ہوتے ہیں ۔حیات دوام میں وہ تصوف وسلوک کی حقیقت کے عنوان سے لکھتے ہیں:

’’آج کے دور میں تصوف واحسان اور سلوک کا موضوع بڑا نازک بن گیا ہے، اس کی نت نئی تعبیریں ہیں جو مختلف حضرات مختلف الفاظ، نقطۂ نظر اور اپنے انداز سے کرتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں ابتدا سے ایک گروہ ایسا موجود

ہے جس نے تمام مقاصد دنیوی سے قطع نظر کر کے اپنا نصب العین محض یادِ خدا اور ذکر الٰہی کو رکھا اور صدق وصفا، سلوک واحسان کے مختلف طریقوں پر عامل رہا، یہی گروہ رفتہ رفتہ گروہ صوفیہ کہلایا، اور اس کے مسلک کا نام ''مسلک تصوف'' پڑ گیا۔ یہ قدیم اکابر صوفیہ، شریعت پر عامل باعمل مسلمان تھے پھر صوفی تھے۔ اور اپنے اپنے تصوف کو اسلام کے مقابل ایک جداگانہ حیثیت سے نہیں لاتے تھے بلکہ اسلام کے ماتحت اسی کی پاکیزہ صورت کو کہتے تھے۔ تصوف ان کی نظر میں اسلام کی خالص ترین اور پاکیزہ ترین تعبیر تھی۔''

(حیاتِ دوام، ص:۴۰)

تصوف کے موضوع پر اہل نظر قلم اٹھاتے ہیں تو اپنے زمانے کے اہل تصوف کے بعض تسامحات کو نظر انداز نہیں کرتے، ان خامیوں کا ذکر کرنا وہ اپنی دیانت داری سمجھتے ہیں، مولانا طیب عثمانی نے بھی تصوف پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے جو رائے پیش کی ہے وہ ہر سلیم الطبع کے لئے قابل قبول ہے، وہ لکھتے ہیں:

''موجودہ دور میں تصوف کی مسخ شدہ شکل جو عام طور پر نظر آتی ہے وہ اسلامی اور غیر اسلامی عناصر کا معجون مرکب بن گئی ہے جس کے اسلامی اجزاء غیر اسلامی افکار ونظریات کے دھندلکوں میں چھپ کر رہ گئے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ اسلامی تصوف تو وہ ہے جو حضرت سرور کائنات ﷺ کا تھا، جو حضرت صدیقؓ وعلی مرتضیٰؓ کا تھا، جو حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت ابو ذر غفاریؓ کا تھا اور جس کی تعلیم حضرت جنید بغدادیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیریؒ نے دی۔ صحابۂ کرام تابعین اور تبع تابعین کی طرح صلحاء اور اخیار امت کی زندگی بھی ہمارے لئے اسوہ اور نمونہ ہے۔ ان اہل دل بزرگوں کے حالات کو جاننا اور

ان کی حقیقی اسلامی تعلیمات کی واقفیت بہم پہنچانا، ہماری سعادت ہے۔'' (ص:۴۱)

شاہ طیب عثمانی نے اپنے والد گرامی محبوب الاولیا شاہ قاسم فردوسیؒ کے حوالے سے حیات دوام میں تصوف سے متعلق جو باتیں لکھی ہیں وہ سب، وہ افکار ہیں جن کو شاہ طیب عثمانی کے قلب وذہن نے پورے انشراح کے ساتھ قبول کیا ہے۔ حیات دوام کے مندرجات سے ان کے صوفیانہ نظریات کھل کر واضح ہو جاتے ہیں، مثلاً صوفیہ کی جو اصطلاحات ہیں فنا، بقا، ذکر، شغل اور مراقبہ وغیرہ ان کے صحیح و برحق ہونے میں ان کو کوئی شبہ نہیں تھا۔ اپنے والد کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

''سلوک واحسان آپ کی زندگی کا حال بن چکا تھا، آپ نے اپنے خطوط میں تصوف واحسان کی حقیقت پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے، چنانچہ آپ کا ارشاد ہے: تصوف سراپا عمل ہے، تصوف، اتباع نبوی ﷺ کا نام ہے۔ پھر فرماتے ہیں: تصوف میں منازل ومقامات اور فنا وبقا کی اصطلاحات نظری نہیں بلکہ عملی ہے، اسی طرح ذکر، شغل ومراقبہ بھی صرف ذہنی چیز نہیں بلکہ سراپا عمل ہے۔'' (ص:۴۲)

تصوف کے مخالف، تصوف کے خلاف بہت کچھ کہتے اور لکھتے رہتے ہیں، اس کا جواب اپنے والد گرامی کے حوالے سے دیتے ہیں:

''تصوف کیا ہے؟ عموماً لوگ اسے ہندوانہ جوگ یا نصرانی رہبانیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں: تصوف نہ ہندوانہ جوگ ہے اور نہ نصرانی رہبانیت، تصوف ماسوا اللہ سے دلی تعلق کو قطع کر کے خدا کی طرف یکسو کر دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ تصوف مادی نعمتوں کا ترک کرنا نہیں سکھاتا بلکہ ان کا صحیح استعمال بتاتا ہے۔ حقیقت میں اسلامی تصوف محمد رسول اللہ ﷺ کی صوری ومعنوی پیروی کا نام ہے۔'' (ص:۴۳)

تصوف کے مختلف مباحث جن کو اس زمانے میں معترضین گمرہی سے تعبیر کرتے مثلاً

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود وغیرہ۔مولانا طیب عثمانی اپنے والد کے حوالے سے ان افکار صوفیانہ کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''یوں تو آپ نے زندگی کے ہر شعبے میں اپنے تجدیدی فکر وعمل کے نقوش ثبت کئے ہیں جن پر آیندہ صفحات میں مختلف موضوعات وعنوانات کے تحت روشنی ڈالوں گا،لیکن تصوف واحسان آپ کا عملی اور حقیقی مسلک ومشرب رہا ہے۔اسلامی تصوف کی روح ،توحید خالص ، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود جیسے خالص فلسفیانہ اور نظری مسٔلوں کی حقیقت کو آپ نے بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے اور جس سے عملی زندگی میں ہماری رہنمائی ہوتی ہے،تصوف میں شریعت،طریقت اور حقیقت کی حقیقی تعبیر اس طرح بیان فرمائی: جس طرح اصطلاح تصوف میں جوارح وحواس سے متعلق احکامات کو شریعت کہتے ہیں اور دل سے متعلق احکامات کو طریقت سے تعبیر کرتے ہیں۔اسی طرح کتاب وسنت میں جو احکامات روح کی پاکی اور صفائی سے تعلق رکھتے ہیں ان کو اصطلاح تصوف میں حقیقت کہتے ہیں۔وحدت الوجود اور وحدت الشہود جو خالص نظری مسئلہ ہے،آپ نے اس کو سہل ممتنع بنا دیا ہے جس سے حقیقت تک رسائی آسان ہو جاتی ہے چنانچہ اس مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: موجودات کے اندر صفات وجود کو دیکھنا ''از اوست'' ہے اور صفات وجود کے اندر وجود دیکھنا ''ہمہ اوست'' ہے۔''از اوست''۔وحدت شہود ہے۔ اور ''ہمہ اوست'' وحدت الوجود۔''از اوست'' سیر فی الصفات۔''ہمہ اوست'' سیر فی الذات ہے۔'' (ص:۴۹)

ایک قدیم نظریہ ہے کہ ''خطائے بزرگاں گرفتن خطا است''یعنی بزرگوں کی کسی فکری، لسانی اور قلمی غلطیوں کی گرفت کرنا اور اس پر معترض ہونا خود ایک خطا ہے۔اگرچہ اس محاورے کا یہ مفہوم بھی بیان کیا جاتا ہے کہ بزرگوں کی خطا کو درست سمجھ کر اس کو اختیار کر لینا بھی خطا ہے۔لیکن

یہ محض ایک لفظی ہیر پھیر ہے صحیح مفہوم وہی ہے جو پہلے بیان کیا گیا۔مولانا طیب عثمانی اپنے وسیع مطالعے اور مختلف الخیال لوگوں کے درمیان رہ کر بھی اس محاورے کے عملاً قائل رہے اور کسی اختلافی مسئلے میں اپنے بزرگوں سے اختلاف تو کجا علمی نقطۂ نظر سے بھی معترض نہیں ہوئے۔ وحدۃ الوجود کے مسئلے پر معترضین کی تحریریں اتنی سخت ہیں کہ تصوف کا سطحی مطالعہ رکھنے والے ان کو پڑھ کر جنید و بایزید سے لے کر اس عہد تک کے تمام صوفیوں کو گمراہ تصور کرنے لگتے ہیں،مولانا طیب صاحب نے یقیناً ان تحریروں کا مطالعہ کیا ہوگا لیکن ان کی سلامت فکر نے ان کو اپنے بزرگوں سے برگشتہ نہیں کیا اور اپنے بزرگوں کی تاویلات وتشریحات کو بلا کسی تردد کے تسلیم کر لیا۔یہ سب باتیں شاہ طیب صاحب کے صوفیانہ افکار ومزاج کو واضح کرتی ہیں۔حضرت مخدوم جہاں کے ملفوظات ومکتوبات کی روشنی میں تصوف پر ان کا ایک مختصر مضمون ہے،اس میں وہ حضرت مخدوم قدس سرہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''برعظیم ہند میں اولیاء اللہ اور اکابر صوفیاء کا ایک سلسلۃ الذہب نظر آتا ہے،جن کی تعلیمات ، ریاضات ومجاہدات اور دعوت وعزیمت کے نقوش اس سرزمین میں ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں اور جن کے قدموں کے نشانات سے یہاں کا چپہ چپہ روشن ہے۔اس میں آٹھویں صدی ہجری کی ایک عظیم اور نادر شخصیت حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحيٰ منیری کی ذات والا صفات بھی ہے۔جن کا بچپن اور شباب،مروجہ علوم کے حصول اور علوم دینیہ کی تکمیل میں گزرا۔پھر روحانی علوم کی تکمیل اور تلاش شیخ میں آپ دہلی پہنچے،وہاں حضرت شیخ نجیب الدین فردوسی کے در دولت پر حاضر ہوئے۔شیخ کی ایک نگاہ نے سلوک کے وہ ساری منازل طے کرا دیں جن کی آپ کو ضرورت تھی اور جن کے لئے آپ کا قلب پہلے سے تیار تھا،ضرورت صرف ایک آنچ کی تھی ، جو ایک نگاہ شیخ سے پوری ہوئی۔پھر بیعت اور داخل سلسلہ کے بعد اجازت دے کر حضرت خواجہ شیخ نجیب الدین فردوسی نے رخصت فرمایا۔وطن واپسی

میں جب بہیا کے جنگل سے گزرے تو مناظر قدرت سے ایسے سرشار ہوئے کہ ضبط کا یارا نہ رہا، گریباں چاک کر کے جنگل کی راہ لی اور روپوش ہوگئے، جنگل میں بارہ برس کا عرصہ ریاضت ومجاہدہ، خلوت ومراقبہ، عشق الٰہی کی حرارت اور بے خودی وسرمستی میں گزرا، جب ذرا سکون ہوا تو روحانیت کی تکمیل کے بعد خلق خدا کی ہدایت کی طرف متوجہ ہوئے، جو اصل مقصود تھا۔ اس عظیم واصل مقصد کے لئے بہار شریف تشریف فرما ہوئے اور تقریباً نصف صدی سے زیادہ کا زمانہ خلق خدا کی رشد وہدایت اور طالبین حق کی تعلیم وتربیت میں گزرا۔ اس عرصے میں لاکھوں انسانوں کے دلوں کو بدلا، سینکڑوں علماء اور عارفین واصل بحق ہوئے اور جانے کتنے ہندو فقیروں اور جوگیوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت اور پیغام ہی ان کا اصل مشن تھا۔''

(اسلامی معاشرہ ص:۷)

شاہ طیب عثمانی کی یہ تحریر ان کے تصوف سے گہری دلچسپی اور اولیاء اللہ سے غیر معمولی عقیدت مندی کی دلیل ہے۔ اکابر اولیاء اللہ کا تذکرہ جس احترام کا متقاضی ہے شاہ طیب صاحب کی تحریر میں وہ جذبۂ احترام بھی موجود ہے۔

مولانا شاہ طیب عثمانی فردوسی رحمہ اللہ، مشائخ کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، درویش صفت تھے، اپنی تحریر کی روشنی میں فکر وعمل میں صوفی تھے لیکن یہ بات ان کے لباس ومعاشرت سے نہیں جھلکتی تھی، یہ بھی ان کے عالی ظرف ہونے کی دلیل تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ کرے۔ آمین!

ooo

مولانا طیب عثمانی کی تعلیمی خدمات

❑ پروفیسر محمد ظفر الدین (حیدرآباد)

ماضی سبھوں کو عزیز ہوتا ہے۔ ماضی کے دنوں میں بھی اگر بچپن کی بات کی جائے تو ہر کس وناکس یادوں کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے۔ وہ بچپن خواہ یاس وحسرت اور عسرت میں گزرا ہو یا عیش وعشرت میں' اُس کی یادیں کسی قیمتی سرمایے سے کم نہیں ہوتی ہیں۔ میں بھی جب اپنے ماضی کے نگارخانے کی طرف نظر کرتا ہوں تو وہاں مختلف طرح کی یادیں موسمی پھلوں کی مانند اپنے کھٹے میٹھے تاثرات کے ساتھ موجزن نظر آتی ہیں۔ ہر یاد لطف وانبساط کا سامان مہیا نہیں کرتی اور نہ ہی ہر یاد اپنے دامن میں خوشگواریاں سمیٹے ہوئے ہوتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہر یاد کی اپنی اہمیت ہے اور ہر واقعے نے زندگی کا کوئی نہ کوئی درس دیا ہے۔ بچپن کی اِن یادسرائے میں میرا محلّہ' وہاں کی گلیاں' بازار' کھیل کا میدان' اسکول' مسجد اور میرے والد قمر نظامی صاحب کا بیٹھک سبھی ہاتھ باندھے قطار اندر قطار کھڑے ہیں۔ بیٹھک کو ہم لوگ بڑا کارخانہ کہتے تھے جس کی کہانی میرے دادا کے دھاگے کے کارخانے سے جڑی ہوئی تھی۔ بعد میں وہ میرے والد کا دفتر نما بیٹھک بن گیا جہاں محلے کے لوگوں کے علاوہ شہر کے اکثر وبیشتر معزز حضرات کا آنا جانا تھا۔ وہ جگہ دینی مدارس کے مدرسین ومنتظمین سے لے کر اسکول کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ اور دیگر حضرات کا مسکن تھی۔ میرے گھر سے قریب دو اسکول واقع تھے۔ اُردو گرلس ہائی اسکول اور ہادی ہاشمی ہائی اسکول۔ اِن دونوں اسکولوں کے کئی اساتذہ کے لیے وہ جگہ طویل مسافت کے

بعد ایک پڑاؤ کی مانند تھی جہاں تھوڑی دیر رُک کر، پانی پی کر، چند جملے باتیں کر کے، اخبار کی سرخیاں دیکھ کر گزر جانا اُن کا مشغلہ اور معمول تھا۔ جن اساتذہ کا راستہ اُدھر سے نہیں تھا وہ چند دنوں کے وقفے سے وہاں آتے تھے اور محلے، مساجد اور مدارس سے لے کر پاکستان، روس اور امریکا تک کی سیاست پر تبصرے کرتے تھے۔ اُن لوگوں کے آنے سے ہمارے بیٹھک کی رونق میں اضافہ ہوتا تھا اور ابا اُن سے، یوں سمجھئے کہ توانائی حاصل کرتے تھے۔ اُن قابل قدر ملاقاتیوں (Visitors) میں ہادی ہاشمی اسکول کے ریاضی کے استاد عبدالکریم صاحب، انتہائی زندہ دل اور ہمدرد انسان سید مرتضٰی ہاشمی صاحب اور سنجیدگی کے پیکر مگر پیہم نیم متبسم شخصیت سید شاہ طیب عثمانی صاحب شامل تھے جنھیں اسکول میں لوگ ''اردو سر'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میں نے بھی ہادی ہاشمی ہائی اسکول کی پانچویں جماعت میں داخلے کے ساتھ ہی اُنھیں اردو سر کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ وہ پس منظر ہے جس میں اپنے استاذ محترم جناب طیب عثمانی صاحب سے میرا تعارف ہوا تھا۔ یہ تعارف اور تعلق اتنی مستحکم بنیادوں پر قائم ہوا تھا جو اُن کے گزشتہ دنوں انتقال پر ملال کے سانحہ تک اُستوار رہا۔ گیا سے میری منتقلی کے سبب جب اُن سے راست ملاقاتوں کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا تو میرے سنئیر دوست اور اُن کے لائق و فائق صاحبزادے ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی ہمارے درمیان پل کا کام کرنے لگے اور اُن کے توسط سے مجھے اپنے پسندیدہ و مشفق اُستاد کی خیریت اور دعائیں ملتی رہیں۔

برادر محترم ڈاکٹر رشاد عثمانی نے جب مجھ سے استاذ محترم پر ''کچھ لکھنے'' کے لیے کہا تو میرے ذہن نے کسی منفرد موضوع یا پہلو کی تلاش شروع کر دی۔ مجھے ایسا لگا کہ طیب عثمانی صاحب کی علمی و ادبی خدمات اور اُن کے مذہبی معاملات سے متعلق یقیناً کافی کچھ لکھا جا رہا ہوگا۔ لہٰذا میں نے اُن کے روشن پہلوؤں پر مزید روشنی ڈالنے کی بجائے ایک ایسے زاویے کا انتخاب کیا جو اُن کی تدریسی زندگی سے متعلق ہے اور ایک طالب علم کے ذاتی تجربے و مشاہدے پر مبنی ہے۔ ان کی تعلیمی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مجھے اُن کے شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل

ہے اور اتفاق سے آج میں خود ایک اُستاد ہوں۔ لہٰذا اس بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ استاد و شاگرد کے درمیان تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ اعتماد اور خلوص کا بھی رشتہ ہوتا ہے جس میں شخصیت سازی بھی ضروری ہوتی ہے۔ وہ استاد جو کمرہ جماعت میں لکچر دے کر اپنی ذمہ داری کو مکمل سمجھ لیتے ہیں وہ میرے خیال میں غلط فہمی کے شکار ہیں۔ اساتذہ کی ذمہ داری اِس سے آگے بھی بہت کچھ ہوتی ہے۔ اگر کوئی استاد اپنے شاگردوں کے سامنے اپنے عادات و اطوار اور کردار و اعمال کے اعتبار سے رول ماڈل بن سکتا ہے تو وہ اپنے شاگردوں کا آئیڈیل بن جاتا ہے۔ تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ہر استاد کے لیے رول ماڈل بننا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اور اگر طلبہ کسی استاد کو اپنا آئیڈیل ماننے لگیں تو پھر اُس استاد کی اِس سے بڑی کوئی اور کامیابی نہیں ہو سکتی۔ مولانا طیب عثمانی صاحب نے سنجیدہ طلبہ کو اپنے طور طریقوں سے اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا اور ایک بڑا طبقہ نہ صرف اُن کا قدرداں تھا بلکہ مداح بھی تھا۔ وہ اپنے حسن اخلاق، رواداری اور وضع داری کے سبب بہت سارے طلبہ کے لیے آئیڈیل اور ایک مثالی شخصیت تھے۔ طیب عثمانی صاحب اسکول کی ابتدائی جماعتوں کو دینیات اور اونچی جماعتوں کو اُردو و فارسی پڑھاتے تھے۔ مجھے آج بھی ''سچا دین'' اور ''حیات طیبہ'' کے اسباق یاد ہیں جنھیں پہلے وہ طلبہ سے بلند خوانی کراتے تھے اور پھر خود بہت تفصیل سے اُس کی توضیح و تشریح کرتے تھے جو ہمارے کچے ذہنوں میں ثبت ہو جاتے تھے۔ ہم اُن سے جب اُردو پڑھنے لگے تو وہ ہمیں مرزا غالب اور شاد عظیم آبادی کے اشعار کے مفاہیم سمجھانے لگے۔ وہ اونچی جماعتوں میں بھی بلند خوانی ضرور کراتے اور تلفظ کی غلطی پر سبک انداز سے ٹوکتے تھے۔ اُن کے ٹوکنے کا انداز ایسا ہوتا تھا اور وہ کچھ اس طرح کا تاثر دیتے تھے کہ جیسے طالب علم سے غلطی نہیں بلکہ سہو ہو گیا ہو اور وہ محض توجہ دلا رہے ہیں۔ گفتگو یا تحریر میں زبان و بیان کی غلطیوں کی نشاندہی بھی بہت نرمی سے کرتے تھے۔

میرے لیے یہ حسن اتفاق تھا کہ طیب عثمانی صاحب کے فرزند شاہ حماد عثمانی (جواب سعودی عرب میں مقیم ہیں) میرے ہم جماعت تھے۔ ہم لوگوں کی آپس میں گاڑھی چھنتی

تھی۔ایک طرف والدصاحب سے آپ کا گہرا تعلق اور دوسری طرف اُن کے صاحبزادے سے میری دوستی‘ اِن دونوں حوالوں نے ہماری قربت اور عقیدت ومحبت میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ کلاس میں بعض دوسرے ہم جماعتوں کے ساتھ ہم لوگوں کا ایک الگ ہی گروپ تھا جوفروعی باتوں سے دور رہتا تھا۔اساتذہ کی عزت کرنا اور اُن سے کچھ حاصل کرنے کی جستجو ہم لوگوں کا شیوہ تھا۔آپ ہمیں دینیات واخلاقیات کا درس دیتے تھے۔اُن کا وضع قطع اُن کے سلوک و رویے کی طرح ہمیشہ یکساں اور معتدل رہتا تھا جس میں ایک خاموش سمندر کا سا سکوت اور سمندر ہی کی مانند گہرائی وگیرائی ہوتی تھی۔وہ ہمیشہ سفید لباس زیب تن کیا کرتے تھے۔سیدھا سا کرتا‘ چوڑی دار سے قدرے کشادہ علی گڑھی پاجامہ‘ پلے دار ٹوپی اور ناگرا جوتا‘ اُن کا مستقل لباس تھا۔ البتہ موسم کے اعتبار سے شیروانی بھی پہنا کرتے تھے جو اُن کے قدرے دراز قد پر خوب پھبتی تھی۔ وہ کم بولتے تھے مگر جو بھی بولتے تھے خوبصورت اور شگفتہ بولتے تھے۔اُن کی گفتگو ادبی لطافت اور اخلاقی اقدار کا نمونہ ہوتی تھی۔آج اُنہیں یاد کرتے ہوئے میں یہ بھی اعتراف کرنا چاہوں گا کہ اسکول میں بلاشبہ کئی مضامین پڑھائے گئے تھے مگر مجھے جو عزت ملی وہ اُسی مضمون کی وجہ سے ملی جسے آپ پڑھاتے تھے۔یعنی اُردو کی وجہ سے۔اور یہاں پر یہ قول صادق آتا ہے کہ اگر آپ کو شروع ہی میں کوئی اچھا استاد مل جائے تو وہ آپ کی پوری زندگی پر اپنے اثرات مرتب کردیتا ہے۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ ہمارے استاذ محترم اب ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر خوشی ہے کہ وہ ایسے کام کر کے گئے ہیں جس کی وجہ سے اُنہیں دین ودُنیا دونوں جگہ سرخروئی حاصل ہوگی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

○○○

دیکھے ہے جو کوئی، سو کرے ہے گہر خیال

□ ڈاکٹر جاوید حیات (پٹنہ، بہار)

اپنے خیالات وافکار، تجربات ومشاہدات اور جذبات ومحسوسات کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا انسان کی بنیادی جبلت ہے۔ بات سے بات چلے، گفتگو بند نہ ہو، یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے۔ بات جب چلتی ہے تو دور تلک جاتی ہے۔ ذات سے یہ سلسلہ شروع ہو کر کائنات تک جا پہنچتا ہے۔ یہاں تک کہ تحریر اظہار کی کئی صورتیں وجود میں آتی چلی جاتی ہیں، نجی ضرورت کے تحت مکالموں نے مراسلوں کی صورت اختیار کی اور پھر شاعری اور نثر کی مختلف اصناف وجود میں آتی چلی گئیں۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو تحریری اظہار کی اولین صورت کو ہی خط کہا گیا۔ کیونکہ خط کے معنی ہی ہوتے ہیں لکھنے کے۔ جس طرح بولنے کی ابتداء دوسروں تک اپنی بات پہنچانے کے لئے ہوئی اسی طرح خط کا آغاز بھی تحریری اظہارِ خیال کے لئے ہوا، تاکہ اس تک اپنی بات پہنچائی جاسکے جو سامنے موجود نہیں ہے، یعنی مکالمہ کو مراسلہ بنادینے کا نام خط ہے۔

ابتداء سے آج تک دنیا میں نہ جانے کتنے خطوط لکھے جاچکے ہیں اور لکھے جاتے رہیں گے، حالانکہ ٹیلی فون اور موبائیل کے اس دور میں خط لکھنے کا سلسلہ کچھ کم ہوگیا ہے لیکن یہ سلسلہ ختم نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ گفتگو کا تحریری ریکارڈ ہے اور اس کی ایک دستاویزی حیثیت قائم ہوجاتی ہے۔ ایک دستاویز جس میں کسی شخص کے اپنے ذاتی خیالات اور نجی ضروریات کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ جسے وہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ شیئر کرتا ہے۔ بظاہر اس کا تعلق دو شخص کے درمیان نجی اظہار

کے لئے ہوتا ہے، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بات ذات سے شروع ہوتی ہے اور اس میں کائنات سمٹ آتی ہے۔ مخاطب تو کوئی ایک شخص ہوتا ہے لیکن مخاطبت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ جو بھی پڑھے اس کے دل میں اتر جائے۔

خط کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا ذکر قرآن پاک میں بھی خاص طور پر موجود ہے۔

''ملکہ بولی! اے اہل دربار، میری طرف ایک بڑا اہم خط بھیجا گیا ہے۔ وہ سلیمان علیہ السلام کی جانب سے ہے اور اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ مضمون یہ ہے کہ میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ''۔ (سورہ النمل۔ آیت ۲۹ تا ۳۱)

یہاں اس بات کی وضاحت بھی موجود ہے کہ خط اہم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ خط اہم کیوں ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک اہم ترین ہستی کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ اس میں مراسلہ نگاری کے روایتی طریقوں سے الگ ہٹ کر اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے بات شروع کی گئی اور تیسرے یہ کہ خط میں دعوتِ غور وفکر دی گئی ہے۔

اس سے ایک اصولی بات یہ سامنے آتی ہے کہ جب کوئی خط کسی اہم شخصیت کی طرف سے لکھا جاتا ہے تو وہ بہت اہم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ اصول بھی سامنے آتا ہے کہ وہی خط اہم ہوتا ہے جو روایتی انداز میں نہ لکھا گیا ہو اور جس میں شخصی خانہ پری نہ کی گئی ہو۔ خط کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب اس میں دعوتِ فکر وعمل ہو۔ آج دنیا میں جو خطوط اپنی اہمیت کے اعتبار سے محفوظ کر لئے گئے ہیں، ان کو پڑھنے سے اس بات کو اچھی طرح سے محسوس کیا جاسکتا ہے کہ خط دراصل تبلیغ، افکار اور ترسیلِ خیال کی ایک ایسی صورت ہے جس میں مکتوب علیہ تک براہ راست کوئی پیغام بھیجنا مقصود ہوتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے جو خطوط آج محفوظ ہیں ان میں بھی ہمیں یہی صورت نظر آتی ہے اور پھر صوفیائے کرام کے خطوط کا مطالعہ بھی یہی بتاتا ہے کہ خط وہی اہم ہوتا ہے جہاں پیغام کی نوعیت کچھ ایسی ہو جو ذات میں کائنات کو سمیٹ لے۔ تاریخ میں

ایسے بے شمار خطوط کا ذکر ملتا ہے جو خود تاریخ ساز حیثیت رکھتے ہیں۔

اردو میں غالبؔ کے خطوط کی اسی لئے اہمیت حاصل ہے کہ انہوں نے مراسلہ کو مکالمہ بنادیا ہے۔ خط چاہے جس کو بھی لکھا گیا ہے، بات جو بھی لکھی گئی ہے، طرزِ مخاطبت بالکل نئی ہے۔ انداز بھی نرالا ہے، بات دل سے نکلتی ہے اور دل تک پہنچتی ہے۔ اقبالؔ نے بھی ایک خط کے جواب میں یہ لکھا ہے کہ ایسا ہی خط اہم ہوتا ہے کہ جس کے سخن سے دلوں کی کھیتیاں سرسبز ہوجائیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ طبیعت، درازنفسی کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔ اور روئے سخن کسی کی طرف ہو تو ایسے میں غبارِ خاطر ایک اظہار کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ ایسے خطوط ادبی نوعیت کے ہوتے ہیں، اور اس کی خاصیت واہمیت کچھ الگ نوعیت کی ہوتی ہے۔ ان کا فارم چونکہ خط کا ہوتا ہے اس لئے ان کا شمار بھی خطوط میں ہوجایا کرتا ہے۔ لیکن اصل میں خط تو وہی ہے جو کوئی فرد واحد کسی فرد واحد کو لکھے، کچھ اپنا حال سنائے، کچھ ان کی حالت پوچھے۔ جس کو لکھے اس تک پہنچے اور جو کچھ لکھے اس کی صورت، مدعا، افراط، اشتیاق کی صورت اختیار کرلے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابوالکلام کے خطوط کاروانِ خیال کی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور رہنمائے خیال بن جاتے ہیں۔ ایسے خطوط کے بے شمار مجموعے موجود ہیں۔ جو نشانِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فی الحال میرے پیش نظر ''خیابانِ خیال'' ہے جسے

دیکھے ہے جو کوئی، سو کرے ہے گُہر خیال

یہ وہ خطوط ہیں جو مولانا طیب عثمانی ندویؒ نے ان کے نام لکھے ہیں جو نہ صرف ان کے ہم عصر بلکہ ہم نفس اور ہم نوا رہے ہیں۔ طیب عثمانیؒ کا تعلق ایک عثمانی صوفی خانوادے سے رہا ہے اور اس اعتبار سے وہ عثمانی ہیں۔ ندوہ ان کی مادرِ علمی رہا ہے اس لئے ندوی بھی ہیں لیکن ان کا نام طیب ہے اور واقعی ان کی پوری زندگی طیب اور پاکیزہ رہی۔ شاید اقبال نے ایسی ہی شخصیتوں کے لئے کہا تھا کہ

دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود

اقبال کے اس شعر کو بھی ان کی ذات سے وابستہ کیا جاسکتا ہے کہ

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

پاک دل سے ہے جو آواز نکلتی ہے وہ بھی پاک ہوتی ہے۔ چنانچہ سو سے زائد مکتوبات پر مشتمل ان کے خطوط کے مجموعے میں شامل ہر خط ان مقاصد جلیل کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کا اسلوب دلنواز ہے اور خیال بھی خیابانی ہے۔ یہ ایسے خطوط ہیں کہ جن کو بھیجے گئے انہوں نے محسوس کیا کہ میری طرف ایک اہم خط بھیجا گیا ہے۔

چونکہ مولانا مرحوم کی پوری زندگی دعوتِ اسلامی کے لئے وقف تھی اس لئے ان میں سے ہر خط میں وہ ایک داعی بھی نظر آتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی خوبی ہے جو ان خطوط کو اہم بنا دیتی ہے۔ یہاں طیب عثمانیؒ کی ذات، کائنات میں خیر و خیریت دریافت کرتی نظر آتی ہے۔ خیر کی جستجو اور خیریت کی تلاش ان خطوط کا موضوع ہے۔ مخاطب الگ الگ ہیں، طرزِ تخاطب بھی الگ الگ، لیکن موضوعِ گفتگو میں وحدت ہے۔ یہ وحدت ہی ہے جو لا سے الا تک پہنچنے کا پیغام دیتی ہے۔ خط کے موضوعات وہی ہیں جو انسانی زندگی کے موضوعات ہیں، خیالات آتے چلے جاتے ہیں اور مزاج و میلانات کے اعتبار سے صورت بدلتی رہتی ہے یہاں تک کہ لکھنے والے کی فکر اور اس کی شخصیت کی جہتیں پرت در پرت نکلتی چلی جاتی ہیں کہ چراغِ دل سے ہے منور محفل۔

پہلے ہی خط پر نظر ڈالئے تو محسوس ہوتا ہے کہ مولانا گوشۂ گیر ہوتے ہوئے بھی ملکی اور بین الاقوامی سیاسی حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں، ایک داعی کی حیثیت سے وہ ان مسائل کے حل کے لئے فکر مند بھی رہے ہیں۔ چنانچہ کل ہند مسلم مجلس مشاورت کے صدر مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی سے براہِ راست مخاطبت اختیار کرتے ہیں کہ

’’کیا ان بیس برسوں کے مسلسل نا قابلِ بیان آلام و مصائب کے احساس کے باوجود کوئی متفقہ راہِ عمل مرتب کرنے اور نشانِ راہ کے تعین میں ہماری قیادت ناکام کیوں ہے؟ کیا چھ

کروڑ کی یہ ملت ذہنی و فکری اور عملی طور پر اتنی بانجھ ہوگئی ہے کہ وہ ایسی قیادت نہیں ابھار سکتی جو اس پھنسی ہوئی ملت کے لئے کوئی واضح راہِ عمل متعین کر سکے‘‘۔ (خیابانِ خیال۔ صفحہ 46)

مفتی عتیق الرحمٰن نے مسلم مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم سے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کے سیاسی حل کے لئے ایک مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنے کی ضرورت کا نہ صرف احساس دلایا بلکہ اس کے لئے کوششیں بھی کیں۔ لیکن جب یہ کوشش بار آور ہوتی نظر نہیں آتی ہے تو مولانا طیب عثمانی انہیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ

’’کسی سیاسی حل کی تلاش فضول ہے۔ ملت کی دینی، تعلیمی اور معاشی استحکام کے تعمیری پروگرام کے ساتھ فرقہ پرستوں کے خلاف کھڑا ہونا اور ملک کی اکثریت کے سوئے ہوئے ضمیر کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنا آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے‘‘۔ (خیابانِ خیال۔ صفحہ 47)

اس خط میں مولانا نے امت مسلمہ کے مسائل کے حل کے لئے جس راہِ عمل کی ضرورت کا احساس دلایا ہے وہ آج بھی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔ کیونکہ آج بھی حالات بدلے نہیں ہیں، سیاسی حل کی تمام کوششیں جاری ہیں۔ لیکن ہمارے مسائل بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں ایسے میں مولانا یہ مشورہ دیتے ہیں کہ

’’ہمارے اکابر اس موضوع پر سوچیں کہ کس طرح مسلم ملت کا رابطہ براہِ راست ہندو اکثریت کے ساتھ قائم کیا جاسکتا ہے‘‘۔ (خیابانِ خیال۔ صفحہ 47)

یہ رابطہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ خاص کر ایسے وقت میں جب دونوں کے درمیان دوری بڑھانے کی باضابطہ قواعد جاری ہے۔ براہِ راست ہندو اکثریت کے ساتھ رابطہ کی یہ کوشش بھی کی جاتی رہی ہے۔ مسلم مجلس مشاورت ہی یا پھر کسی اور سیاسی پلیٹ فارم کے ذریعہ سیاسی سطح پر ان دوریوں کو کم کرنے کیلئے اقدام بھی کئے جاتے رہے ہیں۔ لیکن مولانا طیب عثمانی صاحب کا خیال ہے کہ

’’کاش ہمارے سوچنے کے ڈھنگ میں تبدیلی ہوتی اور سیاسی و حکومتی سطح سے ہٹ کر

کسی سیاسی حل کے بجائے اخلاقی حل کی تلاش کی ہم کوشش کرتے''۔(خیابانِ خیال۔صفحہ 47)

مولانا یہ خط ایک ایسی شخصیت کو لکھ رہے ہیں جس نے اپنی پوری زندگی مسلم مسائل کے حل تلاش کرنے میں لگادی ہے۔وہ مفتی صاحب کی ان کوششوں کا اعتراف بھی کرتے ہیں لیکن ان کی ناکامیوں کے اسباب کی طرف متوجہ کرانا ضروری خیال کرتے ہیں۔

خط لکھنے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ کسی موضوع پر تبادلۂ خیال کیا جائے۔کسی نقطہ نظر سے اختلاف واتفاق کرتے ہوئے اپنے مطمح نظر کو واضح کردیا جائے،ایسا نہیں کہ

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

مولانا طیب عثمانی کا یہ پہلا خط جو''خیابانِ خیال'' میں شامل ہے وہ اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ مولانا زندگی میں مقصدیت کے قائل ہیں۔صرف یہی نہیں کہ زندگی بامقصد ہو، بلکہ زندگی کا ہر عمل اس مقصد کے حصول کے لئے ہونا چاہئے۔بے مقصد کچھ نہیں، خط لکھنا بھی نہیں۔

چنانچہ دوسرا خط جو ڈاکٹر سید عبدالباری کے نام ہے اس میں بھی مولانا کا یہی موقف سامنے آتا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ

''ایک مفروضہ ہے کہ ملت اگر سیاسی حیثیت سے منظّم ہوجائے تو اقتدار غلط ہاتھوں کے بجائے صحیح ہاتھوں میں منتقل ہوجائے گا۔اور ایک ایسی سیاسی اجتماعی طاقت فراہم ہوجائے گی جو موجودہ مطلق العنان گروپوں کی تمام سازشوں کو بے اثر بنادے گی اور اس کے لئے انفرادی اصلاح وتزکیہ سے زیادہ اجتماعی زندگی میں ایک بااثر قوت بن کر ابھرنے سے یہ مقاصد حل ہوسکتے ہیں۔اس اندازِ بیان میں سیاسی حقیقت پسندی سے زیادہ شاعرانہ خیال آرائی کو دخل ہے''۔(خیابانِ خیال۔صفحہ 51)

مولانا کا یہ خط ان کے اسی نقطہ نظر کا ترجمان ہے کہ سیاسی حل سے زیادہ مسلمانوں کی انفرادی اصلاح وتزکیہ کی ضرورت ہے۔اصلاحی کوششوں سے الگ ہٹ کر محض سیاسی کوششوں

سے مسلمانوں کے مسائل حل نہیں ہوسکتے۔یہ بات اس خط میں مولانا نے جس مضبوطی کے ساتھ رکھی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے خطوط میں جب اپنے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں تو اگر مگر سے کام نہیں لیتے۔البتہ کبھی کبھی طنز کے نشتر بھی چلادیتے ہیں۔جیسا کہ یہاں وہ سیاسی نقطہ نظر کو شاعرانہ خیال آرائی قرار دے رہے ہیں۔اس اختلاف میں مخالفت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے بلکہ دعوتِ فکر کی صورت دکھائی دیتی ہے۔

ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی اور مولانا طیب عثمانی ندوی، دونوں ایک ہی نظریہ حیات کے حامل ہیں دونوں کا ادب اور سماج کے تعلق سے ایک واضح نقطہ نظر ہے۔ایک ایسا ادبی نقطہ نظر جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ ادب کو ظلم اور خوف کی تاریکیوں کے درمیان ایک روشن چراغ کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری نبھانی چاہئے۔لیکن جب ماہنامہ''دوام'' میں ایک مدیر کی حیثیت سے عبدالباری شبنم سبحانی ہندوستانی مسلمان اور پارلیمانی سیاست کے تعلق سے اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرتے ہیں تو طیب عثمانی صاحب اپنے خط کے ذریعہ انہیں یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کا نقطہ نظر قابل عمل نہیں ہوسکتا۔خط لکھنے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ مخاطب کو اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کردیا جائے۔چنانچہ ایڈیٹر''دعوت''محمد مسلم صاحب کے نام لکھے خط میں بھی یہی نقطہ نظر ابھر کر سامنے آتا ہے۔''دعوت''اسی تحریک اسلامی کا ترجمان ہے جس سے مولانا طیب عثمانی کی وابستگی رہی ہے۔ایک دیدہ ور صحافی کی حیثیت سے محمد مسلم صاحب کی نگاہ جس طرح خبر ونظر پر رہی ،اس کا اعتراف تو انہیں بھی تھا جو نظریاتی طور پر ان کے مخالف تھے۔طیب عثمانی صاحب تو اسی نظریہ کے حامل تھے جو محمد مسلم صاحب کا تھا۔دونوں کی وابستگی ایک ہی جماعت سے تھی، سیاسی اور اجتماعی مسائل پر مولانا طیب عثمانی صاحب کے مضامین بھی اکثر دعوت میں شائع ہوتے رہے ہیں، دونوں کے درمیان ایک نقطہ اشتراک ہے۔اس کے باوجود جہاں انہیں محسوس ہوتا ہے کہ کسی موضوع پر ان کا نقطہ نظر کچھ الگ ہے تو وہ براہ راست مخاطبت اختیار کرتے ہیں اور اپنے خیالات سے مخاطب کو واقف کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔جیسا کہ پچھلے دونوں خطوں سے یہ

بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ جہاں ہر معاملہ سیاست کا ہے مولانا کا نقطہ نظر یہ ہوتا ہے کہ

مرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے ان کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد جو منظر نامہ ابھر کر سامنے آتا ہے وہاں کی عوام اور جماعتیں جس صورت حال سے دوچار ہوتی ہیں، انسانیت جس طرح سے شرمسار نظر آتی ہے، مدیر دعوت محمد مسلم کو ایک خط لکھ کر مولانا ایک ایسی ایجنسی کی ضرورت کا احساس دلاتے ہیں جو بنگلہ دیشی حکومت اور حکومتِ ہند دونوں ہی کے نزدیک قابل اعتماد ہو۔ اس سلسلے میں وہ جے پرکاش نارائن کی شانتی سینا کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ لائحہ عمل کی ضرورت کا بھی احساس دلاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

''ہم اپنے سارے وسائلِ خدمت، مالیات اور افراد دونوں ہی اس ایجنسی کے سپرد کردیں۔ اگر آپ حضرات جے پرکاش جی سے براہِ راست رابطہ قائم کر کے اپنی خدمات اس طور پر پیش کردیں کہ انہیں اس بات کا یقین آجائے کہ ہم صرف خدمت برائے خدمت اور انسانیت کے ناطے رضائے الٰہی کے لئے اس اہم انسانی مسئلے پر اپنی خدمات پیش کررہے ہیں۔ اس میں غیر بنگالی اور بنگالی کی کوئی تفریق نہیں ہوگی''۔ (خیابانِ خیال۔ صفحہ 56)

یہ وہی نقطہ نظر ہے جس کا اظہار پہلے خط میں بھی ہوا ہے، یعنی سیاسی اور حکومتی سطح سے ہٹ کر سیاسی حل کے بجائے اخلاقی حل کی تلاش کی کوشش کی جائے۔ یعنی مکتوب علیہ چاہے جو بھی ہو، مقصود ایک ہی ہے۔ چنانچہ امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث ندوی کے نام لکھے گئے خط میں بھی وہ یہی مشورہ دیتے ہیں کہ ''ہر تحریک خواہ وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، اپنے ملکی حالات اور وہاں کی طرزِ حکومت کے پس منظر میں ہی اپنا عملی نقشہ کار بناتی ہے اور بنانی چاہئے''۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جماعت کی پالیسی اور پروگرام پر نئے سرے سے غور کیا جائے اور ملک کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر بنیادی تبدیلی کی بات سوچی جائے''۔ (خیابانِ خیال۔ صفحہ 61)

جماعت اسلامی کی پالیسی میں تبدیلی کی اس ضرورت کا احساس وہ ڈاکٹر احمد سجاد کے

نام لکھے گئے خط میں بھی کرتے ہیں۔ احمد سجاد جماعت اسلامی کے ایک ذمہ دار ہیں اور طیب عثمانی خود بھی اسی جماعت کے رکن ہیں۔ اس کے باوجود وہ یہ لکھتے ہیں کہ

''موجودہ ہندوستان میں دین کو سیاسی انداز میں پیش کرنا اور سیاسی غلبہ کی باتیں کرنا، اسلامی انقلاب، اسلامی حکومت اور تحریک اسلامی کو غالب کرنے کی جدوجہد وغیرہ جیسے الفاظ اور اصطلاحیں خواہ سننے میں کتنا ہی فردوس گوش ہو اور سادہ دل مسلمان نوجوانوں کے لئے چاہے باعثِ کشش ہو، یہ اندازِ گفتگو اور ایسی حکمت، دین کے بالکل خلاف ہے''۔ (خیابانِ خیال۔ صفحہ 64)

یہ باتیں جماعت اسلامی کا ایک رکن جماعت کے دوسرے رکن سے کہہ رہا ہے اور یہ باتیں جماعت کے دستوری نقطہ نظر سے بالکل الگ ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں نکلتا ہے کہ مولانا جماعت کے نقطہ نظر کے مخالف ہیں، اگر مخالف ہوتے تو جماعت چھوڑ چکے ہوتے، لیکن انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ ملک کی جمہوری فضا میں نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ یہ حکمتِ عملی کیا ہو، اس پر بھی اس خط میں بھرپور طریقے سے روشنی ڈالی گئی ہے ان کا خیال ہے کہ

''ہندوستان جیسے وسیع مذہبی ملک میں دینی جدوجہد اور کام کے لئے صوفیائے کرام کے عملی نمونوں سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے لئے حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کی زندگی اور کام سے آج کے حالات کے مطابق روشنی حاصل کی جاسکتی ہے''۔ (خیابانِ خیال۔ صفحہ 64)

تصوف کی اہمیت آج عالمی سطح پر محسوس کی جارہی ہے جس طرح کسی رقیق کو جس برتن میں رکھ دیا جاتا ہے اسی کی ہیئت اختیار کرلیتا ہے۔ تصوف کی صورت بھی کچھ ایسی ہی ہے، اس میں جس کسی نظریہ کو رکھ دیا جاتا ہے وہ اسی کی صورت میں ڈھل جاتا ہے، چنانچہ طیب عثمانی صاحب نے اس سلسلے میں مزید وضاحت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ تصوف کا کونسا عملی نمونہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔

''اندازِ فکر بدل لئے اور دشمن کو دوست بنائے''۔ یہی ان کا موقف رہا ہے اور اس کا اظہار

وہ مختلف مضامین میں کرتے رہے ہیں۔قاضی ضمیر الحسن صاحب لکھنو کے نام لکھے اپنے ایک خط میں وہ ایسے ہی ایک مضمون کے حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہیں جو افکار ملی دہلی میں شائع ہوا تھا اور ملت کے مختلف روزناموں نے اسے بار بار شائع کیا تھا اپنے اس مضمون کے حوالے سے بھی مولانا نے قاضی صاحب کو اپنے اسی موقوف سے آگاہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

”کاش اب بھی ہمارا انداز نظر بدلے اور اس مضمون کے نکتے ہماری زندگی میں بار آور ثابت ہوں تاکہ ہم اس ملک کی ضرورت بن جائیں اور آج کے دشمن کل کے ہمارے جگری دوست ہو جائیں۔اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے“۔ (خیابانِ خیال۔صفحہ 68)

مولانا طیب عثمانی کی پوری زندگی مثبت ”افکار و اقدار“ کی ترجمان رہی ہے۔سیاسی اور اجتماعی مسائل پر بھی گہری نظر رہی ہے۔”نقیب“ پھلواری شریف، روزنامہ ”دعوت“ دہلی اور ماہنامہ ”افکار ملی“ دہلی جیسے رسالوں میں ان کے جو مضامین شائع ہوتے رہے ہیں ان کی حیثیت ”صحرا میں اذان“ کی سی ہے۔انہیں پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ملت کی سیاسی اور ملی صورت حال کے تعلق سے مولانا کا ایک واضح نقطہ نظر تھا۔اکثر یہ نقطہ نظر خود ان کے حلقہ احباب اور ارکان جماعت سے الگ ہوتا تھا۔چنانچہ جماعت اسلامی کے رکن مجلس شوریٰ حلقہ بہار جناب نسیم احمد صاحب کے نام لکھا گیا جو خط اس انتخاب میں شامل ہے۔اس میں وہ اپنے مضامین کے تعلق سے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

”میرے مضامین کی اصل روح یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ہماری ملت کا مجموعی رویہ جارحانہ کے بجائے مصالحانہ اور حکیمانہ ہو“۔ (خیابانِ خیال۔صفحہ 69)

جمہوریت میں افراد کے درمیان نقطہ نظر کا اختلاف تو ہوتا ہے لیکن اجتماعی سطح پر ایک اتفاق رائے بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔مولانا بھی ذاتی سطح پر اپنے احباب اور حلقہ کے افراد سے الگ اپنا ایک واضح موقف رکھتے تھے اور اب تک جن خطوط کا حوالہ میں نے پیش کیا ہے ان سب کا مطالعہ ان کے اسی موقف کو سامنے لانا ہے۔مولانا کا یہ موقف صرف ملکی اور ملی مسائل تک

محدود نہیں ہے۔ادب کے تعلق سے بھی ان کا ایک واضح نقطہ نظر رہا ہے۔وہ ادب میں بھی ”افکار و اقدار“ کی اہمیت پر زور دیتے رہے ہیں۔ماہنامہ ”نئی نسلیں“ لکھنؤ اور ماہنامہ ”پیش رفت“ دہلی کے حلقہ ادارت میں شامل ہو کر اس کے لئے اداریئے وہ لکھتے رہے ہیں۔اور ان اداریوں کا مجموعہ ”ادبی اشارے“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ان کا خیال ہے کہ ادب برائے زندگی کے ساتھ ساتھ زندگی برائے بندگی کا تصور بھی ضروری ہے۔ادب اور کائنات، ادب اور انسان، ادب اور زندگی، ادب اور خدا، ادب اور نبوت جیسے موضوعات پر انہوں نے ان رسائل میں بڑی فکر انگیز بحثیں کی ہیں جو آج بھی معنی خیز ہیں۔تعمیری فکر و نظر، ادبی توازن اور فن کی توانائی کے ساتھ وہ ادب کو ایک نئی جہت اور نیا رخ دینا چاہتے ہیں۔یہاں بھی ان کا نقطہ نظر یہی ہے کہ ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت نے ادب کی دنیا میں جو بے سمتی اور انتشار و فشار پیدا کیا ہے اس کے تدارک کی ضرورت ہے۔اپنے مختلف خطوط میں بھی انہوں نے اپنے ادبی نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے، چنانچہ علی گڑھ سے شائع ہونے والے معروف رسالہ ”نئی نسلیں“ کے مدیر انجم نعیم کو ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ ”ترقی پسندی اور جدیدیت کے بالمقابل ہمیں واضح تیسری راہ نکالنی چاہئے“۔ (خیابانِ خیال۔صفحہ 88)

ادب کے سلسلے میں کیا نقطہ نظر اپنایا جائے اس کے تعلق سے بھی مولانا کے مختلف خطوط ہیں، جن کو ”علمی و ادبی خطوط“ کے نام سے ایک الگ باب کی صورت میں یکجا کر دیا گیا ہے۔اس سے پہلے جن خطوط کا ذکر کیا گیا ہے اسے ”ملی و اجتماعی خطوط“ کے نام سے پہلے باب کی صورت میں یکجا کیا گیا تھا۔اس کے علاوہ کئی دوسرے خطوط ہیں جنہیں موضوعاتی عنوانات کے تحت الگ الگ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس سے ایک آسانی یہ ہوگئی ہے کہ مختلف خطوط کی نوعیت و اہمیت کے ساتھ ساتھ ان کے موضوعات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

بہر حال جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ علمی و ادبی موضوعات کے تحت جو خطوط شامل کئے گئے ہیں وہ طیب عثمانی صاحب کے ادبی نقطہ نظر کے ترجمان ہیں، ادب میں اپنے موقف کا اظہار

کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ

''ضرورت ہے کہ آج ادب میں براہ راست ایمان ویقین کی بات کی جائے اور اخلاقی و روحانی اندازِنظر کے ساتھ ایک جامع نظریہ ونظامِ اقدار اور کامل نظامِ حیات کا مژدہ سنایا جائے۔خود شناسی کے ساتھ جہاں شناسی اور خدا شناسی آج کے انسان کی اپنی ضرورت ہے''۔ (خیابانِ خیال۔صفحہ 104)

کیا یہ وہی نقطہ نظر نہیں ہے جسے ہم ملی واجتماعی خطوط میں دیکھ چکے ہیں یعنی یہ کہ اخلاقی اور روحانی قدروں کا فروغ مولانا کا بنیادی نقطہ نظر ہے۔اور وہ اسے زندگی کے ہر شعبے میں رائج کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ تیسرے باب میں ''تعزیتی و دینی'' خطوط کے عنوان کے تحت جن خطوط کو جمع کیا گیا ہے اس میں یہ نقطہ نظر زیادہ واضح نظر آتا ہے۔ راجندر اگیری کلچر یونیورسٹی پوسا کے پروفیسر سید حبیب حق کے والد محترم ڈاکٹر ایس اے حق کے انتقال پر ملال پر لکھے گئے تعزیتی خط میں جہاں صبر وسکون کی تلقین کی گئی ہے وہیں وہ بات ہی بات میں وہ بات کہہ جاتے ہیں جن سے زندگی سنورتی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

''ہر فکر وغم آج کی پیچیدہ زندگی میں نت نئے احوال، واقعات کے تناظر میں جو پیش آتے رہتے ہیں جس سے انسان شدید طور پر جھنجھلاہٹ اور تناؤ محسوس کرتا ہے ان سب کا علاج خدا کی یاد ہے۔ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کی عملی شکل نماز ہے کبھی عقل کو تنہا چھوڑ کر عشق کو اپنا رہنما بناتے ہوئے اپنی جبین نیاز کو اس کے حضور میں جھکا کر دیکھیے تو شاید کسی نئی لذت اور دائمی سکون سے آشنائی ہو''۔ (خیابانِ خیال۔صفحہ 173)

باب چہارم میں گھریلو ومتفرق خطوط جمع کر دیئے گئے ہیں۔ان خطوط سے جہاں خانگی زندگی سے واقفیت حاصل ہوتی ہے وہیں ان کے حلقہ احباب سے بھی ہم واقف ہوتے ہیں، جن میں وہاب اشرفی بھی شامل ہیں اور احمد سجاد بھی ۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی بھی شامل ہیں اور ستیارام رانا بھی۔عبدالطیف اعظمی بھی ہیں اور کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر مشیر الحق بھی۔ان

سب کے نام جو خطوط لکھے گئے ہیں وہ گرچہ ذاتی نوعیت کے ہیں۔ایک ذات کا اظہار دوسری ذات کے لئے لیکن اظہارِ ذات میں بھی کائناتی تیور موجود ہے۔ چنانچہ ایک خط جو انہوں نے اپنے بھانجے سید حسیب ابدالی کے نام لکھا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ

''میرے پیارے بیٹے! تم ابھی کم عمر ہو یہ زمانہ مطالعہ اور حصول علم کا ہے۔اپنی تمام تر توجہ علم کے حصول میں لگا دو، یہ دور علم، سائنس اور ٹکنالوجی کا ہے۔ جاہلیت علم کے اسلحوں سے آراستہ ہے، اہل دین کو علمی تیاری کے ساتھ عملی زندگی میں قدم بڑھانا چاہئے تبھی ہم تحریک اسلامی کے مقاصد کو کامیابی تک پہنچا سکیں گے''۔(خیابانِ خیال۔صفحہ 193)

تحریک اسلامی کے مقاصد اور نصب العین سے وابستگی ان کی زندگی کا وہ پہلو ہے جس سے کبھی وہ دست بردار نہیں ہوئے۔لیکن ہر قدم پر انہوں نے اعتدال وتوازن کو اپنایا اور لوگوں کو بھی اسی کی تلقین کی کہ اعتدال وتوازن سے کام لیں۔جیسا کہ پچھلے تمام خطوط کے اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔اسی خط میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''تم کو اپنے وقت کا بڑا حصہ اپنے تعلیمی مقاصد کی تکمیل میں لگانا چاہئے ۔۔۔۔۔۔۔ یہ وقت ہر طرح کی تیاری کا ہے۔محدود اوقات اور مشکل حالات میں اپنے تمام فرائض اعتدال وتوازن کے ساتھ ادا کرنا چاہئے''

(خیابانِ خیال۔صفحہ 193)

یہ خط اپنے ایک عزیز کے نام لکھا ہے۔اندازِ تخاطب مشفقانہ ہے خیریت دریافت کی گئی لیکن خیر کا پیغام بھی ہے۔

مولانا طیب عثمانی کے تمام خطوط میں ہمیں خیریت کی دریافت کے ساتھ خیر کا پیغام دینے کا انداز ملتا ہے۔طرزِ تخاطب بدلتا ہے، اندازِ تخاطب تبدیل ہوتا ہے موضوعات بھی بدلتے ہیں لیکن مطمحِ نظر نہیں بدلتا۔نقطہ نظر نہیں بدلتا، وحدت جھلکتی ہے۔وحدانیت اور روحانیت کا پیغام ہر خط میں موجود نظر آئے گا۔

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، مولانا طیب عثمانی کے بڑے بیٹے ہیں۔مولانا نے بھی اپنے والد

محترم شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی کے مکاتیب کو یکجا کر کے اسے ''نقشِ دوام'' عطا کیا تھا اور رشاد عثمانی نے بھی اپنے والد محترم مولانا طیب عثمانی کے خطوط کو ''خیابانِ خیال'' کے نام سے یکجا کر دیا ہے۔خطوط کے یہ دونوں ہی مجموعے اپنے اپنے عہد کے افکار و مسائل کے سچے ترجمان ہیں۔

شاہ رشاد عثمانی نے جب اپنے والد محترم کی ایک کتاب ''ادبی اشارے'' کی ترتیب و اشاعت کا بڑا اہم کام کیا تھا تو اس پر ایک باپ کے دل سے یہ دعائیں نکلی تھیں کہ ''اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کی عمر میں برکت دے اور آئندہ ادب کی دنیا میں ان کے مراتب بلند فرمائے''۔(ادبی اشارے۔صفحہ 33)

کہا جاتا ہے کہ باپ کی دعا اولاد کے حق میں جو ہوتی ہے وہ قبول ہوتی ہے اور اس کی قبولیت کی عملی صورت ہم دیکھ رہے ہیں۔شاہ رشاد عثمانی نے بلاشبہ ادب کی دنیا میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی ہے۔والدین کی تربیت اور دعائیں ان کی زندگی میں بار آور ہوتی ہیں۔اس کا نمونہ رشاد عثمانی کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔

رشاد عثمانی کے نام بھی اس خیابانِ خیال میں کئی خطوط شامل ہیں۔ایک باپ کا خط بیٹے کے نام جذبات بھی ہیں افکار بھی، تربیت بھی، تعلیم اور ہدایت بھی، گھریلو باتیں بھی ہیں اور بیٹے کے لئے فکرمندی بھی۔سو سے زائد خطوط پر مشتمل اس ''خیابانِ خیال'' میں ۱۴ خطوط ایسے ہیں جو رشاد عثمانی کے نام لکھے گئے ہیں۔جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے ان میں ملی اور اجتماعی مسائل پر رہنمائی بھی ملتی ہے اور علمی و ادبی موضوعات پر اظہارِ خیال بھی۔اس کے علاوہ دیگر متفرق باتیں بھی ملتی ہیں۔لیکن ان سب کا تعلق رشد و ہدایت سے ہے۔ان کے سامنے قرآن کی یہ ہدایت موجود ہے کہ

''جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور ان کی اولاد بھی کسی درجہ ان کے نقشِ قدم پر چلتی ہے۔ان کی اس اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے (جنت میں) اور ان کے عمل میں ذرا بھی کمی نہیں کریں گے''۔(سورہ الطّور۔آیت ۲۱)

رشاد عثمانی کو لکھے گئے خطوط میں یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ ان کی اولاد بھی ان کے نقشِ قدم پر چلے۔شاہ رشاد عثمانی ادب کے طالب علم رہے ہیں۔ایسے میں ان کے نام لکھے گئے خطوط میں زیادہ تر ادب کے حوالے سے گفتگو ملتی ہے۔چنانچہ ''تعبیر و تشکیل'' کے نام سے رشاد عثمانی کی کتاب جب منظرِ عام پر آئی۔باپ کی نگاہِ شوق نے پوری کتاب پر نظر ڈالی اور یہ رائے دی کہ

''کتاب حسنِ ظاہر کے ساتھ اپنی معنویت میں لائقِ اعتبار ہے''۔(خیابانِ خیال۔صفحہ 160)

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی کہ

''یہ وہ منزل ہے جہاں رکنا نہیں ہے۔اس راہ پر مزید آگے بڑھنے کے لئے مطالعہ کی وسعت اور علمی گہرائی و گیرائی کی ضرورت ہوتی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان کا ادب عالیہ تمہارے پیشِ نظر رہنا چاہئے''۔(خیابانِ خیال۔صفحہ 160)

یہ پورا خط باپ کی محبت، شفقت اور ہدایت سے بھرپور ہے اس میں ادب کے طالب علموں کے لئے نشانِ راہ بھی موجود ہے۔یہ مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے، مگر دل ہے کہ مانتا نہیں ''خیابانِ خیال'' میں شامل ہر خط سے اقتباس دینے کو جی چاہتا ہے، مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ ''پڑھنا شروع کیا تو نہ کھانے کا خیال تھا اور نہ سونے کا۔محمد علی کی کہانی تھی اور آپ کی زبانی۔بس لطف آ گیا، ناول کا مزہ آیا، کہیں پڑھتے پڑھتے رو دیا اور کہیں ہنس دیا۔کتاب کاہے کو ہے پھولوں کا ایک گلدستہ ہے عجب باغ و بہار ہے''۔

''خیابانِ خیال'' کو پڑھتے ہوئے مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوا کہ پھولوں کا گلدستہ ہے عجب باغ و بہار ہے۔اسلوب بیان کی دل کشی، زبان کی سادگی، قلم کی روانی، فکر و خیال کی بلندی ان خطوط کو خیابانِ خیال بنا دیتی ہے۔ان خطوط کی خوبی یہی ہے کہ جن کو یہ لکھے گئے انہوں نے بھی محسوس کیا کہ میرے نام ایک اہم خط آیا ہے اور اب اس انتخاب کی صورت میں جو بھی ان

کو پڑھے گا اسے بھی یہی محسوس ہوگا کہ یہ خطوط واقعی خیابانِ خیال ہیں۔

جہاں تک ان خطوط کی ادبی اہمیت کا تعلق ہے ان کی اہمیت یہ ہے کہ ان میں تخلیق کا ایک نیا منظر نامہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ان کی روشنی میں ادب کا ایک نیا منشور تیار کیا جا سکتا ہے ایک ایسا منشور جو ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے آگے ایک صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ زبان و بیان کی سادگی اور براہِ راست مخاطبت دلوں کو چھو لیتی ہے، اقبالؔ کی زبان میں اگر کہیں تو

اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم
اس کا سرور، اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز

ہر تحریر شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ ان خطوط کو پڑھتے ہوئے میرے سامنے ان کی شخصیت، ان کا مزاج، ان کا کردار، ان کا خیال، ان کا نظریہ سب کچھ سامنے دکھائی دے رہا ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اس شخصیت کو بہت قریب سے دیکھنے، سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ میں نے دیکھا جیسا کچھ محسوس کیا ہے ہو بہو ویسا ہی عکس ان خطوط میں دکھائی دے رہا ہے۔

سلسلۂ روز و شب ۔ تارِ حریرِ دو رنگ   جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

○○○

مولانا طیب عثمانی ندوی: ادب اسلامی کے ایک ستون

❑ محمد عارف اقبال (نئی دہلی)

خانقاہی نظام کے تربیت یافتہ جیّد عالم دین، معروف ادیب اور صحافی مولانا طیب عثمانی ندوی 29 ستمبر 2015 کو فجر کے قریب انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال سے ادارہ ادب اسلامی کا ایک ستون اور گر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا طیب عثمانی کی شخصیت نہ صرف ایک عالم دین کی حیثیت سے معروف تھی بلکہ اپنے ادبی اور دینی و لسانی مضامین سے انہوں نے نوجوانوں کی ذہن سازی میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ پیری، مریدی والے خانوادہ سے تعلق رکھنے کے باوجود انہوں نے اپنی الگ راہ نکالی۔ درس و تدریس کو ترجیح دی اور علم و ادب سے اپنے تعلق کو تاحیات استوار رکھا۔

مولانا طیب عثمانی کی ولادت ضلع اورنگ آباد (بہار) کے سملہ گاؤں میں 30 ستمبر 1930 کو ہوئی تھی۔ ان کے والد شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی سملہ کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ آباو اجداد پانی پت سے آئے تھے، بہار میں کئی سو سال سے ان کا خاندان آباد تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے وہ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں 1942 میں داخل ہوئے اور 1952 میں سندفضیلت امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ اس کے بعد وہ جدید تعلیم کی حصولیابی میں دو سال تک مشغول رہے۔ ندوہ میں مولانا سیّد سلیمان ندوی کے صاحبزادے مولانا سلمان ندوی ان کے ہم سبق تھے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد 1954 سے وہ ادب اور صحافت کے میدان میں داخل ہوئے۔

چند ماہ کلکتہ کی صحافتی سرگرمیوں میں پورے انہماک سے حصہ لیا اور آزاد صحافی کی حیثیت سے روز نامہ 'عصر جدید'، 'الحق' اور دیگر کئی روز ناموں میں اداریے اور صحافتی کالم لکھتے رہے۔ ان صحافتی تجربات سے انہیں بڑا فائدہ یہ ہوا کہ 10 جنوری 1954 کو پھلواری شریف (امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ) کے مشہور ہفتہ وار اخبار 'نقیب' میں مدیر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ وہاں وہ 31 جولائی 1955 تک صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔ فروری 1954 میں لکھنؤ سے معروف افسانہ نگار و ادیب م نسیم (مرحوم) کی ادارت میں ادبی ماہنامہ 'نئی نسلیں' کا اجرا ہوا تو اس سے وہ بحیثیت معاون مدیر منسلک ہو گئے اور تقریباً پانچ برسوں تک اس رسالہ میں ادبی اداریے لکھتے رہے۔ 1963 میں تاریخی شہر گیا سے ایک سہ ماہی رسالہ 'صدف' معروف وممتاز نقاد پروفیسر عبدالمغنی (مرحوم) کے اشتراک سے نکلا جس کی ملک کے ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ اپنی ادبی و علمی سرگرمیوں کے ساتھ طیب عثمانی مرحوم نے پیشہ معلّمی سے شغف ہونے کی وجہ سے 1957 میں گیا کے ہادی ہاشمی ہائی اسکول میں اردو، فارسی کے معلم کی حیثیت سے ملازمت بھی اختیار کر لی تھی جہاں سے وہ 1988 میں سبکدوش ہوئے۔ مولانا عثمانی کا ایک میدان خدمت خلق بھی تھا۔ ان کا شمار ملت ہاسپٹل، گیا کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ وہ ملت کے نونہالوں کے لیے عصری کے ساتھ دینی تعلیم ناگزیر خیال کرتے تھے۔ لہٰذا اقرا پبلک اسکول، گیا اور شتابدی پبلک اسکول، گیا کا منصوبہ مولانا ہی نے بنایا تھا۔ مولانا مرحوم اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں تحریک اسلامی سے متعارف ہوئے اور رکن کی حیثیت سے تاحینِ حیات اقامتِ دین کی جدوجہد میں مصروف رہے۔ پروفیسر محسن عثمانی ندوی کے بقول علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کا ادبی ذوق، مولانا ابوالحسن علی ندوی کا اسلوب اور دعوتی مزاج اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک، یہ وہ عناصر تھے جن سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی۔

مولانا طیب عثمانی ادب اور صحافت کے میدان میں بے حد متحرک اور فعال رہے۔ ملک و بیرون ملک کے رسائل و مجلّات میں ان کے ادبی و صحافتی مضامین مسلسل شائع ہوتے

رہے۔ ان مضامین کا ایک انتخاب 'صحرا میں اذان' کے نام سے شائع ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے۔ اسی طرح 'نئی نسلیں' (لکھنؤ) اور 'پیش رفت' (دہلی) میں لکھے گئے ان کے ادبی اداریوں کا مجموعہ 'ادبی اشارے' کے نام سے منظر عام پر آیا جو اپلائڈ پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس سے قبل ان کی ایک کتاب 'سفرنامہ حرمین شریفین' اردو بک ریویو، نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع ہو چکی تھی۔ ان کی دیگر تصانیف میں رسول اکرمؐ، نقش دوام، حیات دوام، افکار و اقدار، اقبال شخصیت اور پیام، اسلامی معاشرہ شامل ہیں۔

مولانا طیب عثمانی نے اپنی بے پناہ دینی، ملّی، لسانی، ادبی اور صحافتی صلاحیتوں سے صالح معاشرہ اور صحت مند ادب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تحریر میں شائستگی، شگفتگی اور سلاست کے عنصر نمایاں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے اداریے، تبصرے، تجزیے اور مضامین میں قارئین گہری دلچسپی لیتے تھے۔

مولانا طیب عثمانی ندوی سے میری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جبکہ وہ حج کے لیے عازم سفر ہوئے۔ اس وقت دہلی میں ان کے صاحبزادے ڈاکٹر رشاد عثمانی سہ روزہ دعوت کے شعبہ ادارت سے وابستہ تھے۔ رشاد عثمانی صاحب سے میری تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی تھی اور فکری ہم آہنگی کے سبب وہ دہلی میں میرے قریبی رفقا میں تھے۔ مولانا طیب عثمانی نے حج کی سعادت کے بعد 'سفرنامہ حرمین شریفین' تحریر کیا۔ یہ طیب عثمانی صاحب کی محبت تھی کہ انہوں نے اپنی کتاب اشاعت کے لیے مجھے مرحمت فرمائی۔ یہ کتاب اردو بک ریویو، نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کی دوسری کتاب 'ادبی اشارے' بھی 2002 میں اشاعت کے لیے مجھے ہی ملی۔ ان سے اگرچہ ملاقات اور گفتگو کا موقع بہت کم ملا لیکن ان کی تحریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ خانقاہی ماحول کے پروردہ ہونے کے باوجود ان کی انقلابی فکر نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ 'ادبی اشارے' میں مولانا مرحوم کی تحریروں کے دو اَدوار ہیں۔ پہلا دَور 1954 سے 1958 تک کا ہے۔ ماہنامہ نئی نسلیں، لکھنؤ میں تحریر کردہ ان کے اداریے جن عنوانات کے تحت

لکھے گئے ان میں ادب اور کائنات، ادب اور انسان، ادب اور زندگی، ادب اور خدا، ادب اور نبوت، ادب اور آخرت، اسلوب اور ہیئت، اسلامی ادب کیا ہے؟ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان اداریوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ 24 سال کی عمر میں مولانا کی تحریر میں بانکپن کے ساتھ شعوری پختگی بھی موجود تھی۔اس کا بنیادی سبب ڈاکٹر عبدالباری (مرحوم) یوں بیان کرتے ہیں:

''حضرت طیب عثمانی کی تحریروں میں مولانا مودودیؒ کی انقلاب آفریں فکر اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لیے ان کی کاوشوں کی جھلک نظر آتی ہے۔طیب عثمانی نے تنقید کے اصول قرآن وحدیث سے اخذ کرنے کی سعی مبارک کی ہے۔انہیں قرآنی علوم کے گہرے مطالعے اور پختہ ایمان ویقین کی بدولت غیر معمولی خوداعتمادی اور محکم اندازِ بیان کی دولت حاصل ہے۔''

مولانا طیب عثمانی ندوی نے جس زمانے میں 'نئی نسلیں' کے لیے مذکورہ اداریے تحریر کیے اس سے دوسال قبل (مارچ 1952) الہ آباد کے ترقی پسند ادیبوں کی ایک مجلس میں یہ بحث کی جارہی تھی کہ ادب کی تخلیق میں جنسی لٹریچر کے بغیر نئی نسل کو ادب سے روشناس کرانا شاید ممکن نہیں۔اس ادبی مجلس کے ایک اہم رکن اور معروف شاعر وادیب اسرار ناروی (ابن صفی) ترقی پسند ادیبوں کی اس بحث کو بغور سن رہے تھے۔ابن صفی نے لکھا ہے کہ ''اس مباحثے میں ایک بزرگ کا خیال تھا کہ اردو میں صرف جنسی کہانیاں ہی مارکیٹ بنا سکتی ہے (ان دنوں سچ مچ اردو میں ایسی کہانیوں کا سیلاب آیا ہوا تھا)۔میں ان بزرگ سے اتفاق نہ کرسکا۔میرا خیال تھا کہ اگر سوجھ بوجھ سے کام لیا جائے تو اور بھی راہیں نکل سکتی ہیں— 'کچھ اور بھی کرنا چاہیے'— کا مطالبہ بالآخر پورا ہوگیا۔''

اسرار ناروی جب مارچ 1952 میں ابن صفی کے نام سے معروف ہوئے تو تخلیقی ادب میں ایک انقلاب آچکا تھا۔ابن صفی نے اپنے ایک ناول 'لاشوں کا بازار' (ستمبر 1956) کے 'پیش

رس' میں اپنے ناول کے ایک آئیڈیل کردار فریدی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''...مجھے یہ دُھن سوار ہوگئی کہ کسی طرح جنسی لٹریچر کا سیلاب رکنا چاہیے۔''

ابن صفی نے اردو ادب کو نہ صرف جنسی کجروی، ہوس پرستی اور تاریک مستقبل کے خواب ناک افیون سے نجات دلائی بلکہ متبادل کے طور پر منفرد مقصدی ادب کو پیش کیا جس کے ذریعے انہوں نے سماج کو ظلم وجبر اور مایوسی سے نکلنے کی راہ دکھائی اور قانون کا احترام کرنا سکھایا، جرائم سے پاک سماج کا تصور پیش کیا۔انہوں نے اپنے ایک ناول 'مہلک شناسائی' (نومبر 1968) کے 'پیش رس' میں لکھا ہے:

''مستقبل سے مایوسی غلط فہمی کی پیداوار ہے اور آدمی کو جرائم کی طرف لے جاتی ہے۔مستقبل سے مایوس ہوکر یا تو آدمی جرائم کرتا ہے یا پھر کسی ایسے کرنل فریدی کی تلاش میں ذہنی سفر کرتا ہے جو قانون اور انصاف کے لیے بڑے سے بڑے چہرے پر مُکّا رسید کرسکے۔''

ابن صفی کو جب اپنے تعمیری تخلیقی رجحان اور اقدار پر مبنی ادب کے سبب ترقی پسند ادیبوں نے تنگ کرنا شروع کیا اور طنزاً ان پر یہ فقرہ چست کیا کہ 'ادب کی بھی کچھ خدمت کروں' تو ابن صفی نے جواب دیا: ''ان کی دانست میں شاید مَیں جھک مار رہا ہوں، حیات وکائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو۔لیکن میرا طریق کار ہمیشہ عام روش سے الگ تھلگ رہا ہے...''

اپنے انتقال سے دس برس قبل ابن صفی سے مختلف قسم کے 'ازموں' کے بارے میں سوالات کیے جارہے تھے کہ وہ کس ازم کے قائل ہیں۔بالآخر انہوں نے واضح طور پر اپنے ناول 'پاگلوں کی انجمن' (جون 1970) میں لکھا: ''ببانگ دہل کہہ چکا ہوں کہ معاشرے میں اللہ کی ڈکٹیٹرشپ چاہتا ہوں۔''

غور وفکر کا مقام ہے کہ ابن صفی نے تخلیقی ادب کے ذریعے اردو دنیا میں گراں قدر

خدمات انجام دیں۔ اللہ کا دین تو معاشرے پر ہی نافذ ہوتا ہے اور وسیع معاشرے کے مختلف شعبے ہوتے ہیں۔ خالقِ کائنات اپنے بندوں میں سے جس سے بھی چاہتا ہے اپنی رضا کی تکمیل کرالیتا ہے۔

ایک طرف مولانا طیب عثمانی ندوی ’نئی نسلیں‘ کے توسط سے ایک اہم محاذ پر ادب کی دنیا میں روشن فکر کے چراغ جلا رہے تھے تو دوسری طرف ابن صفی اقدار پر مبنی منفرد تخلیقی ادب کے ذریعے معاشرے میں جنسی سیلاب کو روکنے کی کامیاب کوشش کر رہے تھے۔ دنیا جانتی ہے کہ ابن صفی کی تحریروں کو پڑھنے والوں میں ایسی مثبت فکری تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ انھی میں سے سماج کو تعمیری اور انقلابی نہج دینے والے افراد پیدا ہوئے جنھوں نے معاشرے میں مثبت اور تعمیری کام انجام دینے کا بیڑہ اٹھایا۔ ان میں معاشرے کے جملہ شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔

’ادبی اشارے‘ میں مولانا طیب عثمانی کے وہ اداریے بھی شامل ہیں جو تقریباً 50 برسوں کے بعد ماہنامہ پیش رفت، دہلی کے لیے لکھے گئے۔ 1995 تا 2001 کے دوران میں شائع ہونے والے یہ اداریے اپنے عنوان کے لحاظ سے جہاں وسعت رکھتے ہیں وہیں ان کے قلم کی پختگی میں بتدریج اضافہ ہوا ہے لیکن ان کی انقلابی فکر میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ ان اداریوں کے چند عنوانات ملاحظہ کیجیے: ادب میں اظہارِ خیال کی آزادی، ادب اور جمالیات، ادب اور عقیدہ و اقدار، ادب اور تہذیب، ’ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت‘، اردو ادب کی روایات اور اسلامی ادب، اردو ادب میں جدید ترین رجحان، ادب کی اسلامی قدریں، اطلاعاتی تکنالاجی اور اسلامی ادب، اسلامی ادب کیوں نہیں؟ وغیرہ۔

ادب میں طریق کار کے لحاظ سے مولانا طیب عثمانی ندوی کی بعض آرا سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے بے باک اور بصیرت افروز خیالات اور خدمات ناقابل انکار حقیقت ہیں۔ وہ جس محاذ پر ڈٹے ہوئے تھے وہ خالصتاً ادیبوں اور نقادوں کی دنیا تھی۔ ان میں ڈاکٹر ابن

فرید، اسعد گیلانی، نعیم صدیقی، ڈاکٹر عبدالمغنی، م نسیم، حفیظ میرٹھی بھی تھے۔ اس کتاب میں شامل ایک مضمون ’اردو ادب میں جدید ترین رجحان‘ میں مولانا عثمانی نے خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے ایک سیمینار میں پروفیسر وہاب اشرفی کے خطبہ پر بڑے دانشورانہ انداز سے گرفت کی ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے: ’’واقعہ یہ ہے کہ یہ پورا خطبہ افکار پریشاں اور ’حدیث خرافات‘ کا بہترین نمونہ ہے۔‘‘ ہندوستان میں ڈاکٹر ابن فرید اور ڈاکٹر عبدالمغنی مرحوم کے بعد مولانا طیب عثمانی ندوی کا شمار ادب کے ان معماروں اور نقادوں میں ہوتا ہے جنھوں نے تا حیات ادب کو اشتراکی و استعماری ادیبوں و نقادوں سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں داخل فرمائے۔ آمین!

○○○

مولانا طیب عثمانی ندوی: ادیب، مفکر اور متحرک صوفی

❑ ڈاکٹر وقار انور (نئی دہلی)

تصوف کے دانائے راز کو 'متحرک' کہنا شاید آج کے زمانے میں نا قابل اعتبار یا کم از کم نا قابل فہم سمجھا جائے گا، لیکن طیب عثمانیؒ تصوف کے جس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے وہاں بیعت ارشاد و اصلاح کے ساتھ بیعت جہاد کا طریقہ رائج تھا۔ وہ ایک طرف شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، محمد اقبال اور سید مودودی کے افکار و نظریات سے متاثر تھے اور دوسری طرف اپنے استاد سید ابوالحسن علی ندوی کی طرف قلبی طور پر مائل تھے۔ اس ظاہری تضاد اور اس کی تطبیق انھوں نے ندوۃ العلماء کے دوران تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے یوں کی ہے۔ اقتباس درج ذیل ہے:

> ''ندوہ کے ماحول میں تبدیلی آ رہی تھی یا کی جا رہی تھی۔ فکر شبلی پر ذوق رحمانی چڑھانے کی کوشش تھی۔ وقت کے روحانی شیوخ ندوہ کے مہمان خانہ میں ہفتوں ٹھہرائے جاتے۔ اہل دل جمع رہتے اور ہم طلبہ سے مولانا (علی میاں) فرماتے ''ان کی صحبتوں میں بیٹھیے، ان کے یہاں مغز ہے، ہمارے یہاں تو صرف چھلکا ہے۔'' مولانا کے سامنے تو نہیں، ادب مانع تھا (میں) اپنے ساتھیوں کے درمیان کہتا ''بھائی یہ مغز جو یہاں ہے وہ تو ہمارے گھروں میں موجود ہے، ہم تو یہاں شبلی و سلیمان کے علم و ادب کے چھلکے لینے آئے ہیں''...... فکر و نظر میں دوری کے باوجود میری محبت و

> عقیدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ مولانا روحانی اور قلبی طور پر میرے مخدوم بھی ہیں اور مرشد بھی۔''

(اب دل طواف کوئے محبت کو جائے ہے، ص:۲۳-۲۴)

مولانا طیب عثمانی ندوی عموماً اپنی کتابوں کا پیش لفظ ''اَلْکَلِمُ الطَّیِّبُ'' کے نام سے لکھتے تھے۔ ایسے ہی ایک طیب کلام میں اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کا خوبصورت اور حقیقی تعارف ہے:

> ''میری زندگی ادبی و تہذیبی مزاج کے اعتبار سے مختلف النوع رہی ہے۔ میری ذات کی تعمیر میں تین عناصر، مذہب، ادب اور سیاست کا بڑا دخل رہا ہے۔ ادب میرا عشق، مذہب میرا عقیدہ اور جمہوری اجتماعیت میرا مزاج ہے اور ان ہی تین عناصر کے محور پر میری پوری زندگی گھومتی رہتی ہے اور یہی وہ تخلیقی عناصر ہیں، جن سے میری شخصیت کی تعمیر ہوئی ہے۔''

(صحرا میں اذان، ص:۷-۸)

طالب علمی ہی کے دور سے لکھنے کا ذوق بیدار تھا اور قلمی کاوشیں اپنا رنگ دکھانے لگی تھیں۔ قلمی زندگی کا آغاز ۱۹۴۵ء سے ہوا۔ ''غنچہ'' (بجنور)، ''پھول'' (لاہور) اور ''پیام تعلیم'' (دہلی) میں بچوں کے لیے مضامین لکھے۔ ندوۃ العلماء کے علمی و ادبی ماحول نے جلا بخشی اور ملک و بیرون ملک کے رسائل و مجلّات میں علمی، ادبی اور دینی موضوعات پر وقیع مضامین کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا اور جب تک صحت مند رہے یہ سلسلہ چلتا رہا۔

عربی مضامین کا اردو زبان میں ترجمہ کا کام بھی ندوہ میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران کیا۔ مولانا علی میاں کے علامہ اقبال پر دو مضامین کا ترجمہ ''اقبال کی شخصیت کے تخلیقی عناصر'' اور ''انسان کامل - اقبال کی نگاہ میں'' اسی دور میں کیا، جسے مصنف نے اپنی کتاب ''نقوش اقبال'' میں شامل کر کے ہمت افزائی کی اور یہ دو مضامین طیب عثمانی کی کتاب ''حدیث اقبال'' میں بھی موجود

ہیں۔

م۔نسیم صاحب نے ''نئی نسلیں'' کا اجرا کیا اور طیب عثمانی صاحب کو بحیثیت مدیر شامل کیا۔اس طرح یہ دو طالب علم دوست اس جریدہ کے مشترکہ مدیر رہے اور باری باری سے اداریہ لکھتے رہے۔ہندوستان میں ادب اسلامی کی تحریک میں اس جریدہ کا مقام تاریخی نوعیت کا ہے اور یہ دونوں احباب بجا طور پر اردو ادب کی اس تحریک کو پروان چڑھانے میں سابقون الاولون کا مقام رکھتے ہیں۔

لکھنؤ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وطن واپس ہوئے تو پھلواری شریف میں امارت شرعیہ بہار کے جریدہ ''نقیب'' کے مدیر کی حیثیت سے کام کیا اور اس میں سماجی، سیاسی و اصلاحی نوعیت کے اداریے لکھتے رہے۔بعد میں گیا شہر سے ایک جریدہ ''صدف'' کے نام سے شائع کیا جو زیادہ عرصہ تک نہیں نکل سکا۔ادب میں ان کا ذوق اقبالیات، جمالیات، ادب برائے زندگی اور زندگی برائے بندگی کے تحت اور 'بے ادبی' و ادبی لذتیت کی نفی کے ساتھ ان زریں اصولوں کی روشنی میں تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔خوب صورت نثر لکھتے تھے جس میں شبلی، سلیمان و مودودی کے اثرات کے علاوہ رشید احمد صدیقی، جن کی تنقیدی و تہذیبی بصیرت کے وہ شیدائی تھے، کا طرز محسوس کیا جاسکتا ہے۔تنقید کے سلسلے میں ان کا مسلک یہ تھا کہ اسے ایک مستقل تخلیق ہونا چاہیے جو نفس نقد سے الگ خود اپنی ادبی حیثیت اور تصنیفی معیار پر نمایاں ہو۔رشید احمد صدیقی کا ذکر اسی حوالہ سے کرتے تھے۔

اقبالیات ان کے مطالعہ و تصنیف کا باضابطہ موضوع رہا۔ان کی تصنیف ''اقبال، شخصیت اور پیغام'' بہت مقبول ہوئی۔اس کی خوبی یہ ہے کہ یہ نئی نسل خصوصاً طلبہ کو اقبال اور ان کے پیغام سے متعارف کرانے کی غرض سے تحریر کی گئی تھی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہے۔یہ کتاب دراصل مطالعہ اقبال کے لیے ایک درسی کتاب (Text Book) کی حیثیت سے مفید ہے۔

وہ خانوادہ تصوف کے ایک نمایاں فرد تھے۔تصوف کو احسان کے مفہوم میں بیان کرتے اور مختلف سلسلہ تصوف کے مخصوص اعمال و اذکار کا جو اصلاح باطن کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں انھیں بزرگوں کا تجربہ بتاتے تھے۔ڈاکٹر عبدالحق انصاری کی کتاب ''تصوف اور شریعت'' شائع ہوئی تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ اردو زبان میں اس موضوع پر یہ ایک نادر تصنیف ہے۔خاندان کے بزرگ جمعیۃ علماء سے وابستہ اور امارت شرعیہ بہار کی تحریک میں حصہ لینے والے تھے۔یہ لوگ مسلم لیگ سے نالاں تھے۔

مولانا طیب عثمانی کی رائے تھی کہ مسلم لیگ نے علمائے کرام کی ناقدری کا ماحول بنادیا تھا اور جدید تعلیم سے آراستہ افراد نہ صرف دین اسلام اور اس کے شعائر سے دور ہوتے جارہے تھے بلکہ حاملین دین کی تضحیک کا ماحول بنتا جارہا تھا۔اسی زمانے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں پڑھنے کو ملیں اور لکھنؤ میں دفتر جماعت اسلامی ہند جانے کا موقع ملا۔وہاں یہ دیکھا کہ جدید تعلیم یافتہ افراد بھی مولانا عبدالغفار ندوی جیسے جید عالم دین کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیے ہوئے ہیں۔ان کی یہ رائے بنی کہ جدید و قدیم کی غیر فطری دیوار کو جماعت اسلامی نے پاٹ دیا ہے اور علمائے دین کا وقار بحال کردیا ہے۔سید ابوالاعلیٰ مودودی کے افکار سے اتفاق کرتے ہوئے ان کی تحریک سے وابستہ ہوگئے۔کہتے تھے کہ برصغیر میں مسلمانوں کے درمیان جو بھی دین کا کام ہورہا ہے وہ یا تو دین اسلام کے کسی جزو کو لے کر ہے یا شخصیات کی بنیاد پر ہے۔دین کو بعینہ جاری و ساری کرنے کی تحریک صرف جماعت اسلامی ہے۔انھوں نے اس تحریک سے اپنے آپ کو وابستہ کیا اور تادم آخر اس پر مطمئن رہے اور اپنی سعی و جہد کا مرکزی نقطہ اسے بنائے رکھا۔

جماعت اسلامی ہند بہار کے امیر حلقہ انیس الدین احمد مرحوم، ان کے قدردان تھے اور بہت کوشش کی کہ مولانا طیب عثمانی کو مرکز جماعت سکریٹری کی حیثیت سے منتقل کردیا جائے، لیکن مزاج خانقاہی حائل ہوگیا۔گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے، کا مصداق بن گیا۔شہر سے باہر انتہائی مجبوری کے بغیر سفر نہیں کیا۔سفر کے نام پر ہاتھ پیر پھول جاتے اور اختلاج کا مرض عود کر

آتا۔ البتہ اپنے شہر میں مرجع خلائق رہے۔ شہر کے تمام حلقوں اور مسلکوں سے وابستہ افراد کے درمیان یکساں طور پر مقبول رہے۔ بنیادی طور پر ایک مربی تھے۔ حلقہ طلبہ اسلامی بہار کے اجتماعات میں سرپرست کی حیثیت سے کئی سال تک شریک ہوتے رہے، جہاں درس قرآن یا حالات حاضرہ کا جائزہ پروگرام اپنے ذمہ رکھتے۔ طلبہ اور نوجوانوں کی ایک پوری ٹیم کی تربیت کی جن میں مرتضیٰ ہاشمی، سید محمد اقبال بھی تھے اور ایاز احمد خان، شبیر عالم خان، سرور احمد اور راقم الحروف بھی شامل تھے۔ شہر گیا میں جماعت اسلامی ہند کی طرف سے معمول کے اجتماعات کے علاوہ خدمت خلق اور تعلیم کے میدان میں کئی نمایاں کام کیے گئے، جن میں اسپتال، اسکول، تعلیم بالغان اور غیر سودی مائکرو فائنانس کے ادارے شامل ہیں۔ ان سب کی سرپرستی طیب عثمانی ندوی جیسے کم گو اور گوشہ نشیں بزرگ کرتے تھے۔ آخری چند سال صحت خراب ہوگئی تھی اور گھر سے باہر جانا ممکن نہیں رہا تھا، اس کے باوجود سرپرستی جاری رہی، کیوں کہ پروفیسر بدیع الزماں اور دیگر ارکان و کارکنان جماعت ان کے یہاں آتے، رپورٹ دیتے اور مشورہ و دعا سے فیضیاب ہوتے۔

مختلف امور و مسائل کے سلسلے میں واضح رائے رکھنے کے باوجود بحث و مباحثہ سے احتراز برتتے تھے۔ اپنی بات نپے تلے انداز میں کہہ کر چپ ہوجاتے تھے۔ اس طرح کسی بات کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بناتے تھے۔ ایک مثال ان کے مزاج کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ سیاسی عمل کے سلسلے میں جماعت اسلامی ہند کے فیصلوں سے شرح صدر نہ ہونے کے باوجود اسے گفتگو کا موضوع نہیں بناتے تھے۔ رائے طلب کی جاتی تو مدلل طریقہ سے تحریری یا زبانی ایک بار اپنا مدعا بیان کرکے چپ ہوجاتے تھے۔ ایک موقع پر اس وقت کے امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند حلقہ بہار جناب احمد علی اختر نے سیاسی میدان میں رابطوں اور دیگر پیش رفت کے لئے غیر رسمی طور پر ارشد اجمل، شبیر عالم خان اور راقم الحروف پر مشتمل ایک ٹیم بنائی اور آزادی عمل عطا کی۔ مولانا طیب عثمانی ہمارے سرپرست ٹھہرے۔ ہم نے موصوف سے رجوع کرکے اپنی سمجھ کے مطابق جو کام

کیے وہ مرکزی سطح پر مناسب قرار نہیں پائے۔ ارشد اجمل کو اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن کے مرکز سے اور شبیر عالم خان صاحب اور مجھے مرکز جماعت اسلامی ہند کے استفسارات کا سامنا کرنا پڑا۔ جناب احمد علی اختر امیر حلقہ مرکز جماعت کے خطوط کی تاب نہ لا سکے اور اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ یعنی ہماری کاوشوں کو Disown کردیا۔ شبیر عالم خان کے ساتھ مجھے مرکز جماعت بلایا گیا اور یہ بات گوش گزار کردی گئی کہ ہماری تگ و دو جماعت کی (اس وقت کی) پالیسی سے متصادم تھی۔ اس موقع پر قیم جماعت اسلامی ہند جناب محمد جعفر سے یہ سن کر مجھے بہت حیرت ہوئی کہ مرکز جماعت سے مولانا طیب عثمانی کو بھی کئی خطوط لکھے گئے تھے جس کا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میری جب بعد میں مولانا سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس حیرت کا اظہار کردیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ مرکز کے خطوط کا درست جواب استعفیٰ تھا، لیکن ہر معاملہ میں استعفیٰ نہیں دیا جاتا ہے۔ دراصل مجادلہ کی ان کے مزاج میں کوئی جگہ نہیں تھی۔

مولانا طیب عثمانی اپنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اپنے مزاج اور حالات کے حدود شناس بھی تھے۔ ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر اسلامی حکومت کہیں قائم ہوجائے تو ان کی جگہ اس کے سرکردہ ذمہ داروں میں نہیں ہوگی بلکہ وہ کسی تعلیمی ادارہ کی پروفیسری پر اکتفاء کریں گے۔ دراصل وہ کیا کام نہیں کرسکتے تھے اس کا ادراک بھی رکھتے تھے اور اس کی بنیاد پر معذرت کرلینے میں انہیں کوئی عار نہ تھا۔ جو کرسکتے تھے اس میں آگے بڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اپنی کمیوں (limitations) سے واقف ہونا اور اس کا اظہار کرنا ان کی شخصیت کا ایک نمایاں وصف تھا۔ ''میں کچھ ہوں'' اور ''میں کچھ کرسکتا ہوں'' کے واہمہ کے وہ کبھی شکار نہیں ہوئے۔

سیاست سے متعلق ان کے افکار بہت واضح تھے۔ حالات حاضرہ سے واقف رہے اور ملک و ملت کے مفادات کے مطابق کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے اس کے سلسلہ میں نجی گفتگوؤں اور ضرورت ہوئی تو تحریری شکل میں اپنا مدعا بیان کرتے۔ ان کی سیاسی بصیرت اعلیٰ درجہ کی تھی اور ان سے گفتگو کرنے والوں کو ان کے مفکر ہونے کا اندازہ ہوجاتا۔ ملک کی جمہوری

فضا کا برقرار رہنا، دعوت وتبلیغ کے مواقع کا استعمال کرنا اور ملک وملت کی بقاوترقی کی فکرمندی ان کے سیاسی افکار کے بنیادی محور رہے۔ جذباتیت اور انتہا پسندی پسند نہیں کرتے اور تمام حالات میں حکمت اور تفقہ کی تاکید کرتے تھے۔

انیس الدین احمد صاحب (امیر حلقہ بہار) جب تک حیات رہے، جماعت اسلامی ہند کے اہم امور پر مولانا طیب عثمانی سے مشورہ کرتے رہے۔ مرکزی شوریٰ کے اجلاس کے پہلے گیا آکران کی رائیں معلوم کرتے اور اجلاس کے بعد فیصلوں سے راست آگاہ کرتے رہے۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ البتہ کسی کسی کے سانحہ ارتحال پر یہ خیال ذہن میں آتا ہے:

دگر دانائے راز آید کہ ناید

اللہ اپنے اس بندے کو اعلیٰ درجات عطا فرمائے اور اپنی دنیا میں ایسے ہی ”نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو“ صفات کے حاملین بھیجتا رہے۔ آمین!

○○○

مولانا طیب عثمانی ندوی کی تصنیفی سرگرمیوں کے دائرے

□ ڈاکٹر محمد منصور عالم (گیا، بہار)

مولانا شاہ محمد طیب عثمانی ندوی خانقاہ مجیبیہ فردوسیہ سملہ شریف ضلع اورنگ آباد بہار کے سجادہ نشیں حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی کے فرزند ارجمند ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت خانقاہ کی فضا میں ہوئی لیکن اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شروع ہوکر لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ علوم شرقیہ سے فاضل ادب کی ڈگری پر ختم ہوا۔ اس طرح انھوں نے خانقاہیت کے محدود دائرے سے نکل کر تصوف اور احسان کے وسیع مفہوم کو اختیار کیا۔ ان کے نزدیک تصوف شریعت کی حدود میں ہو تو لائق تحسین ہے ورنہ قابل اصلاح یا کلیۃً لائق رد ہے۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تعلیمی اور تربیتی خدمات اظہر من الشّمس ہیں۔ اس عظیم ادارے نے دانش وری کے اونچے معیار قائم کیے ہیں۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ میں فکری بصیرت، وسعت نظری، سیاسی شعور، مذہبی اعتدال، تہذیبی رواداری، ادب کا تعمیری نقطہ نظر اور تصنیف و تالیف کا ذوق جیسے اوصاف مشترک اور نمایاں رہے ہیں۔ طیب عثمانی صاحب ان اوصاف کی ایک روشن مثال ہیں۔

طیب عثمانی صاحب کی تصنیفی سرگرمیوں سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔ انھوں نے ادبی، سیاسی اور مذہبی موضوعات کو اپنی خامہ فرسائی کی جولانگاہ بنایا ہے اور متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ مثلاً رسول اکرمؐ، نقش دوام، حیات دوام، افکار واقدار، اقبال: شخصیت اور پیام، ادبی اشارے،

صحرا میں اذان، سفر نامہ الحرمین الشریفین ۔ میں آخری تین کتابوں کا تعارف قارئین سے کرانا چاہتا ہوں ۔ یہ ایک طرح سے طیب عثمانی صاحب کے ادبی، سیاسی اور مذہبی افکار کا نچوڑ پیش کرتی ہیں اور ان کے منفرد صاحب قلم ہونے کا بین ثبوت ہیں ۔

ادبی اشارے طیب عثمانی صاحب کی ان تحریروں کا انتخاب ہے جو انھوں نے بحیثیت مدیر ''نئی نسلیں'' لکھنؤ اور ''پیش رفت'' دہلی کے اداریے کے لیے لکھی تھیں ۔ نئی نسلیں جناب م۔ نسیم صاحب کی ادارت میں لکھنؤ سے نکلتا تھا۔ اس میں صالح اور تعمیری ادب پر توجہ تھی۔ طیب عثمانی صاحب م۔نسیم صاحب کے معاون تھے۔ پھر ایک عرصہ بعد اشتراکی وابستگی اور جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی حلقہ بندی کے درمیان صالح اقدار اور کردار ساز ادب کا ایک ترجمان ماہنامہ ''پیش رفت'' دہلی اگست ۱۹۹۳ء میں عزیز بگھروی کی ادارت میں جاری ہوا۔ تو طیب عثمانی صاحب کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ گاہے بگاہے ان سے اداریہ لکھوائے گئے۔ ادبی اشارے میں ماہنامہ ''نئی نسلیں'' کے ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۸ء تک کے اداریے اور ماہنامہ ''پیش رفت'' دہلی کے ۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۱ء تک کے اداریے شامل کیے گئے ہیں۔ نیز ادبی روایات ادب کے نئے رجحانات اور اسلامی ادب پر کئی مضامین شامل ہیں۔

طیب عثمانی صاحب نے ادب کے دائرے کو کس قدر وسیع سمجھا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ادب اور خدا، ادب اور نبوت، ادب اور آخرت، ادب اور کائنات جیسے موضوعات پر سنجیدہ اور فکر خیز خیالات اس وقت ظاہر کیے تھے جب کہ آتش جواں تھا۔ اور جواں ادیبوں کو دنیا زیادہ کھینچتی ہے، مگر طیب عثمانی صاحب آخرت کی طرف متوجہ رہے۔ انھوں نے زندگی اور ادب کے تجربات حاصل کیے تو ان کے افکار میں مزید پختگی، راستی اور وسعت پیدا ہوئی۔ انھوں نے ادب اور تہذیب، ادب اور عقیدہ و اقدار، ادب اور جمالیات، ادب میں اظہار کی آزادی، ادبی تخلیق کے لیے جمہوری فضا کی اہمیت جیسے عنوانوں کے تحت اپنے نتائج فکر پیش کیے۔ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے خیالات صحیح سمت میں آگے بڑھتے رہے ہیں مثلاً وہ

کہتے ہیں:

> ''آرٹ کا سرچشمہ انسان کی جمالیاتی جبلت ہے اور اخلاق کا منبع بھی انسان کی صالح فطرت ہے جو خیر و شر، معروف و منکر کے درمیان خط امتیاز کھینچتی ہے اور اس کی اصل مذہب ہے۔ اس طرح آرٹ اور مذہب دونوں کا بنیادی حقیقی تعلق انسانی ضمیر و وجدان سے ہے۔ اور دونوں انسان کی اسی لازوال جمال پسندانہ جبلت سے فیض یاب ہوتے ہیں جس سے انسان کا اندرون روشن و تابناک ہے۔''

ظاہر ہے کہ جس احساس میں جمال کی ضرورت ادب العالیہ کو ہے وہ مذہب و اخلاق کے ذوق کے بغیر ارتقاء پذیر نہیں ہوسکتا، یہ معاملہ صرف نظریات کا نہیں بلکہ ادب کے ترفع کا ہے جو مذہب و اخلاق کے افق میں بخوبی ممکن ہے ورنہ بیش قیمت و اعلیٰ خیالات کا ادب میں جگہ پانا بہت مشکل ہے۔

صحرا میں اذان: طیب عثمانی صاحب ہفت روزہ ''نقیب'' پھلواری شریف پٹنہ کے بھی ایک عرصے تک مدیر رہے تھے۔ ''صحرا میں اذان'' ان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو جمہوری ہندوستان کے سیاسی حالات اور ہندی مسلمانوں کے پریشان افکار و مسائل سے متعلق نقیب، سہ روزہ دعوت، ماہنامہ افکار ملی دہلی جیسے رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ فاضل مضمون نگار نے سلیم احمد کا شعر پیش کیا ہے:

صحرا میں اذان دے رہا ہوں
شاید کوئی بندۂ خدا آئے

ظاہر ہے کہ وہ ناامید نہیں ہیں، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ بندگان خدا آتے بھی ہیں تو کان نہیں دھرتے، حالانکہ ان مضامین میں وقیع خیالات ظاہر کیے گئے ہیں اور جمہوری فضا میں ہندی مسلمانوں کے لیے لائحہ عمل بھی مرتب کیا گیا ہے۔ تناؤ اور ٹکراؤ سے بچتے ہوئے نامساعد حالات

سے بخوبی نپٹنے کی تدبیریں بتائی گئی ہیں، جن میں حق بینی و بے باکی، نرم گفتاری، امید وعمل، اخلاص، انصاف، اتحادِ ملت وغیرہ اہم ہیں۔ دوسری جانب برادرانِ وطن کو بھی بعض تلخ حقائق کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ انھیں جمہوریت بنام فسطائیت کے نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے۔ جمہوریت کی اعلیٰ قدروں کی نشاندہی کی گئی ہے، جن کی موجودگی سے کثیر مذہبی ولسانی سماج کے ان چاہے معائب دور ہوسکیں۔ طیب عثمانی صاحب نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا لیکن نظریاتی اور اقداری سیاست کی جنگ خوب لڑی۔ اور اجتماعی تعمیر وترقی کے لیے سیاسی شعور کو بیدار و عام کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس لحاظ سے یہ کتاب نئی نسل کے لیے بہت مفید ہوسکتی ہے۔

سفر نامہ الحرمین الشریفین: یہ کتاب صرف حج کی روداد ہی نہیں ہے بلکہ طیب عثمانی صاحب کے مذہبی مزاج کی بھی تصویر ہے۔ انھوں نے ۱۹۹۸ء میں حج کی سعادت حاصل کی۔ حج کے سفر پر مبنی کئی سفر نامے اردو میں لکھے گئے ہیں۔ یہ سفر نامہ الحاج شاہ محمد طیب عثمانی ندوی کے عقیدہ ومنہاج کا خوبصورت گلدستہ ہے اور راہی کو چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد دلاتا ہے۔ فاضل مصنف نے حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے تعلق سے اپنے دور طالب علمی میں دماغ وقلب کی کشاکش کو بڑے دل نشیں انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ سفر نامہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ خانقاہی نظام کا پروردہ مصنف ایام جوانی ہی سے جماعت اسلامی سے استواری کے باوجود تصوف کے مثبت اثرات کا محافظ ہے۔ تصوف میں ذوق وشوق اور داخلی کیفیت ومحبت اپنے مقام کی ایک شئے لطیف ہے۔ اس کا اندازہ جناب طیب عثمانی صاحب کو اپنے عہد طالب علمی تک نہ ہوسکتا تھا اور اندازہ ہونے کا وقت آیا تو وہ اسلام کے غیر صوفیانہ انقلابی تصور سے آشنا ہو چکے تھے، جس میں خانقاہی ذوق وشوق کا گزر کم کم تھا، لیکن حج ایسا فریضہ ہے جو اس والہانہ عشق اور قلبی کیفیت کو زبان دے کر چپ کر دیتا ہے۔ پھر راہی کے لیے اظہار محبت اور اخفاء سے حال کی منزل ایک ہو جاتی ہے۔ طیب عثمانی صاحب نے غالب کے مصرعہ 'دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے' میں تھوڑی سی تحریف کر کے اپنی کتاب کا سفر نامہ یوں بنایا

ہے 'اب دل طواف کوئے محبت کو جائے ہے' جس کی طرف نشاندہی خلوتیان میکدہ نے کی تھی۔ حضرت مولانا علی میاں کی صحبتوں نے جو کشاکش قائم کی تھی وہ رنگ لائی۔

طیب عثمانی صاحب کا اسلوب نگارش نرم اور دلچسپ ہے۔ وہ بڑے معنی خیز جملے لکھتے ہیں اور ان کے مضمون چھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ مضمون میں جابجا موزوں اشعار بھی پرو دیے ہیں، مگر خواہ مخواہ کے تصنع سے کام نہیں لیتے۔ ان کی نثر صاف ستھری، سنجیدہ اور باوقار ہوتی ہے اور دل پر اثر کرتی ہے۔

طیب عثمانی صاحب کے مزاج میں ایک بے نیازی ہے، وہ اپنے تذکرے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔ ان تین کتابوں میں صرف ادبی اشارے میں ڈاکٹر سید عبدالباری مدیر پیش رفت دہلی کا مقدمہ، باقی دو میں کسی کا کچھ نہیں۔ ان تینوں کتابوں کو طیب عثمانی کے سعادت مند بیٹے ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی صدر شعبہ اردو انجمن کالج بھٹکل کرناٹک نے اپنی نگرانی میں چھپوایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ادیب کو ایسی صالح اولاد نصیب کرے۔ آمین!

(مطبوعہ: روزنامہ قومی تنظیم، پٹنہ)

○○○

مولانا طیب عثمانی کی صحافتی دور اندیشی

❑ ڈاکٹر سید احمد قادری (گیا، بہار)

مولانا طیب عثمانی کی شخصیت اپنی ذات میں ایک انجمن جیسی تھی۔ وہ نہ صرف ایک عالم دین کی حیثیت سے معروف تھے، بلکہ اپنے صحافتی، ادبی اور دینی ولسانی مضامین سے انھوں نے نوجوانوں کی ذہن سازی میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔

طیب عثمانی نے اپنی بے پناہ دینی، ملّی، لسانی، ادبی اور صحافتی صلاحیتوں سے صالح معاشرہ اور صحت مند ادب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تحریر میں شائستگی، شگفتگی اور سلاست کے عنصر نمایاں ہوتے تھے، اس لئے ان کے ہر اداریے، تبصرے، تجزیئے اور مضامین میں قارئین گہری دلچسپی لیتے تھے۔

مولانا طیب عثمانی کے اداریوں اور مضامین پر ایک نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ وہ کس قدر دور اندیش تھے اور ان کی نگاہیں کتنی دور بین تھیں، کہ وہ نوشتۂ دیوار پڑھ کر مستقبل قریب کی فکر کیا کرتے تھے۔ مثلاً عصری منظر نامہ کے ہنگاموں کو دیکھئے اور اس تناظر میں مارچ ۱۹۹۸ء میں لکھے گئے ماہنامہ ''پیش رفت'' دہلی کے اداریہ کا یہ اقتباس کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ جیسے مارچ ۱۹۹۸ء میں ۲۰۱۵ء کے حالات ان کے سامنے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ:

''کسی قوم کا جمہوری مزاج اس کے ادب پر بھی اچھا اثر ڈالتا ہے۔ جمہوری فضا، فرد کی آزادی، اظہار خیال کی آزادی، ہماری روحانی

واخلاقی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ وہی شعر وادب اچھا ہے، جس سے فرد وسماج کی اخلاقی وروحانی ترقی ہوتی ہو اور جو تمام انسانوں سے محبت کرنے کا وسیلہ بنے۔''

اسی طرح موجودہ دور میں سرکاری انعامات، جس طرح تعصب اور جانبداری کا شکار ہو کر بے وقعت ہو گئے ہیں۔ اس مسئلہ پر مولانا طیب عثمانی نے برسوں قبل بہت واضح اشارے دئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے ملک میں بھی ہندوستانی زبانوں کے ادب کے اعتراف کے لئے مختلف ادیبوں اور شاعروں کے اعزاز میں ادبی انعامات دئے جاتے ہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ تعصب اور نظریاتی جانبداری کے شکار ہوتے ہیں۔ اس وقت اپنے ملک میں ''گیان پیٹھ ایوارڈ'' ملک کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ہے۔ اسی طرح ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ بھی بڑا ادبی ایوارڈ ہے، جو ہر سال مختلف ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں کو دیا جاتا ہے، جس میں اردو بھی ہے۔ لیکن ان دونوں نے آج تک اردو کے انھیں ادیبوں کو اعزاز سے نوازا ہے، جو سکہ بند ہیں اور جنھوں نے ادیبوں کی وردی پہن رکھی ہے۔ نظریاتی طور پر ترقی پسندی اور جدیدیت کی مہر لگی ہوئی ہے۔ ان کی نظر ندوہ اور شبلی اکیڈمی کے ادیبوں، عالموں اور دانشوروں پر نہیں جاتی، جن کی علمی وادبی خدمات ملک کے کسی بھی ادارہ اور شخصیت سے کم نہیں۔ باقی رہے تحریک ادب اسلامی کے ادیب وشاعر تو ان کے نزدیک یہ لائق اعتنا ہی نہیں...'' (پیش رفت، اکتوبر ۱۹۹۸ء)

اکیسویں صدی میں اردو زبان کا مستقبل'' کے عنوان سے اب سے پندرہ سال قبل مولانا طیب عثمانی نے اردو زبان وادب کے سلسلے میں اپنی تشویش کا، جس دردمندی کے ساتھ اظہار کیا تھا، وہ اب پوری طرح عیاں ہو کر ہمارے سامنے ہے۔ ''پیش رفت'' کے جنوری ۲۰۰۱ء

کے شمارہ میں انھوں نے لکھا تھا کہ:

”......ملک میں اردو اکیڈمیاں قائم ہیں ۔ ان کے مالی تعاون سے شاعری، افسانہ اور تنقید پر کتابیں چھپتی ہیں، تقسیم ہوتی ہیں اور ان پر انعامات ملتے ہیں۔لیکن ان کتابوں کا کوئی خریدار نہیں ہے۔ رکھے رکھے ردّی کے بھاؤ بکتی ہیں، اس لئے کہ ان کے پڑھنے والوں اور سمجھنے والوں کا حلقہ محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا ہے۔ عام طور پر جن ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں، ان کے گھر کے بچے، بچیاں، پوتے، پوتیاں اور نواسیاں ان کو پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر ہیں۔ گزشتہ ۳۰ برسوں میں ہم یہاں تک پہنچے ہیں، آئندہ بیس برسوں کے بعد، یہ پرانی نسل جو اب ختم ہو رہی ہے ان کی شاعری سے لطف اندوز ہونے اور ان کے تنقیدی مقالات کو سمجھنے والا بھی کوئی نہیں ملے گا۔ اردو بھی فارسی اور عربی کی طرح، ادب عالیہ بن کر رہ جائے گی۔“

طیب عثمانی صاحب کی فکری وسعت اور دور اندیشی کے ایسے بہت سارے نمونے ہیں، جنھیں آج بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے۔ عصر حاضر میں جس طرح جمہوریت کی اعلیٰ قدروں کو پامال کیا جا رہا ہے یا ملک کے جمہوری نظام پر فسطائیت حاوی ہو رہی ہے۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں ملک کے مسلمانوں کی انتخابی سیاست کیا ہو اور مسلمان کسے ووٹ دیں۔ ان تمام مسائل پر طیب عثمانی صاحب نے بڑے عالمانہ اور دانشورانہ انداز میں اپنے افکار و نظریات کو ”صحرا میں اذان“ کے تحت پیش کیا ہے۔ جس کے ”پیش لفظ“ (اگست ۲۰۰۳ء) میں انھوں نے لکھا تھا کہ:

”...فسطائیت نے زیادہ سر اٹھایا ہے اور ہندوتو ایک جارحانہ نظریہ عمل کی حیثیت سے پورے ملک کے لئے چیلنج بن گیا ہے۔“

طیب عثمانی صاحب کی دو دہائی قبل کی یہ پیشن گوئی بھی عصری تناظر میں حقیقت بن کر

ہمارے سامنے موجود ہے۔

عہد حاضر میں صحافت نے اپنی تمام تر حرمت اور فرائض کو فراموش کر صرف تجارت بن گئی ہے۔ اس ضمن میں بھی مولانا طیب عثمانی صاحب نے سہ روزہ ”دعوت“ کے جون ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں اپنے ایک مضمون میں پیشن گوئی کی تھی، جو آج حرف بہ حرف سچ بن کر ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے لکھا تھا کہ:

”برعظیم ہند کی اردو صحافت کی تاریخ میں، موجودہ اردو صحافت، صحافت کا تاریک ترین باب ہے۔ جھوٹ، بہتان، الزام تراشی، آج کی اردو صحافت کا طرۂ امتیاز ہے۔ کلکتہ، دہلی اور بمبئی کے اردو روزنامے اور ہفت روزہ اس کے اعلیٰ نمونہ ہیں۔ ان اخبارات کے مالکان عالی مقام اور مدیران کرام کے اندر خوف خدا ہے اور نہ آخرت میں جوابدہی کا احساس پایا جاتا ہے، یہ دنیا اور اس کی آسائشوں کے طالب ہیں، حصول زر اور منفعتِ دنیا نے انھیں اندھا بنا رکھا ہے۔ ان کا نہ کوئی ضابطۂ اخلاق ہے اور نہ اصول صحافت۔۔۔“

طیب عثمانی صاحب کی ان صحافتی تحریروں کے مطالعہ کے بعد ان کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل پر ان کے صالح اور مثبت رویۂ کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے ایسے تمام صحافتی مضامین، اداریوں اور کالموں کے ساتھ ساتھ دیگر مضامین کو بھی بڑے پیمانے پر دوبارہ شائع کیا جائے اور مختلف مدارس اور اسکولوں کے نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ ان کے افکار و نظریات سے آنے والی نسلیں بھی نہ صرف استفادہ کریں بلکہ اپنی زندگی میں اتار کر قوم و ملک کے لئے ایک صالح اور مثالی کردار بن کر سامنے آئیں۔ اس لئے کہ اب بتدریج ایسی اعلیٰ، معیاری، شگفتہ اور معنویت سے بھرپور تحریر لکھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

○○○

مولانا طیب عثمانی ندوی کی ادبی خدمات

□ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں (مظفر پور، بہار)

مولانا طیب عثمانی ندوی (۳۰ رستمبر ۱۹۳۰ء-۲۹ رستمبر ۲۰۱۵ء) ایک سنجیدہ صحافی اور ایک صاحب فکر ادیب تھے۔ ندوۃ العلماء کے زمانہ طالب علمی میں انھوں نے عربی ادب، اسلامی علوم کے علاوہ اردو و فارسی شعر و ادب کا گہرا اور سنجیدہ مطالعہ کیا تھا۔ ان کا خاندانی پس منظر بھی بہت مذہبی و روحانی تھا۔ مگر وہ لکیر کے فقیر نہیں تھے۔ اپنے عقیدہ و افکار پر وہ تاعمر مضبوطی سے قائم رہے۔ نئی تحریکات، نئے افکار و خیالات کا مطالعہ کرتے رہے مگر وہ کسی تحریک یا کسی فکر سے مرعوب نہ ہوئے۔ البتہ تحریک اسلامی کے اثرات انھوں نے قبول کیے اور اسلامی ادب سے منسلک ادیبوں اور شاعروں کی تنظیم ''ادارہ ادب اسلامی'' کے اغراض و مقاصد سے قربت انھوں نے محسوس کی۔ وہ ''ادارہ ادب اسلامی'' کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ چنانچہ نئی نسلیں کی اداراتی ذمہ داری انھوں نے نہ صرف قبول کی بلکہ اسلامی ادب کی تحریک کو پھیلانے اور مضبوط بنانے کے لیے اپنے قلم کی طاقت کا بھرپور استعمال کیا۔ م۔ نسیم، حفیظ میرٹھی، ابن فرید، پروفیسر عبدالمغنی، ابوالمجاہد زاہد، سید عبدالباری، عزیز بگھروی وغیرہ کے ساتھ مل کر انھوں نے اسلامی ادب کی تحریک کو تقویت پہنچائی۔

وہ بڑی یک سوئی اور خاموشی کے ساتھ لکھنے کا کام کرتے رہے۔ انھوں نے ''رسول اکرمؐ'' کے نام سے ایک کتاب سیرت کے موضوع پر لکھی جو ہر عمر کے قاری کے لیے بہترین کتاب

ہے۔ اسی طرح انھوں نے اپنے والد گرامی محبوب الاولیاء، حضرت مولانا شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی سملویؒ کے خطوط کا مجموعہ مرتب کر کے ''نقش دوام'' کے نام سے شائع کیا۔ اپنے والد کی سوانح حیات ''حیاتِ دوام'' لکھی جو ۱۴۴ رصفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی اہمیت و افادیت اس کے مطالعہ کے بعد ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔

مولانا طیب عثمانی ندوی نے اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں پر بھی مضامین لکھے۔ یہاں اس مضمون میں ان کے ایسے تمام مضامین کا ذکر ممکن نہیں مگر بطور مثال چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی ان کے پسندیدہ ناقد تھے۔ جب مغنی صاحب کی کتاب ''اقبال اور عالمی ادب'' شائع ہوئی تو ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع رہی۔ اصل میں واقعہ یہ ہوا کہ کلیم الدین احمد نے اپنی تصنیف ''اقبال ایک مطالعہ'' میں اقبال کی شاعری اور ان کے فنکارانہ مرتبہ پر بڑے جارحانہ حملے کیے اور یہ کہا کہ عالمی ادب میں اقبال کا کوئی مقام نہیں ہے۔ پھر انھوں نے دانتے ورڈس ورتھ، شبلی وغیرہ سے اقبال کا موازنہ کر کے ان کو کمتر درجے کا شاعر قرار دیا۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اپنی کتاب ''اقبال اور عالمی ادب'' میں کلیم الدین احمد کے تمام اعتراضات کا مدلل، مفصل اور تجزیاتی جواب دیا۔ جواب دینے کے دوران مباحثے، مناظرے اور کہیں کہیں مجادلے کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا طیب عثمانی ندوی نے اقبال کی مدافعت میں کھڑے پروفیسر عبدالمغنی کی وکالت اور وضاحت کی تعریف کی ہے اور ان کی عالمانہ اور فاضلانہ گفتگو کی داد دی ہے۔ مولانا عثمانی نے طویل مضمون میں کلیم الدین احمد کی مغربی فکر سے مرعوبیت سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے اور عبدالمغنی کی اسلام پسندی، ملی حمیت اور تنقیدی بصیرت کی داد دی ہے۔ مگر انھوں نے پروفیسر عبدالمغنی کی بعض کوتاہیوں کی نشان دہی بھی کی ہے اور اس طرح ان کا یہ مقالہ نما تبصرہ متوازن و منصفانہ تنقید کی ایک مثال ہے۔ مقالہ کا آخری پیراگراف ملاحظہ ہو:

''ڈاکٹر عبدالمغنی کی یہ کتاب اپنی تمام علمی و ادبی خصوصیت اور ناقدانہ اہمیت کے باوجود اس کے انداز بیان کا کچھ حصہ پروفیسر کلیم الدین

احمد کے رنگ و آہنگ میں ہو گیا ہے۔ اس سے کتاب کے ادبی معیار اور علمی وقار پر اثر پڑا ہے۔ ضرورت ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں وہ تمام بیانات قلم زد کر دیے جائیں جو جناب کلیم الدین احمد کی ذات و شخصیت کے بارے میں نوک قلم پر آگئے ہیں۔ اس سے اس کتاب کے حجم میں جہاں کمی واقع ہوگی، وہاں اس کے وزن و وقار میں اضافہ ہوگا۔ اس انسانی کمزوری کے باوجود یہ کتاب جناب پروفیسر کلیم الدین احمد کی تنقیدی خامیوں اور لغزشوں کی نشان دہی میں پوری طرح کامیاب ہے اور اپنے موضوع عالمی ادب میں اقبال کے مقام کے تعین اور خصوصاً مغربی شعرا کے ساتھ اقبال کے موازنہ ومحاکمہ کی بہترین کوشش سمجھی جائے گی۔''

(ماخوذ: سہ ماہی ادبی نقوش، گیا۔ پروفیسر عبدالمغنی نمبر، ص:۵۶)

طیب عثمانی ندوی کا پروفیسر عبدالمغنی پر ایک مضمون وہ ہے جو انھوں نے ان کی وفات پر لکھا۔ یہ مضمون ماہنامہ پیش رفت کے عبدالمغنی نمبر میں شائع ہوا۔ طیب عثمانی ندوی ضعف ونقاہت اور اپنی مسلسل علالت اور گوشہ نشینی کے باوجود اپنے پسندیدہ ادیبوں اور شاعروں کی تصانیف کا نہ صرف مطالعہ کرتے رہے تھے بلکہ ان سے متعلق اظہار خیال بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالمغنی نمبر کے لیے انھوں نے جو مضمون لکھا وہ بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ اس میں ان کی ادبی قدر و منزلت اور مقام کا اقرار واعتراف اور انسانی خوبیوں کا ذکر بھی ہے۔ یہاں صرف چند سطور ملاحظہ ہوں تاکہ اندازہ ہو کہ طیب عثمانی صاحب اپنے ہم عصروں اور دوستوں کے بارے میں کیا جذبات اور کیسے خیالات رکھتے تھے:

''حق گوئی و بے باکی اُن کا مزاج تھا، اس میں کسی مصلحت و مصالحت کے وہ عادی نہیں تھے...... یہی وجہ تھی کہ ان کے اعلیٰ علمی و ادبی کارناموں کے باوجود ادبی دنیا میں انھیں ہمیشہ نظر انداز کرنے کی کوشش کی

گئی اور اس حقیقت کے اظہار میں مجھے کوئی تکلف نہیں کہ برصغیر ہند کے موجودہ ادیبوں، ناقدوں اور دانش وروں میں کسی سے بھی ڈاکٹر عبدالمغنی کا قد چھوٹا نہیں تھا۔ عبدالمغنی خود شناس بھی تھے اور خدا شناس بھی۔ اور یہی چیز ان کے ہم عصروں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔......

اُن کی ایک بہت ہی نمایاں اور اہم خصوصیت ان کی فقر و درویشی تھی۔ وہ غیر اسلامی تصوف اور درگاہی مراسم خانقاہی کے تو شدید ناقد تھے لیکن ان کا دل صوفی تھا، درویشانہ زندگی، دنیا کی لذت سے بیگانہ، آخرت ان کا مطلوب ومقصود رہا۔ اقبال کی زبان میں:

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

کے وہ مصداق تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی سادہ اور صاف ستھری گزاری، ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے۔''

(ماہنامہ پیش رفت، دسمبر ۲۰۰۷ء ص: ۲۰-۲۱)

طیب عثمانی ندوی صاحب کے ادبی کارناموں میں ایک تحریر اُن کی وہ ہے جو انھوں نے اپنے عہد کے ایک صاحب طرز غزل گو عزیز بگھروی کے انتقال پر لکھی۔ ان کی یہ تحریر ماہنامہ پیش رفت اپریل-مئی ۲۰۰۵ء کے عزیز بگھروی نمبر میں شائع ہوئی۔ اس مضمون کی چند سطور نقل کی جاتی ہیں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو کہ وہ اسلامی فکر کے شاعروں سے کیسی محبت رکھتے تھے اور ان کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے:

'' جناب عزیز بگھروی عصرِ حاضر کے خوش فکر شاعر، اردو شاعری کی دنیا میں جانے پہچانے اور معروف ومقبول ہیں۔ گزشتہ نصف صدی سے اردو شاعری کے افق پر اُن کی شعری تخلیقات کی قوس قزح کے

مختلف خوش رنگ جلوے حسن نظر باعث رہے ہیں اور اردو شاعری کی اس بھری محفل میں اپنی بعض فکری وفنی خصوصیات اور شعری جہات کے لحاظ سے مجھے تنہا نظر آتے ہیں۔ (پیش رفت، اپریل-مئی ۲۰۰۵ء، ص: ۲۰)

الغرض مولانا طیب عثمانی ندوی نے اپنے قلم کا استعمال بہت سنجیدگی اور ذمہ داری سے کیا۔ انھوں نے اسلامی ادب کے فروغ میں مقدور بھر حصہ لیا اور پوری زندگی اپنے پسندیدہ موضوعات اور شخصیات پر بہت متوازن تحریریں پیش کرتے رہے۔ جب وہ بہت تھک گئے اور لکھنے سے معذور ہو گئے تو انھوں نے اپنے پیچھے ایک ایسی اولاد (ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی) چھوڑی جو ان کی راہ پر نہایت استقامت سے گامزن ہے۔

○○○

مولانا شاہ طیب عثمانیؒ: ادبِ اسلامی کے خاموش خادم اور مجاہد

□ عبدالرؤوف سونور (بھٹکل، کرناٹک)

سرزمین بہار اپنے علمی و ادبی اور دینی واصلاحی کارناموں کے لئے ہمیشہ مشہور رہی ہے۔ ہر دور میں یہاں علماء وصوفیاء، ادباء وشعراء اور مجاہدین دین وملت بڑی تعداد میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ خاص کر علمی وادبی میدان میں جو کام اہل بہار نے انجام دیا ہے تاریخ ادب اردو میں وہ مآخذ اور دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی ادب کی آبیاری کرنے والوں میں بھی سرزمین بہار کے اہل قلم سرفہرست نظر آتے ہیں۔ مولانا طیب عثمانیؒ مرحوم ان دونوں جہات کے امین تھے۔ جن اشخاص نے ادب اسلامی کی بناڈالی تھی مولانا طیب عثمانیؒ مرحوم اس سلسلے کی آخری کڑی تھے۔ آج جو بھی اہل قلم تحریک ادب اسلامی میں شامل ہیں ان میں دوتین کو چھوڑ کر اکثر دوسری اور تیسری نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ادب اسلامی کی آبیاری میں مصروف عمل ہیں۔

مولانا مرحوم کے دارفانی سے کوچ کر جانے سے اسلامی ادب کے لئے ایک خلا پیدا گیا ہے۔ مولانا مرحوم کی تصنیفات اور ان کی ادبی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ احساس مزید گہرا ہوجاتا ہے، اور یہ خلاء صرف تعزیتی نہیں بلکہ حقیقی نظر آتا ہے۔ مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی تقریباً پندرہ برسوں سے جن کے ساتھ شعبہ اردو میں مجھے کام

کرنے اور سیکھنے کا موقع ملا ہے اور ان کی زبانی مولانا مرحوم کی شخصیت کے بارے میں اتنی باتیں سنتا رہا ہوں کہ مولانا مرحوم سے کبھی بات وملاقات نہ ہونے کے باوجود دوری اور اجنبیت کا احساس نہ ہوا اور ایسا لگا کہ مولانا مرحوم جانی بوجھی اور بہت قریب سے دیکھی بھالی شخصیت ہیں ،اسی لئے ان کی وفات سے ذاتی غم وافسوس کا احساس ہوا۔میرے نزدیک آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ زندگی کے ابتدائی دور میں یعنی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں طالب علمی کے زمانے سے لے کر دمِ آخر تک وفاداری بشرط استواری کے ساتھ تحریک اسلامی اور ادب اسلامی کی اپنے قلم سے ہر قدم پر بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں اور جس خاموشی کے ساتھ دین وملت کے کاموں میں منہمک رہے وہ نئی نسل کے لئے مثالی نمونہ ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ مولانا مرحوم تحریک اسلامی کے ایک خاموش خادم تھے۔نہ صلہ کی پروا، نہ ستائش کی تمنا، نہ کوئی خواہش،بس میرا کام ہے چراغِ پیہم جلائے جانا کے مصداق ، اپنے صوفیانہ افکار کی تابانی اپنے ماحول ومعاشرہ میں بکھیرتے رہے۔اور یوں ''ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد'' کا عملی نمونہ بن گئے۔

مولانا طیب عثمانیؒ مرحوم بہار کی ایک قدیم بستی ''سملہ'' کے عثمانی صوفی خانوادہ کے چشم وچراغ تھے۔صوفیائے کرام کی اہم خصوصیات خلوت نشینی ،عزلت وگمنامی اور خموشی کے ساتھ بندگانِ خدا کی خدمت اور محبت کے آپ مکمل پیروکار تھے۔مولانا مرحوم نے ہمیشہ تصوف کے وسیع وحقیقی مفہوم کو اختیار کیا،تصوف کے سلسلے میں آپ اپنی تصنیف ''حیاتِ دوام'' میں اپنے والدِ محترم کے ایک خط کے حوالے سے یوں وضاحت کرتے ہیں کہ ''اگر تصوف کتاب وسنت کے حدود میں ہو تو لائق تحسین ہے اگر ہٹ کر ہے تو قابلِ اصلاح یا کلیتہً لائق رد ہے،تصوف دراصل احسان کا نام ہے''۔مولانا مرحوم نے ساری زندگی احسان پر عمل پیرا رہتے ہوئے تصوف کی راہ اپنا کر مومنانہ فرض ادا کرنے کی جو سعی کی ہے یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔

ہندو پاک میں علماء کی دینی ونثری کاوشوں کا جائزہ خال خال ہی لیا جاتا ہے۔جب کہ سچائی یہ ہے کہ مشاہیر علماء کی تصنیفات مذہبی موضوعات کے باوجود ادب عالیہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

ہمارے نام نہاد،سکہ بند نقادوں نے علماء کی تصانیف کو کیوں نظر انداز کیا اس پر یہاں بحث نہیں بلکہ خود ہمارے تعمیر پسند ادباء نے بھی اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے۔میں اپنے اس خیال کی تائید کے لئے خود مولانا مرحوم کے جملے پیش کرتا ہوں،دیکھئے کہ کیا دل لگتی بات کہی ہے''اس میں اس کے سوا کوئی عیب اور نقص نہیں ہے کہ ان افراد کے قلم نے اردو شعروادب کے جو گل بوٹے کھلائے ہیں انہوں نے ادیبوں کی وردی پہنے بغیر یہ کام انجام دیئے ہیں اور ادب وانشاء کو اپنا پیشہ یا ذریعہ معاش نہیں بنایا ہے''۔مثال کے طور پر مولانا شبلیؒ کے صرف ادبی تصنیفات کا جائزہ لیا گیا ہے جب کہ ان کی سیرت النبی ﷺ ،الفاروق،المامون وغیرہ تصنیفات کو ادبی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا ہے۔اسی طرح علماء،ادبی سطح پر کتنا عظیم کام کیوں نہ انجام دیں وہ علماء کی صف میں ہی شمار کئے جاتے ہیں انہیں ادیب،نقاد کہنے میں ہمیں تامل ہوتا ہے،کیونکہ کہیں ہماری ادبی شان ماند نہ پڑ جائے۔بات صرف اتنی ہی ہے یا پھر اسلامی شعراء وادباء کے قلم سے تخلیق ہوئے دلبرانہ،انشاء پردازانہ،شگفتہ اور تعمیری تحریروں پر قلم اٹھانا شاید ان کے بس کی بات نہیں۔غالباً انہی وجوہات کی بنا اسلامی شاعروں اور ادیبوں پر کوئی تبصرہ یا تنقیدی مضمون نہیں لکھا جاتا،اگر کوئی شہرت یافتہ،سکہ بند نقاد یا ادیب مجبوری کی صورت میں کچھ کہتے بھی ہیں تو ''ہاں!میں نے دیکھا ہے،پڑھا ہے، اچھا ہے'' کی حد تک ہی۔اس پس منظر میں جب ہم مولانا طیب عثمانیؒ مرحوم کی ادبی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے دینی،سماجی،سیاسی اور ادبی میدانوں کے گوناگوں مسائل پر وضاحت کے ساتھ لکھا ہے،جس کسی موضوع پر لکھا بڑی باریک بینی اور سنجیدگی سے لکھا ہے۔رعنائی وروانی اور شگفتگی،سنجیدگی ان کے اسلوب کا خاصہ ہے،اپنی شبنمی تحریر کے ذریعے پورے ماحول کو معطر کرتے ہیں ہم جوں جوں ان کو پڑھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اسی طرح بھینی بھینی خوشبو کا ہمیں احساس ہوتا ہے،مضمون کے آخر تک پہنچتے پہنچتے کہاں،کب اور کیسے ہم ان کے ساتھ شریک ہوگئے محسوس ہی نہیں ہوتا۔جب کبھی کسی ادیب کے ساتھ قاری کا اس طرح قلبی تعلق قائم ہوجاتا ہے وہ ادیب کے خلوص کی دلیل ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

مولانا طیب عثمانیؒ مرحوم علامہ اقبالؒ کی شاعری کے شیدائی تھے،''اقبال۔شخصیت اور پیام''مشہور کتاب ہے۔اس کتاب میں آپ نے مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی عربی تصنیف ''روائع اقبال'' کے دو مضامین کا اردو ترجمہ بھی شامل کیا ہے۔ان تراجم کو مولانا مرحوم کے ایک عزیز دوست مطالعہ کرنے کے بعد ایک خط میں لکھتے ہیں کہ''آپ مفکر ہوں یا نہ ہوں لیکن آپ ایک ادیب ضرور ہیں، اور اچھے ادیب''۔لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ صرف اچھے ادیب نہیں بلکہ بہترین اسلامی ادیب تھے، ہمارے اس خیال کی تائید کے لئے آپ کی تصنیف''ادبی اشارے'' جو ماہنامہ نئی نسلیں اور ماہنامہ پیش رفت کے لئے لکھے گئے اداریوں پر مشتمل ہے یا مقالات کا مجموعہ''افکار واقدار'' پیش کیا جاسکتا ہے۔اس سلسلے میں ادبی موضوعات پر ان کے تحریر کردہ صرف اداریوں میں ادب اور اسلامی ادب کی روشن دنیا آباد ہے۔ان پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو ادب کے معنی ومفہوم، ادب کی دین وتہذیب سے وابستگی، ادب اور فن کار، ادب اور جمالیات، ادب کی اسلامی قدریں، ادب اور تحریک، اردو زبان وادب کے مسائل اور جدید ادبی نظریات کا تنقیدی جائزہ وغیرہ پر بڑی سنجیدگی اور سمجھداری سے قلم اٹھایا ہے۔ادب کا سلیس وسادہ مگر معنی خیز تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ادب اظہارِ خیال اور اپنی بات کو عوام تک پہنچانے کا ایک وسیلہ ہے، ادب کسی مخصوص زبان، تہذیب اور عقیدہ سے وابستہ نہیں ہوتا، ادب، ادب ہے، بس بات اس انداز اور اسلوب سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو، پڑھنے اور سننے والوں کو مسرت وبصیرت حاصل ہو۔اسلامی ادب ان عقائد واقدار کا حامل ہے جن کی جڑیں اپنے ایمان وتہذیب سے وابستہ وپیوستہ ہوتی ہیں، نرا اظہارِ خیال ادب کی معنویت میں کوئی اضافہ نہیں کرتا''۔

ادب اور جمالیات کے تعلق سے ہمارے ادیبوں اور ناقدوں نے بڑی بحث کی ہے،

لفظ ومعنی پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، مولانا مرحوم اس موضوع پر لکھتے ہیں:

> ''ادب لفظوں کا فن ہے، جس کا مقصد خیال کی شمع روشن کرنا ہے، جس سے ادیب کے جذبۂ اظہار کے ساتھ اس کی جمالیاتی حس کی تسکین بھی ہوتی ہے۔انسان کی ایک اہم جبلت اس کی جمال پسندی بھی ہے ادب، آرٹ، شاعری میں اور دوسرے فنون لطیفہ انسان کی اسی جبلت جمال پسندی کے مرہون منت ہیں''۔اسی موضوع پر سوال وجواب کی صورت میں کیا زبردست جمال پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ملاحظہ کیجئے'' عام طور پر ادب اور زندگی میں جب حسن وجمال کا ذکر آتا ہے تو کچھ زاہدان خشک کی جبینوں پر شکنیں پڑ جاتی ہیں۔گویا جمالیات کا اسلامی نظریہ حیات اور عقیدہ وعمل کے ساتھ کوئی میل نہیں ہے اور دونوں کے درمیان تضاد ہے۔جواب دیکھئے! قرآن نے کائنات میں بکھرے ہوئے حسن وجمال کا ذکر، جمادات ونباتات اور حیوانات کے افادی وجمالی پہلو کی نشاندہی، سمندروں، پہاڑوں اور سرسبز وشاداب کھیتوں، میدانوں اور باغات کی منظر کشی۔۔۔خود رسول اکرم ﷺ کی چلتی پھرتی حسین زندگی کی مثالیں ایک زاہد خشک کی راہبانہ زندگی کی تردید کرتی ہیں''۔ان کے چھوٹے چھوٹے جملے مخالفین کے بڑے بڑے ادبی حملوں کو پاش پاش کر دیتے ہیں۔غور کیجئے!''جمالیات اس کے شعر وادب کی روح ہوتی ہے......ادب کا فنی کمال اس کا حسن وجمال ہے...... جمالیات ادب کی ایک بڑی قدر ہے......اعلیٰ ادب میں خیال وجمال کی ہم آمیزی اور فکر وفن کی ہم آہنگی ہوتی ہے۔''

مختصر یہ کہ مولانا شاہ طیب عثمانی مرحوم نے زندگی کی آخری سانسوں تک ادب اسلامی

کی آبیاری میں مصروف عمل رہتے ہوئے آنے والی نسلوں کو اسلامی افکار اور اخلاقی اقدار کے تناظر میں شعر و ادب کی تعمیر و تشکیل کا پیغام دیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس وقت مجھے مولانا مرحوم کا ایک خط جوان کے فرزند ارجمند ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کے نام ہے یاد آرہا ہے، جسے ڈاکٹر محمد حنیف شبابؔ نے اپنی کتاب ''اعتراف و تحسین'' میں نقل کیا ہے، کیوں کہ یہ نصیحت اور پیغام ادب کے تمام طالب علموں کے لئے مفید اور مشعل راہ ہے۔ میں اپنی گفتگو کا اختتام اس خط کے چند جملوں پر کرتا ہوں:

> ''ماہنامہ پیش رفت دہلی کے دفتر سے تمہاری نئی مطبوعہ کتاب ''تعبیر و تشکیل'' آئی، نگاہ شوق نے پوری کتاب پر ایک نظر ڈالی۔ کتاب حسنِ ظاہر کے ساتھ اپنی معنویت میں بھی لائقِ اعتبار ہے، خصوصاً ابتداء کے تین مضامین ادب میں وابستگی، نعتیہ شاعری کے آداب، اردو ادب میں حقوقِ انسانی، ان سے تمہارے مطالعہ کی وسعت اور زبان و بیان کی قدرت کا اندازا ہوتا ہے۔ دیگر مضامین بھی مفید اور معلوماتی ہیں۔ لیکن تمہارے ادبی و تنقیدی ارتقا کی ''اردو کی نعتیہ شاعری'' اور ''ادب کا اسلامی تناظر'' کے بعد یہ وہ منزل ہے، جہاں رکنا نہیں ہے، اس راہ پر مزید آگے بڑھنے کے لئے مطالعہ کی وسعت اور علمی گہرائی، گیرائی کی ضرورت ہے۔ واقعہ یہ ہے اردو زبان کا ادب عالیہ تمہارے پیش نظر رہنا چاہیئے۔ سرسید اور حالیؔ و شبلی سے لے کر سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، عابد حسین، آل احمد سرور کی تمام تصنیفات کا مطالعہ مفید رہے گا۔ یہ سب اساطین ادب ہیں۔ ان کی نثر کی خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ ان کی عبارت آرائی میں ان کا ہر لفظ انگوٹھی میں نگینہ کی طرح ہے جنہیں بدلا نہیں جاسکتا۔ کوئی لفظ اگر ہٹا دیا جائے تو کوئی دوسرا لفظ اس کا بدل نہیں بن سکتا۔ اچھی نثر کی یہی پہچان

> ہے..... ادب اسلامی کی پہلی صف اب تقریباً خالی ہوچکی ہے۔ ابن فرید اللہ کو پیارے ہوئے، عبدالمغنی اور ہم جیسے چند چراغ سحری بنے ہوئے ہیں، کب ٹوٹے ہوئے تارے بن جائیں کہنا مشکل ہے۔ پاکستان میں سلیم احمد، نعیم صدیقی کے بعد تحسین فراقی شاید باقی رہ گئے ہیں، ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں، ان کو پُر کرنے کے لئے تم کو محنت اور عرق ریزی کی ضرورت ہوگی، تب اگلی صفوں کی تلافی ہوسکے گی۔ اللہ تمہاری عمر میں برکت دے، جو ہم نہ کرسکے کاش اللہ تعالیٰ تم سے وہ کام لے، اور 'پدر نہ تواند، پسر تمام کند' کا مصداق بن جائے۔''!

مولانا مرحوم کی تڑپ دیکھئے کہ بظاہر اپنے فرزند سے مخاطب ہیں مگر بین السطور میں ادب اسلامی کے مستقبل کی فکر ہے، جو ان سنہرے الفاظ میں در آئی ہے۔

○○○

مولانا طیب عثمانی کا نظریۂ ادب

❑ دلشاد حسین اصلاحی (نئی دہلی)

مولانا طیب عثمانیؒ ادارہ ادب اسلامی کے بنیادی ستونوں میں سے ایک مضبوط ستون تھے، جنھوں نے اس چمنستان ادب کی آبیاری میں زندگی کی بہترین بہاریں صرف کی ہیں۔ صرف ۲۴ ربرس کی عمر ہی سے جو جوانی کا بہترین حصہ تھا، اپنے قلم سے اسلامی ادب کی ترجمانی اور رہبری کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اس دعویٰ پر ان کی وہ ادبی تحریریں گواہ ہیں جو انھوں نے ''نئی نسلیں'' کے اداریہ کے طور پر قلم بند فرمائیں۔ جو ان کے ادبی نظریہ اور رجحانات کو جاننے اور جانچنے کا ذریعہ ہیں۔

ماہنامہ ''نئی نسلیں'' لکھنؤ سے شائع ہونے والا اپنی نوعیت کا اچھوتا ادبی رسالہ تھا، جس نے اسلامی ادب کی ترجمانی واشاعت کا بیڑا اٹھایا اور چار برس تک بڑی تندہی وسرگرمی سے خدمات انجام دیتا رہا۔ اس کے اچھوتے اور منفرد ہونے کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ اس کے مندرجات کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ میرے پاس دسمبر ۱۹۵۵ء کے شمارہ کا اندرونی ٹائٹل پیپر ہے جس کے پہلے صفحہ پر رقم ہے ''ادب برائے زندگی، زندگی برائے بندگی، خداپرستانہ، پاکیزہ اور تعمیری ادب کا ترجمان'' آپ ادبی دنیا کے اس دور کا تصور کریں اور پھر اس بے باکانہ اور موحدانہ اعلان کو ذہن میں رکھیں کہ یہ آواز ملحدانہ اور خدا بیزار دور میں ادب کے نو تعمیر پلیٹ فارم سے ابھر رہی تھی تو اس کی مشکلات کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پھر آپ م۔نسیم، طیب عثمانی،

ابوالمجاہد زاہد وغیرہ جیسے حدی خوانوں کے حوصلوں کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ''نئی نسلیں'' نے ادب پر چھائی فکری گمرہی کے ظلمت کدہ میں روشن قندیل کا کام انجام دیا۔ اس کی انفرادیت کا اندازہ آپ اس سے بھی کر سکتے ہیں کہ اس کے علمی موضوعات مختلف النوع تھے اور ہر موضوع کا الگ مدیر متعین تھا جو حسب ذیل تھے:

ادارت علمی:

- فلسفہ ونفسیات: معزز علی بیگ ایم اے (سائیکلوجی)
- تاریخ وعمرانیات......
- سیاسیات: اصغر عابدی
- معاشیات: فضل الرحمٰن فریدی

ادارت ادبی:

- غزل: انور صدیقی
- نظم: ابوالمجاہد زاہد
- طنز ومزاح اور افسانہ: م۔نسیم
- تنقید: طیب عثمانی (ٹائٹل پر بھی نام رہتا تھا)
- ادبیات عالم:
- منیجر: رشید کوثر فاروقی

بعد میں آزاد نظم کے لیے بھی ایک حصہ متعین ہوا، اس کی ادارت میں سید عبدالباری شبنم سبحانی کا نام ہوتا تھا۔

اس وقت میرے پیش نظر مولانا طیب عثمانیؒ کے ذریعہ لکھے گئے اداریوں کا مجموعہ ''ادبی اشارے'' ہے جسے ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی نے ترتیب دیا ہے۔ اس میں ''ادب کی تعمیری قدریں'' کے عنوان سے ''نئی نسلیں'' میں لکھے گئے نو اداریے اور ''پیش نامے'' کے تحت ''پیش رفت'' دہلی

کے لیے لکھے گئے بیس اداریے شامل ہیں۔مختصر سا مقدمہ ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب کا ہے،اس کے علاوہ ’’طیب عثمانی کا ادبی وتہذیبی مزاج‘‘ کے عنوان سے جو مبسوط مقالہ ڈاکٹر صاحب نے مرحوم کی شخصیت وفن پر سپرد قلم فرمایا ہے وہ بڑا قیمتی ہے۔عثمانی صاحب کی شخصیت وفن دونوں پر بڑی عمدہ گفتگو کی گئی ہے اوران کی خدمات کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔’’سرنامہ‘‘ کے عنوان سے خود طیب عثمانی نے ایک تحریر سپرد قلم فرمائی ہے جس میں ان اداریوں کے سلسلہ میں کچھ باتیں ہیں۔ کچھ اس دور کے ادبی ماحول کا ذکر ہے۔’’نئی نسلیں‘‘ کا تعارف وہ خود یوں کراتے ہیں:

’’جناب م۔نسیم نے جو ایک باذوق ادیب...... باغ و بہار متحرک شخصیت کے مالک تھے ایک ادبی رسالہ ’’نئی نسلیں‘‘ کے اجراء کا ارادہ کیا اور پھر اس کا عملی نقشہ بروئے کار لایا گیا۔اس طرح ہمارے خوابوں کی تعبیر فروری ۱۹۵۴ء میں ماہنامہ ’’نئی نسلیں‘‘ لکھنؤ کے پہلے شمارہ کی صورت میں نکلی۔ یہ میرے ادبی سفر کا پہلا قدم تھا۔ ۱۹۵۴ سے ۱۹۵۸ء تک تقریباً پانچ برسوں تک یہ رسالہ بڑے آب وتاب سے نکلتا رہا۔اپنی ادبی معنویت، صالح وصحت مند فکری روایت اور ظاہری حسن وآرائش کی بنا پر اسے اس وقت کی اردو دنیا میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔‘‘

طیب صاحب نے اس رسالہ کو اپنے خوابوں کی تعبیر قرار دیا ہے اوراس کا تعارف ایک صالح تعمیر پسند ادبی ترجمان کی حیثیت سے کرایا ہے۔اس تعمیری ادبی کام میں وہ حین حیات لگے رہے،ان کے ذمہ جس موضوع پر اس کے لیے اداریے لکھنا طے پایا وہ تھا’’تعمیری واسلامی ادب کے مثبت پہلو کی وضاحت‘‘ان کے یہ اداریے اس پہلو کی توضیح وتفصیل بیان کرتے ہیں۔ جو ’’اپنی باتیں‘‘ کے عنوان سے لکھے جاتے تھے۔ان کا ایک سرسری جائزہ پیش کیا جاتا ہے تا کہ ان کی اہمیت وافادیت اجاگر ہوسکے۔ان کا مطالعہ نئی نسل کے لیے راہنما ثابت ہوگا۔

پہلا سال- پہلا شمارہ: کے تحت طیب عثمانی صاحب نے فروری ۱۹۵۴ء میں یہ اداریہ لکھا اور ماہنامہ کے اجرا کو’’جرأت رندانہ‘‘ سے تعبیر کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ

ہم نے یہ قدم’’ہوش وآگہی کے ساتھ اٹھایا ہے اور’’ایک نیا چراغ بروقت جلایا ہے‘‘اوراس ادبی نداج کے دور میں ایک صالح،صحت مند،توانا اور جیالا ادب پیش کرنے کی ایک ایسی جرأت کی ہے جس کا خیر مقدم امید ہے کہ ملک کا صالح اور صحت مند دماغ ضرور کرے گا۔‘‘

اس کے بعد ادب میں مقصدیت کی ضرورت واہمیت مقصد زندگی کا تعین وغیرہ کے ساتھ اس بات پر زور دیا ہے کہ’’ہم ادب میں زندگی کی ایسی اعلیٰ قدروں کو ابھارنا اور بڑھانا چاہتے ہیں جس سے انسانیت اٹھے اوراونچی ہو،زندگی کی صحیح عکاسی یہی ہے۔‘‘

ادب اور کائنات: کے حوالے سے یہ وضاحت کی ہے کہ’’ایک تعمیر پسند ادیب اور قاری کو کائنات اوراس کے مقصد وجود کو سمجھنا چاہیے کیوں کہ کائنات کی حقیقت اور مقصد تخلیق کے تعین کے بعد ہی ہم یہ جان سکیں گے کہ اس کائنات کا تعلق انسان اور حیات انسانی سے کیا ہے؟‘‘پھر کائنات کے اس حسین نظام اور ادب کا مقصد یوں بیان کیا ہے کہ’’کائنات کا یہ مربوط نظام اس بات پر شاہد ہے کہ خالق کائنات اس عالم رنگ وبو میں بناؤ اور سنوار چاہتا ہے......پس وہ ادب جو کائنات کی تعمیر واصلاح کرے اوروہ نظام عالم کے سنوار، بناؤ اورارتقا کا باعث ہو حقیقتاً وہی ادب زندہ رہ سکتا ہے۔‘‘

ادب اور انسان: اس اداریہ میں انھوں نے ادب برائے ادب اورفن برائے فن کو مجذوب کی بڑ کہتے ہوئے سختی سے رد کیا ہے اورادب میں مقصدیت کی حمایت کی ہے۔فکروفن کے حسن وقبح میں فنکار کی شخصیت وذات کے حسن وقبح کو دخیل ہونے کی بات کہی ہے۔ان کی نظر میں آج فساد کا سبب انسان پر انسان کی’’حاکمیت‘‘ ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اس نے’’خلعتِ نیابت الٰہی‘‘اتار کر نفس وخواہشات کی بندگی اختیار کر لی ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔ان کی نظر میں آج پھر’’حقیقی انسان کی ضرورت ہے جو عبدیت وعبودیت ......اور نیابت الٰہی کا نمونہ ہو۔‘‘ ’’ادب ایسے ہی انسانوں کا مرہون منت ہے جو اپنے قلم کو خالق کائنات کی امانت سمجھتے ہوں اور جس سے اپنی نیابت الٰہی کے فرائض انجام دے رہے ہوں۔‘‘

ادب اور زندگی: زندگی سے ادب کے ربط کو سمجھانے سے قبل انھوں نے چند سوال اٹھا کر ان کے جواب اس اداریہ میں دیے، پھر ادب اور زندگی کے باہمی ارتباط پر گفتگو کی ہے۔ سوالات ہیں: ادب کا انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے؟ حیات کیا ہے؟ حقیقی زندگی کسے کہتے ہیں؟ پھر ادب اور انسانی زندگی کے متعلق تحریر کیا ہے کہ ''ادب انسانی زندگی کا حسین ترجمان، اس کے افکار کا پرتو اور خیالات کا عکس ہوتا ہے۔ ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے اور زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔'' انھوں نے اشتراکیوں کے لفظ ''زندگی'' کے مفہوم کی توضیح کی ہے کہ ان کے نزدیک صرف ایک طبقہ کی زندگی مراد ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کے یہاں ''عوام'' کا لفظ بھی طبقہ مزدور تک خاص ہے۔ اس کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ ہمارے یہاں زندگی سے پوری انسانیت مراد ہوتی ہے جس میں ''رنگ ونسل، فرقہ اور طبقہ کی کوئی قید نہیں ہوتی۔'' ''تعمیری ادب قطعاً اس زندگی کا ترجمان نہیں ہے، جس میں انسان کو مختلف طبقوں اور خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو۔''

ادب اور خدا: تعمیری ادب کی تین بنیادی قدریں ہیں جن پر ہمارے ادب کی تعمیر، ترقی اور تشکیل کا انحصار ہے اور یہ بنیادی قدریں ہیں ''خدا، نبوت اور آخرت'' ان کو مولانا نے فکر کے اساسی اور بنیادی تصورات سے تعبیر کیا ہے۔ لکھتے ہیں ''ہر عظیم ادب کا سوتا حیات و کائنات کے کسی عظیم تصور سے ہی پھوٹتا ہے اور خدا کا تصور حیات و کائنات کا سب سے اعلیٰ اور عظیم تصور ہے...... اس لیے ہم اپنے ادب کو خداپرستانہ ادب بھی کہتے ہیں۔''

ادب اور نبوت: نبوت کا یقین ظلمت شب میں مسافروں کے لیے ایک روشن قندیل ہے...... انبیاء کی آمد کائنات کی تہذیبی و تعمیری ضرورت تھی''۔ ''...... اس لیے تعمیری ادب کو شمع نبوت سے براہ راست مستنیر ہونا چاہیے۔'' ''......اور جس ادیب و شاعر کا فکری و عملی منبع و سرچشمہ علوم نبوت اور حکمت رسالت سے وابستہ ہو، اس کی فراست ذہن، ندرت فکر اور زبان وبیان کی رعنائیوں کا کیا کہنا...... اس کی فکر کی سرعت بجلی سے زیادہ تیز ہوگی اور اس کی زبان و بیان کی گرمی شعلہ کی طرح روشن و تابناک ہوگی۔'' مولانا کے ان چند جملوں کی روشنی میں نبوت

سے ادب کے ربط کو سمجھا جا سکتا ہے۔

ادب اور آخرت: اس ضمن میں طیب صاحب نے تحریر کیا ہے کہ خدا اور آخرت کے تصور کو نرا مفروضہ کہنا غلط ہے۔ لیکن اگر یہ مفروضہ زندگی کی تعمیر اور بناؤ میں مفید اور مثبت رول ادا کرتا ہے تو اس ''مفروضہ کو حقیقت تسلیم کر لینے میں کیا قباحت ہے۔'' اس کے بعد عقیدہ آخرت کی تفصیل کے ساتھ اس پر گفتگو کی ہے کہ انسان اور خاص طور پر سماج میں ادیب و شاعر پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں اس کی تخلیقات کیا نوعیت اختیار کرتی ہیں۔ لکھتے ہیں ''ایک آخرت پسند ادیب خودغرض اور مفاد پرست نہیں ہو سکتا ...... اس کا قلم ہمیشہ حق و صداقت و راست بازی کے گرد گھومے گا...... وہ ادبی دنیا سے ان غلط جذبات کو دبانے اور کم کرنے کے لیے کوشاں ہوگا......ایک آخرت پسند ادیب انسانیت کے لیے حیات بخش اور صحت مند ادب کی تخلیق ہی نہیں کرتا بلکہ انسانیت کو اپنا خلوص، محبت، معرفت اور اپنی نگاہ بخشتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انسانیت دوستی، ہمدردی اور رحم و پیار بھی عطا کرتا ہے۔''

اسلوب اور ہیئت: یہ ایک عمدہ تحریر ہے، جس میں انھوں نے اسلوب، طرز ادا کے ساتھ ساتھ ہیئت و تکنیک پر گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ جاہلی اسلوب و طرز ادا اختیار کر کے ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ ''کسی ادب کا اسلوب اور شعر کی ہیئت'' اس ادب و شعر کے فکری پس منظر اور شعور سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔''

اسلامی ادب کیا ہے؟: اس میں ایک ترقی پسند پشتو شاعر حمزہ خان شنواری کے اسلامی ادب پر اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے شرح و بسط سے اسلامی ادب کیا ہے؟ کو واضح کیا ہے۔

○○○

منظوم خراج عقیدت

نذر طیب

از: مولانا الحاج شاہ محمد تسنیم عثمانی فردوسی سملوی

(سجادہ نشیں: خانقاہ مجیبیہ فردوسیہ، سملہ، اورنگ آباد، بہار)

سایۂ نخلِ مجیبی بر مزار پاک تو
چشمۂ تسنیم و کوثر در مزار پاک تو
ماہ تاباں از فلک مژدہ دہدیا بارشاد
نفس تو ہم مطمئن اندر مزار پاک تو

○○○

مستند، معتدل، مثالِ سلف

قطعہ بروفات

حضرت مولانا الحاج شاہ محمد طیب عثمانی فردوسی سملوی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ پیدائش: ۳۰؍ستمبر ۱۹۳۰ء (منگل) تاریخ وفات: ۲۹؍ستمبر ۲۰۱۵ء (منگل)

از: مولانا الحاج شاہ محمد تسنیم عثمانی فردوسی سملوی

سجادہ نشیں: خانقاہ مجیبیہ فردوسیہ، سملہ، اورنگ آباد (بہار)

اک صحافی، ادیب، دانشور قلبِ مومن، ضمیر روشن تر
مہد محفوظ[۱]، لحد پاکیزہ نام طیب تھا، خُلق طیب تر
اپنے والد کے نام کی تاثیر قاسمِ علم، معتمد رہبر
مستند، معتدل، مثالِ سلف شاہ طاہر کو ناز تھا جن پر
ندوی ایسے کہ ندوہ یاد کرے پھر علی[۲-۳] کی نگاہ تھی جن پر
فکرِ اقبال، فیضِ بوالحسنی[۴] اور حیا[۵] بھی نثار تھی جن پر
تھی عزیمت کی راہ اور مخدوم شرفِ دیں کا بھی فیض تھا جن پر
سب خیالات، فکر و فن پرکھے آخرش خود کو خاکِ پا لکھ کر
بعد عمرہ و سیرِ کوئے حبیب سوگئے آکے قدمِ دادا پر
جن کے نانا کا نام جنت تھا ان کے حصہ میں آئے جنت گھر

ہے یہ تسنیم کی دعا یارب
ابرِ رحمت ہو ان کی تُربت پر

(۱) والدہ ماجدہ حضرت بی بی حفیظن بنت جنت حسین بڈوسریؒ (۲) قطب العصر حضرت مولانا محمد علی فردوسی سملویؒ عرف ''منشی دادا'' (۳) مفکر اسلام حضرت مولانا الحاج سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ (۴) حضرت اعلیٰ مولانا الحاج شاہ احمد کبیر ابوالحسن شہید فردوسی سملویؒ (۵) حیائے عثمانی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

ہوا جاتا ہے ویراں صحنِ گلشن

❑ مرغوب آثر فاطمی (گیا، بہار)

بریدہ آرزو بے چین حسرت — جیے جانا ہے گویا کوئی تہمت
جو زندہ ہیں انھیں معلوم کیا ہے — جہاں سے کوچ کرنے کی مسرت
ہوا جاتا ہے ویراں صحنِ گلشن — زیاں مائل ہے پھولوں کی طراوت
گئے عثمانِ خوش خو و طیّب — گئی لفظ و معنی کی حلاوت
وہ میدانِ ادب کے تھے سپاہی — جنھوں نے پیش کی بے لوث خدمت
مثالی ہی رہا معیار ان کا — وہ ہو مضموں نگاری یا صحافت
بڑا پُر پیچ کارِ ذہن سازی — صلائے دین اور ابلاغِ دعوت
مگر اس مردِ مومن کی نظر میں — اہم تھی صلحِ ملّت کی ضرورت
اشاعت یا کہ تعمیرِ مکاتب — کہ ہو تعلیمِ نسواں کی سعادت
یتیموں کی نگہداری کا بیڑا — اٹھایا شوق سے اور کی اعانت
نشانِ راہ ہیں ان کی کتابیں — وہ ہم کو دے گئے انمول دولت
عقیدت کا ہے یہ بہتر وسیلہ — کریں ان کی وراثت کی حفاظت
دعا کو اٹھ رہے ہیں ہاتھ میرے — مبارک ہو انھیں آرامِ جنت

صفاتِ عالیہ کا ایک ریزہ
بصدقہ ہو آثر کو بھی عنایت

نذرِ طیب عثمانی

❑ ڈاکٹر ظفر عالم سہسرامی

بزمِ عرفاں میں سماعت نہ گہر بار ہوئی
داستاں گرمیٔ محفل کی رقم کیا کرتا

اُس کی پیشانی سے ملکوتی چمک پھوٹ پڑی
تابِ نظارہ نہیں، دید کے اسباب بہم کیا کرتا

عمر بھر بس پسِ دیوار کھڑا سنتا رہا
آپ بیگانہ رہا، شکوۂ اربابِ ستم کیا کرتا

اُس نے جب اوڑھ لیا خرقۂ درویشی تو اب
جبہ، سجادہ و دستارِ حرم کیا کرتا

اُس نے چھوڑا ہے وراثت میں سمندر کا سکوت
چاہنے والوں پہ اب اور کرم کیا کرتا

سب نے دیکھا ہے کہ ہر شاخ جھکی رہتی تھی
بوجھ کو اپنے ثمر بار شجر کم کیا کرتا

علم کا روشن ایک دیا تھے، مولانا طیب عثمانیؒ

❑ ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن ضیاؔ مدنی (شانتاپورم، کیرلہ)

علم کا روشن ایک دیا تھے، مولانا طیب عثمانیؒ
قدرت کی انمول عطا تھے، مولانا طیب عثمانیؒ

نازاں تھا دانش پر ان کی، دانش گاہِ علم و ادب
شان علماء، شان ندوہ تھے، مولانا طیب عثمانیؒ

پیش نظر تعمیر ہو جس کے مانند اقبالؔ و حفیظؔ
ایسے سخن کے دلدادہ تھے، مولانا طیب عثمانیؒ

'سرخ سویرے والے' جس کی کاٹ سے لرزاں رہتے تھے
نقد و نظر کا وہ تیشہ تھے، مولانا طیب عثمانیؒ

اخلاص و تاثیر سے پُر تھیں ان کی روشن تحریریں
شاہ قلم، سلطان وفا تھے، مولانا طیب عثمانیؒ

باطل کا سر کاٹ رہے تھے، سیف قلم سے فضل رب سے
غازی تھے شمشیر خدا تھے، مولانا طیب عثمانیؒ

حرص و ہوس کی آلائش سے، یکسر پاک تھا سینہ ان کا
قانع تھے، راضی بہ رضا تھے، مولانا طیب عثمانیؒ

باغ تصوف سے گل چن کر، خاروں سے پرہیز کیا
حکمتِ رب کے پروردہ تھے، مولانا طیب عثمانیؒ

جادہ جادہ چھوڑ گئے ہیں، تابندہ یادوں کے نقوش
مستقبل کے راہ نما تھے، مولانا طیب عثمانیؒ

حدیث اقبال

□ ڈاکٹر یوسف حسین خان (علی گڑھ)

طیب عثمانی صاحب نے اپنی اس تصنیف میں فکر اقبال کا تجزیہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کا یہ طریق کار درست اور قابل تحسین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے کلام اور پیام کو اسلامی تعلیم کی روشنی ہی میں سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے دانتے کی شاعری کو مسیحی مذہب کو جانے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔

یہ کتاب نو بابوں پر مشتمل ہے، جن میں اقبال کے وہ تمام بنیادی تصورات آگئے ہیں جن سے معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے کسی ہ کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر نوجوانوں کے لے لکھی گئی ہے تاکہ وہ اقبال کے خیالات سے بصیرت حاصل کریں، مصنف نے خود لکھا ہے:۔

> ''اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کالج کے طلبہ اور ملت کے نوجوانوں کے سامنے اقبال کا کلام و پیام صحیح معنوں میں آجائے اور وہ اقبال کے ''سوزجگر'' اس کے ''عشق'' اور اس کے ''نور'' اور ''نظر'' سے واقف ہوجائیں۔''

مصنف نے اقبال کے بنیادی تصورات کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی تصنیف سے اپنے پیش نظر جو مقصد رکھا ہے اس میں انھیں

کامیابی ہوگی اور ملک کے نوجونوں کو شاعر مشرق کے کلام و پیام کی روح تک رسائی حاصل ہو جائے گی۔

اقبال کے کلام کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت تو مسلّم ہے، اس کے علاوہ اس کے یہاں تہذیبی مسائل کی نسبت جو اشارے ملتے ہیں وہ بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ گذشتہ تین سو سال میں زندگی جس ڈگر پر چل رہی ہے وہ خطروں سے خالی نہیں۔ سائنس نے انسان کی قوت کو بہت بڑھایا ہے یہاں تک کہ اب عالم بالا پر اپنی کمندیں پھینکنے لگا ہے۔ اپنے علم کے ذریعہ وہ اشیاء کی قلب ماہیت کر کے انہیں اپنے مفید مطلب بناتا ہے۔ لیکن باوجود فطرت کے تسخیر کرنے کے انسان اپنے وجود میں تضاد اور الجھن محسوس کر رہا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے فطرت پر اپنے اخلاقی ظرف سے زیادہ قابو پا لیا ہے۔ ایٹم کی دریافت سے اس کا قابو فطرت پر بہت بڑھ گیا ہے۔ آج اس کے سامنے یہ مسئلہ ہے کہ وہ اپنے علم کو زندگی کی فراوانی کے لئے استعمال کرے یا انسانیت کو تباہ و برباد کرنے کے لئے۔ یہ ایک اخلاقی سوال ہے جسے حل کرنا ہے۔ اقبال کے کلام میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ اس لئے کہ وہ تمام انسانی مسائل کو حل کرنے کے لئے اخلاق و مذہب کا سہارا لیتا ہے۔ اس نے روحانی اور مادی زندگی کی مفاہمت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اسلامی تعلیم کے موافق ہے۔

انسانی زندگی کا اصل مقصد انسانیت کے شرف و وقار کو بڑھانا ہے، جس کی طرف اقبال نے بار بار اپنے کلام میں اشارہ کیا ہے۔ اس نے انسانیت کے لئے ایک نئے اخلاقی توازن کو ضروری بتایا ہے جس کے بغیر زندگی کو صحیح راہ عمل نہیں مل سکتی۔

مصنف نے ان تمام تہذیبی مسائل پر روشنی ڈالی ہے، جو اقبال کے کلام میں ملتے ہیں، کتاب کا انداز تحریر دلکش ہے۔ امید ہے کہ ہمارے نوجوان اس کتاب سے پوری طرح استفادہ کریں گے۔

○○○

ادبی اشارے

❑ ڈاکٹر سید عبدالباری (نئی دہلی)

جناب طیب عثمانی اردو ادب کے ایک منفرد و ممتاز نقاد ہیں جنہوں نے اردو تنقید کے رخ کو اسلامی فکر و نظر کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ یہ مشغلہ نصف صدی قبل ندوہ میں عربی زبان و ادب اور اسلامیات کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہی شروع ہوا۔ اسی ابتدائی مرحلہ میں ان کی تحریروں میں فکری پختگی اور نظریاتی شعور کی بالیدگی نظر آتی ہے۔ بات کو سادہ و سلیس اسلوب میں بحسن و خوبی ادا کرنے کا ہنر بھی اسی زمانہ میں انہیں آ گیا تھا۔ یہ ۱۹۵۴ء کا زمانہ تھا اور لکھنؤ سے ایک نہایت خوشنما ادبی رسالہ حضرت م۔نسیم کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ طیب عثمانی ان کے معاون تھے۔ پاکیزہ اور تعمیری ادب کی شاہراہ پر یہ نمایاں پیش رفت تھی۔ اس سے قبل اگرچہ حیدر آباد سے انوار و حیات نو اور میرٹھ سے معیار منظر عام پر آ گیا تھا مگر نئی نسلیں کا بانکپن ان میں کہاں تھا۔ الگ الگ شعبوں کے الگ الگ مدیر مقرر ہوئے تھے۔ نظم آزاد کی ادارت اس حقیر کے حوالے کی گئی تھی۔ نوجوان طالب علموں اور نوخیز ادیبوں کا ایک قافلہ تھا جو پورے جوش و خروش سے اس عہد میں اردو ادب پر حلقہ ارباب ذوق اور حلقہ اشتراکین کی وجہ سے جو کثافتیں اور انحراف مسلط کر دیا گیا تھا اس کے اثرات سے اردو قارئین کو نجات دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ''نئی نسلیں'' نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنا امتیاز اپنی شناخت اور ایک دلکش اور معیاری رسالہ کی حیثیت سے اپنی عظمت تسلیم کرالی۔ طیب عثمانی ہر دوسرے ماہ اس رسالہ کے اداریے لکھتے اور اسلامی ادب

کی فکری جہات کو سنبھالنے کے لئے وہ موزوں بھی تھے اس لئے کہ فکر اسلامی کے سرچشموں اور عربی زبان و ادب کے شاہکاروں سے پوری طرح آگاہ و باخبر تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا حق بھی ادا کیا اور بڑی فکر انگیز بحثیں کیں جو آج بھی معنی خیز ہیں۔ طیب صاحب نے موضوعات کا تعین بھی بڑے تعمق اور دور اندیشی سے کیا۔ ادب اور کائنات، ادب اور انسان، ادب اور زندگی، ادب اور خدا، ادب اور نبوت، ادب اور آخرت، اسلامی ادب کیا ہے، اسلوب اور ہیئت ان کے چند موضوعات ہیں جن سے فکر و خیال کی دنیا میں ان کی زقند کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈیڑھ دو صفحہ میں بات سمیٹ دینا گویا کوزہ میں دریا کو بھرنے کا آرٹ تھا۔ اس طرح وہ مسلسل چاول پر قل ھو اللہ لکھتے رہے۔ نثر نہایت رواں خوش آہنگ اور ان کے قدرت کلام کی غماز تھی۔ دلکش استعاروں اور حسین تشبیہوں سے وہ اپنی بات کو سحر انگیز بنانے کا آرٹ جانتے تھے۔ آج سے ۴۸ سال پہلے کی یہ تحریر ملاحظہ ہوں:

''زندگی کے یہ سچے موتی جن کو ہم اپنے ادب و شعر میں پرو کر انسانیت کے لیے ایک مکمل خوشنما ہار بناتے ہیں۔ یہ حسین زندگی دراصل ہمارے انہیں تصورات پر مبنی ہے جو ہم کائنات، انسان اور خود زندگی کے بارے میں رکھتے ہیں۔''

''کائنات کا یہ مربوط نظام اس بات پر شاہد ہے کہ خالق کائنات اس عالم رنگ و بو میں بناؤ سنگار چاہتا ہے اور اس میں کسی قسم کا بگاڑ فساد اور تخریب اس کے منشاء تخلیق کے خلاف ہے۔''

''یہ عظیم کائنات جو اپنے اندر حسن و دلکشی رکھتی ہے جس کے اندر قوسِ قزح کی رنگینی، حسن اور جمال آرائی ہے اور جو گلہائے رنگا رنگ کا مصداق ہے۔ یہ رنگا رنگ پھول اونچے اونچے پہاڑ بل کھاتی ہوئی ندیاں امڈتے دریا جنگل و باغات خالق کائنات کی قوت تخلیق کا مظہر ہے۔''

''خدا کا تصور دراصل حیات و کائنات کا سب سے اونچا تصور ہے۔ ہر عظیم

ادب کا سوتا حیات وکائنات کے کسی عظیم تصور سے پھوٹتا ہے جس ادب کی آبیاری اس عظیم تصور سے ہو وہی ادب عظیم ہے۔''

طیب عثمانی نے ان شذرات کے تقریباً ۳۵ سال بعد پھر ''پیش رفت'' کے صفحات کو اپنے رشحات قلم سے تازگی عطا کی۔اس وقت حکمت وتفکر کی اس منزل میں وہ آگئے ہیں جہاں انسان بنی نوع انسان کے لئے روشنی کا مینار بن جاتا ہے۔اس دور میں وہ تقریباً ۲۰ شذرات تحریر کر چکے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ ''نئی نسلیں'' کے مباحث کا تسلسل قائم ہے مگر زیادہ پختگی اور دانائی کے ساتھ۔موضوعات تقریباً ویسے ہی ہیں.....''اسلامی ادب،اقدار،عقیدہ،ادب اور جمالیات، ادب اور تحریک،ادب کی روایات وغیرہ۔لیکن اس عہد میں انہوں نے عصری مسائل اور رجحانات پر خاص طور سے جدید ادبی رجحانات پر گفتگو کرتے ہیں۔مثلاً اکیسویں صدی میں ادب، اردو ادب میں جدید رجحانات، اطلاعاتی ٹیکنالوجی اور اسلامی ادب، جدیدیت، شعر و ادب میں انحراف، ترقی پسندی جدیدیت مابعد جدیدیت اور ادب میں اظہار خیال کی آزادی وغیرہ۔ان شذرات میں انہوں نے موضوع زیر بحث کا خوش سلیقگی سے محاکمہ کیا ہے اور ایک متوازن طرز فکر عطا کیا ہے۔

حضرت طیب عثمانی کی تحریروں میں مولانا مودودیؒ کی انقلاب آفریں فکر اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لئے ان کی کاوشوں کی جھلک نظر آتی ہے۔طیب عثمانی نے تنقید کے اصول قرآن و حدیث سے اخذ کرنے کی سعی مبارک کی ہے۔انہیں قرآنی علوم کے گہرے مطالعہ اور پختہ ایمان و یقین کی بدولت غیر معمولی خود اعتمادی اور محکم انداز بیان کی دولت حاصل ہے۔خوشی ہے کہ ان کی تحریروں کا یہ مجموعہ بروقت منظر عام پر آرہا ہے جب کہ اردو ادب اور اردو دنیا کی دیگر زبانوں کے ادب میں اہل قلم سارے نظریات فکر وفن سے زیادہ قرآنی نظریات اور فکر اسلامی کی طرف متوجہ ہیں۔خدا کرے جناب طیب عثمانی کی یہ مبارک کاوش نئی نسلوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو۔

OOO

خیابان خیال

□ ڈاکٹر شمس بدایونی (بریلی)

بیسویں صدی کا نصف اول اردو میں اشتراکی نظریات اور مارکسی خیالات کے ظہور و شیوع کا زمانہ تھا۔ادب، فلسفہ، تاریخ، تنقید، تہذیب اور ثقافت ہر چیز اس کی گرفت اور زد میں آگئی تھی۔اس دوران انسانی عقائد متزلزل اور مشرقی اقدار شکست و ریخت سے دوچار تھیں۔ مذہب جو انسانی اخلاق اور معاملات کی پہلی اور آخری پناہ گاہ ہے، اس کی ضرورت پر ہی سوالات قائم ہونے لگے تھے۔ظاہر ہے اس انتہا پسندی کا ردعمل ہونا ناگزیر تھا۔چنانچہ علم وادب اور مذہب کے محاذ پر اس چیلنج کو قبول کیا گیا اور اس کا بھرپور دفاع کیا گیا۔''اسلامی ادب'' کی اصطلاح بھی انہی دنوں رائج ہوئی اور اس کے تحت ادب لکھنے والے ایک گروپ نے مذکورہ نظریات اور رجحانات کا رد کیا اور صالح ادب کے لئے کچھ اصول اور ضابطے پیش کئے۔اس دفاع کرنے والے گروپ کے ایک فرد مولانا طیب عثمانی بھی تھے۔

مولانا کا خانوادہ علم وادب سے آشنا تھا، قلم وقرطاس سے اس کی موروثی شناسائی تھی۔ انھوں نے وسائل کی کمی کے باوصف انتہائی اخلاص کے ساتھ ملک وملت کے بگڑتے حالات کا مشاہدہ کیا، اس کی اصلاح کی منصوبہ بندی کی اور اپنی تجاویز وتدابیر کو بہ صورت تصنیف وتالیف اور صحافت کی راہ سے وقف عام کیا۔یہ درست ہے کہ وہ ایک موقر تنظیم جماعت اسلامی ہند کے ممبر تھے اور جماعت کے منشور اور نظام کے پابند اور اس کے زیر اثر تھے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ وہ اپنے

تصنیفی اور تالیفی پروگرام اور صحافت کی راہ تک اسی جماعت کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب ''تنقیحات'' کے مطالعے سے آئے تھے۔

کوئی کام کسی جماعت یا تنظیم کے زیر اثر کیا جائے، کام کرنے والے افراد ہی ہوتے ہیں اوران افراد کے اپنے بھی کچھ امتیازات ہوتے ہیں جو جماعت کی کارگزاریوں کا حصہ بن کر اس کو تقویت دیتے ہیں۔ مولانا کی مذکورہ بالا حیثیت کا جائزہ لیا جاچکا ہے، ماہنامہ ''پیش رفت'' دہلی نے ایک نمبر کی صورت میں ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ (مارچ ۲۰۱۶) لیکن ان کے خطوط کا ذخیرہ گم شدہ تھا۔ اس کی طرف کسی کی نظر نہ تھی۔ خیر سے ان کے بیٹے جو خود بھی اسلامی ادب کی فکری اساس پر مستقل لکھتے لکھاتے رہے ہیں ان کو یہ خطوط نقول کی صورت میں مصنف کی فائلوں میں دستیاب ہوگئے، جنہیں انھوں نے موضوعاتی طور پر تقسیم کرتے ہوئے ترتیب دیا ہے۔ میری نظر سے آج تک خطوط کا ایسا کوئی مجموعہ نہیں گزرا جسے موضوعاتی طور پر مرتب کیا گیا ہو۔ یہ ایک اچھی مثالی کوشش ہے، جس کی تقلید کی جانی چاہیے۔

جہاں تک ان خطوط کی اہمیت اور قدر و قیمت کا سوال ہے تو میں یہ عرض کروں گا کہ یہ خطوط مضامین کے لحاظ سے اپنے عہد کے حادثات، واقعات، شخصیات اور افکار و مسائل کے سچے ترجمان ہیں۔ ان میں ایک مخلص، بے ریا عالم اور قلم کار کی ذہنی بلندی اور معاشرے کے لئے کچھ کرگزرنے کی خواہش کو بروئے کار لانے کا قیمتی جذبہ پوری طرح قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہ خطوط ہمارے ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں، یہ اگر ضائع ہوجاتے تو ملال ہوتا۔ امید ہے کہ اہل ادب اس مجموعہ خطوط کو پسند کریں گے اور مرتب کی محنت کی داد دیں گے۔

○○○

تبصرہ

حدیث اقبال

از: مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی (اعظم گڈھ)

زیر تبصرہ کتاب کے ذریعہ ''اقبالیات'' میں ایک اچھا اضافہ ہوا ہے۔ یہ کتاب گو ایک نوجوان ندوی کی ہے، مگر تحریر میں کہنہ مشقی اور خیالات میں بالغ نظری جھلکتی ہے۔ کتاب میں کل دس ابواب ہیں اور ہر باب پڑھنے کے لائق ہے، ان میں اقبال کی اسلامیت آمیز آفاقیت پر بڑی اچھی گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر نوجوانوں کے بار بار مطالعہ کے لائق ہے۔

تبصرہ: حدیث اقبال

از: مولانا ماہر القادری (کراچی)

علامہ اقبال کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، مگر پھر بھی تشنگی باقی ہے، اس ذکر و فکر میں بڑی لذت ہے، اس لئے وجدان اس کے دراز ہونے کی تمنا رکھتا ہے۔ لائق مصنف نے افکار اقبال کا تجزیہ دل نشین انداز میں کیا ہے ان کا ذہن و شعور اور وجدان اقبال کے خیالات سے خاص مناسبت اور ربط و شغف رکھتے ہیں۔

تبصرہ: حدیث اقبال

از: مولانا سید احمد عروج قادری (رامپور)

طیب عثمانی ندوی ادارہ ادب اسلامی ہند کے جانے پہچانے ادیب ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کے متعدد مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب کالج کے طلبہ اور ملت کے نوجوانوں کو کلام

اقبال سے آشنا کرنے کے لئے مرتب کی گئی ہے۔طیب عثمانی صاحب کا انداز تحریر دلکش اور رواں ہےاور مقالات میں ادبیت رچی بسی ہوئی ہے۔

تبصرہ: حدیث اقبال

از: مولانا عامر عثمانی (دیوبند)

یہ کتاب طیب عثمانی صاحب کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو اقبال اوران کی شاعری کے متعلق وقتاً فوقتاً سپرد قلم کرتے رہے ہیں۔طیب صاحب کے مضامین میں زبان کی چاشنی بھی ہےاور رعنائی و روانی بھی۔اقبال کے کلام کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے سمجھانے کی سعی انہوں نے دلکش اندز میں کی ہے۔

تبصرہ: حدیث اقبال

از: ڈاکٹر ابن فرید (علی گڈھ)

اقبال کی شاعری ایک ایسا موضوع اظہار ہے،جس پر تازہ بہ تازہ نو بہ نو خیالات کا اظہار کیا جاسکتا ہے حدیث اقبال اسی کی ایک مثال ہے۔یہ کتاب طیب عثمانی صاحب کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً انہوں نے اقبال کی شاعری پر لکھے ہیں جن میں زبان کی سلاست کے ساتھ طبع زاد خیالات بھی ملتے ہیں،جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولف نے کافی سوچ و بچار کے بعد قلم اٹھایا ہے۔

○○○

تبصرہ

افکار و اقدار

از: مولانا سید احمد عروج قادری

برادرم جناب طیب عثمانی تعمیری یا اسلامی ادب کے حلقہ تعارف میں ایک معروف ادیب ہیں۔ ماہنامہ زندگی میں پہلے بھی ان کی بعض کتابوں پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔ان کے مضامین کا یہ زیر تبصرہ مجموعہ ان کے حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہے۔

ادب میں معیار و اقدار کا مسئلہ، ادب میں اخلاقی اقدار کا تصور، فن، مقصد اور کردار، ادب اور تحریک، ہماری ادبی فروگزاشتیں، اقبال کا پیام، جگر مرادآبادی، رشید احمد صدیقی کا فکر و فن، اختر اورینوی کا نظریۂ فن، نذیر احمد کی ناول نگاری، سید قطب، فکر ابوالکلام، اقبال کی شاعری میں آدمی کا مقام۔

ان مقالات میں تبصرہ نگار کو اپنے مزاج کے لحاظ سے بحیثیت مجموعی ''ادب میں اخلاقی اقدار کا تصور'' زیادہ پسند آیا۔ذیل کی عبارت جاندار، مؤثر اور زوردار ہے۔

> ''جو ادیب و شاعر صحت مند جنسی تصور سے ہٹ کر مریضانہ جنسیت کے شکار ہیں اور اپنے ادب کو عریانی و فحاشی کے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں، حقیقتاً وہ سماج میں بیماری پھیلانے اور ادب کے چشمۂ صافی کو گدلا کرنے کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ایسا ادب اچھا اور اعلیٰ ادب نہیں ہوسکتا۔اس کا مٹا دینا ہی ہمارا فرض ہے۔حقیقت نگاری کے سلسلے

میں عریانی کا اظہار کوئی صحت مند جذبہ نہیں بلکہ یہ مریضانہ ذہن کی عکاسی ہے۔ جس کا مقصد تعیش، لذت پرستی اور ہیجان کے سوا کچھ اور نہیں۔ حقیقت نگاری کے نام سے ادب میں جو گھناؤنا پن اور گندگی آئی ہے اس کے سدباب کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے ادب کے لئے ان اخلاقی اقدار کو نشان راہ بنائیں جس کی راہ نمائی میں ادبی حقیقت نگاری، فحش نگاری سے محفوظ رہے۔'' (صفحہ ۵۳)

لیکن اسی مقالہ میں ایسی عبارتیں بھی ہیں جو تبصرہ نگار کے نزدیک نظر ثانی کی محتاج ہیں۔

مثلاً:

''اس طرح آرٹ کی اعلیٰ تحقیق میں، خواہ وہ شاعری ہو یا مصوری، رقص ہو یا موسیقی، انسان اور خدا دونوں ہی نظر آتے ہیں۔''

اس کتاب کو فاضل مصنف نے تنقیدی مضامین کا مجموعہ لکھا ہے، حالانکہ اس میں زیادہ مضامین ایسے ہیں جن میں اخلاقی نقطہ نظر رکھنے والے ادیبوں کے بارے میں مصنف کے صرف مدحیہ تاثرات ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب لائق مطالعہ اور مصنف کی ''ادبیت'' کی گواہ ہے۔

(ماہنامہ زندگی رامپور، نومبر دسمبر ۱۹۷۸)

○○○

تبصرہ

حیات دوام

از: مدیر تذکیر (لکھنؤ)

''حیات دوام'' مولانا طیب عثمانی ندوی کی ایک اہم تصنیف ہے جس میں انہوں نے اپنے والد محترم مولانا شاہ محمد قاسم فردوسیؒ کے حالات زندگی اور تعلیمات پر بڑے دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے کل پانچ ابواب ہیں جن میں شاہ صاحب کی ولادت سے لے کر وفات تک کے حالات آگئے ہیں۔ اس میں مولد اور خاندانی حالات کا بھی تذکرہ ہے اور سلوک و تصوف کا بھی بیان ہے۔ حلم وعفو اور حسن سلوک کے واقعات اور معاشرتی مساوات اور اصلاح معاشرہ کی کوششوں کا بھی ذکر ہے۔ بیعت وارشاد کے ساتھ جنگ آزادی میں عملی شرکت، مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رفاقت، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی تحریک سے وابستگی، مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور مولانا سجاد بہاریؒ سے ان کے تعلقات اور روابط پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''حیات دوام'' ایک بزرگ کی سوانح تو ہے ہی آزادی سے پہلے کی ایسی تاریخ بھی ہے جو ہمارے سامنے اس دور کی سیاسی وسماجی صورت حال اور تحریکات کے خدوخال پیش کرتی ہے۔

کتاب مجلس مصنفین بیت الرشاد، شانتی باغ کریم گنج، گیا (بہار) سے ایک سو روپے میں مل سکتی ہے۔

○○○

تبصرہ

سفرنامہ حرمین شریفین

از: ڈاکٹر ابن فرید

جب کسی ایسی جگہ کا سفر کیا جائے جہاں سے جذباتی تعلق ہو یا جو سفر جذبۂ صادق کا طوفان کھڑا کردے تو دل چاہتا ہے کہ اس سرور و کیف کا ایک ایک لمحہ محفوظ کرلیا جائے۔ یہ بات تو عام سفروں کی ہوتی ہے لیکن جب اس سفر میں ایمان و عقیدہ کا عنصر شامل ہوجائے تو بات کچھ اور ہی ہوجاتی ہے۔ یہ کیفیت سفر حج کی ہوتی ہے۔ اردو میں گذشتہ ڈیڑھ صدی میں کئی ایک سفرنامے لکھ گئے ہیں۔ ان میں زمانی فاصلوں کی وجہ سے بہت سی بدلی ہوئی، دلچسپ اور تاریخی معلومات محفوظ ہوگئی ہیں جو شاید آئندہ مورخوں کے کام آسکیں۔

میرے دوست مولانا طیب عثمانی ندوی نے ۱۹۹۸ء میں فریضۂ حج ادا کیا۔ اس مبارک سفر کی روداد انھوں نے بڑے سلیقہ سے قلم بند کی ہے۔ اس سفرنامہ کی تین اہم خصوصیات ہیں۔ اولاً یہ کہ اس کے ذریعہ مناسک حج کی عملی تفصیلات کا علم ہوتا ہے اور ان کی تاریخی و استدلالی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، ثانیاً حرمین شریفین کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اور ثالثاً جنھوں نے حجاز کے ان دونوں متبرک تاریخی شہروں میں حاضری دی ہے انھیں نئی تعمیرات اور نظم و انتظام کا علم ہوتا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ بہت سی بھولی بسری یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔ ان سب پر مستزاد مولانا طیب عثمانی کا متین، متوازن اور ساف ستھرا انداز بیان ہے جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

کمپوزنگ کی بے حساب غلطیاں راہ پا گئی ہیں جن کی وجہ سے بے کیفی پیدا ہوجاتی ہے۔ کتاب کی طباعت صاف ستھری، تزئین دلکش اور پیش کش معیاری ہے۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات، قیمت پیپر بیک ساٹھ روپئے ہے۔ اسے اپلائڈ پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ ۱۷۳۹/۳ (بیسمنٹ) نیو کوہِ نور ہوٹل، پٹوڈی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(ماہنامہ حجاب رامپور بابت اگست ۲۰۰۰)

○○○

تبصرہ: سفرنامہ حرمین شریفین

از: ڈاکٹر عبدالمغنی

مولانا طیب عثمانی ایک معروف عالم و ادیب ہیں۔ ان کی کئی کتابیں ہیں، خاص کر اقبالؔ پر۔ جیسا نام سے ظاہر ہے، زیر نظر کتاب ان کے حج بیت اللہ کا سفرنامہ ہے۔ اس میں انہوں نے اول تا آخر اپنی ذاتی کیفیات، مشاہدات و مطالعات اور اپنے اعزواحباب کے کچھ حالات بیان کیے ہیں۔ عشق خدا تعالیٰ اور رسول ﷺ کے احساسات اکثر انہوں نے اقبالؔ کے اشعار کے مناسب حال حوالوں سے واضح کیے ہیں۔

ان کے اسلوب بیان میں سادگی و روانی ہے، کتاب دلچسپی سے پڑھی جاسکتی ہے۔ اس سے کچھ معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ سفرنامہ مختصر ہے اور اس کی نمایاں خصوصیت مصنف کے ذاتی جذبات ہیں، جو حرمین شیریفین یعنی مکہ و مدینہ کی زیارت کے دوران میں روبہ اظہار آئے ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے امید ہے کہ عام قارئین مستفید ہونگے۔

پیش کش عمدہ و اعلیٰ، قیمت 60 روپئے، پتہ: بیت الرشاد، شانتی باغ، نیا کریم گنج، گیا۔

(ماہنامہ مریخ پٹنہ بابت اگست ۲۰۰۰)

○○○

تبصرہ:سفرنامہ حرمین شریفین

از: محمد عارف اقبال

مولانا طیب عثمانی ندوی کا ادبی مقام اسلامی ادب سے وابستہ ہے۔ کیونکہ ان کا شمار ہندوستان میں ادب اسلامی کے موسسین میں ہوتا ہے۔ان کی تخلیقات ۱۹۴۵ءہی سے شائع ہوتی رہی ہیں۔ ایک زمانے میں امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے ہفتہ وار ترجمان ''نقیب'' کے مدیر بھی رہے ہیں۔ ان کا مرکزی موضوع اقبالیات ہے۔ اس سلسلے میں حدیث اقبال، اقبال کا پیام، اقبال:شخصیت اور پیام اہم تصانیف خیال کی جاتی ہیں۔

زیرنظر کتاب مصنف کا سفرنامہ حج ہے۔ مارچ ۱۹۹۸ء (مطابق ۱۴۱۸ھ) میں مصنف کو پہلی بار حج کا فریضہ ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جو ارمان برسوں سے دل میں کروٹیں لے رہا تھا، جب پورا ہوا تو فرط محبت وعقیدت میں موصوف کے نوک قلم میں جنبش ہوئی۔ ادیب کی شان یہی ہے کہ جب اس کا دل کسی بھی واقعہ سے متاثر ہوتا ہے تو یقینی طور پر وہ اپنے قلم کا جوہر دکھاتا ہے۔ اردو زبان میں دیگر سفرناموں کی طرح سفرنامہ حج بھی ایک اہم صنف کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا سفرنامۂ حجاز، مولانا مسعود عالم ندوی کا سفرنامہ 'دیار عرب میں چند ماہ' یا ان سے الگ معروف ادیب ممتاز مفتی کا 'لبیک'، ہو، ہر سفرنامہ کی اپنی جگہ انوکھی خصوصیت رہی ہے۔

اس سفرنامہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایسی یادیں، باتیں اور ملاقاتوں کا ذکر ہے جس کے مطالعے سے ماضی کا حال سے رشتہ معلوم ہوتا ہے۔ نیز ذاتی احوال وواقعات، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے مقدس مقامات کا ذکر، مناسک حج کے مقامات، منیٰ، عرفات، مزدلفہ اور رمی جمار کے ہجوم کی تصویریں مصنف کی آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کا وہ

قاری جو پہلی بار حج کو جا رہا ہو، اس کے لئے یہ سفرنامہ ایک گائڈ کا فریضہ بھی انجام دے۔

رنگین اور پرمعنی دیدہ زیب ٹائٹل اس کتاب کی دلکشی میں اضافہ کرتا ہے۔ ہر لائبریری اور ہر گھر کے لئے یہ کتاب مفید اور ناگزیر ہے۔ (ماہنامہ آج کل دہلی بابت اپریل ۲۰۰۰)

○○○

تبصرہ:سفرنامہ حرمین شریفین

از: ابوالقاسم ایوب اصلاحی

سفرنامے بہت لکھے گئے اور ہر زبان میں لکھے گئے۔ چونکہ یہ بھی ایک سفر ہے اسلئے آئندہ بھی لکھے جاتے رہیں گے۔ بعض سفرناموں کا انداز بالکل علمی وتاریخی ہوتا ہے اور بعض کا خالص ادبی۔ بعض سیر وسیاحت اور علم وادب سے بحث کرتے ہیں لیکن زیادہ تر حرمین شریفین کی زیارت اور اس کے آداب پر مشتمل ہوتے ہیں۔ سفرنامہ بھی اردو اصناف ادب میں صنف کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

چنانچہ سفرنامہ ارض القرآن (مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ) ہو یا سفرنامہ حجاز (مولانا عبدالماجد دریابادی) کاروان حجاز (ماہرالقادری) ہو یا ابن بطوطہ کا تاریخی سفر (جو اردو میں منتقل ہو چکا ہے) یہ سب اردو اصناف ادب میں ایک زریں اضافہ ہے۔ اسی سلسلہ کے ایک کڑی زیارتی وتاثراتی مضامین کا مجموعہ سفرنامہ حرمین شریفین بھی ہے۔

اردو اصناف ادب میں سفرنامہ کی روایت قدرے پرانی ہے اب اس کی الگ ایک پہچان بن گئی ہے۔ اس کا اپنا ایک اسلوب وانداز ہے اور وہ یہ ہے کہ عام طور پر دوسرے اصناف ادب میں مرکزی ہیرو کوئی اور ہوتا ہے لیکن زیارت نامے میں مرکزی شخصیت خود اس کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ اس کے اپنے احساسات، جذبات، مشاہدات اور تاثرات بھی ہوتے ہیں، چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مصنف کے بعض اہم پہلو عاجزی وانکساری میں دب جاتے ہیں اور بسا

اوقات بعض پہلو اتنے ابھر جاتے ہیں جس کی فی الواقع ضرورت نہیں ہوتی۔

جناب طیب عثمانی ندوی کا یہ ''سفرنامہ حرمین شریفین۔ دل طواف کوئے محبت کو جائے ہے'' کئی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔ از اوّل تا آخر یادوں، ملاقاتوں، زیارتوں، مشاہدوں اور گفتگوؤں کے تذکرے وفور جذبات سے لبریز ہیں۔ اس کتاب کا سب سے اہم باب وہ جو زیارت حرمین پر مشتمل ہے وہی اس کتاب کا حاصل بھی ہے اور خلاصہ بھی۔ وفور شوق و محبت حرمین سے سرشار بھی ہے اور خوشیوں اور مسرتوں سے معمور بھی۔ اثر کن بھی ہے اور روح پرور بھی۔

اس سفرنامے میں مصنف کے تقریباً تمام متعلقین واحباب کے تذکرے بالخصوص اہم شخصیات، علمی اداروں اور تاریخی مقامات کا ذکر موجود ہے۔ جس سے یہ کتاب علمی وفکری اور تاریخی حیثیت سے بھی مواد بہم پہنچاتی ہے۔ اس سفرنامے میں ذاتی احوال وافعال کے ساتھ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے مقامات مقدسہ کا ذکر، حج کے آداب اور دعائیں، مناسک حج کے معروف اماکن، منٰی، مزدلفہ، عرفات، مقام ابراہیم، رمی جمار وغیرہ اور ان کے آداب وتعلیمات سے آراستہ ہے۔ یہ کتاب جہاں قاری کے معلومات میں اضافہ کرتی ہے وہیں شوق زیارت حرمین کو دوچند بھی کرتی ہے۔

اس سفرنامے کا ایک خاص پہلو اس کی زبان وبیان کی سلاست ودریا جیسی روانی ہے۔ جناب طیب عثمانی ندوی صاحب کی تحریروں میں ادب وکلام کی چاشنی، متانت وسنجیدگی، اسلوب کا تنوع اور قلم کا زور بھی ہے جس سے قاری کبھی بھی ذہنی کوفت اور بور پن محسوس نہیں کرسکتا۔

کمپیوٹر کمپوزنگ شاندار ہے۔ مناسب pointsize اور space ہے۔ طباعت دیدہ زیب ہے، ٹائٹل جاذب نظر اور کاغذ نفیس ہے۔ اس کتاب کی پروڈکشن میں ناشر کی محنت اور توجہ قابل مبارکباد ہے۔ اردو حروف کی تصحیح پر توجہ دی گئی ہے البتہ بعض مقامات پر عربی پروف کی

غلطیاں رہ گئی ہیں جس سے مفہوم کہیں سے کہیں چلا جاتا ہے۔ مثلاً صفحہ ۳۸ پر کلبۃ المنظر ہے۔ کآبۃ المنظر ہونا چاہئے۔ ص ۷۱ پر یارسولُ اللہ ہے اسے یا رسول اللہ ہونا چاہئے۔ ص ۲۷ پر الی العدل والاسلام لکھا ہے اسے الی عدل الاسلام ہونا چاہئے۔ ص ۸۹ پر عربی شعر ہے:

احب الصالحین ولست منهم
لعل الله یمرزقنی دصلاحا

شعر اس طرح ہے

احب الصالحین ولست منهم
لعل الله یرزقنی صلاحا

امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح فرمالیں گے۔ بہرحال یہ کتاب عازمین حج وزیارت کے لئے ایک مفید گائڈ ہے اور زیارت حرمین کے شوق وجذبے کو دوبالا کرتی ہے۔

(اُردو بک ریویو، دہلی بابت جنوری فروری ۲۰۰۰)

○○○

تبصرہ

ادبی اشارے

مبصر: مولانا عمیر الصدیق ندوی دریابادی

اس کتاب کے فاضل مصنف کا شمار ان مظلوم ادیبوں میں کیا جاسکتا ہے جن کی ادیبانہ اور نقادانہ صلاحیت کی بلند پائیگی کے باوجود اردو ادب و تنقید میں، گروہ بندیوں کی وجہ سے شایان شان مقام نہیں دیا گیا۔ ادب و مذہب کی یکجائی، رائج الوقت رویوں کے لئے خدا جانے کیوں برداشت کے قابل نہیں ٹھہری، کائنات، انسان، زندگی، خدا، نبوت، آخرت، اسلوب، ہئیت، جمالیات، تہذیب، عقیدہ، اقدار جیسے موضوعات سے ادب کے تعلق پر فکر انگیز اور دل کش پیرائے میں مضامین کا یہ مجموعہ ہمارے سوال کی اہمیت کو اور بڑھا دیتا ہے۔ قریب پچاس برسوں پر محیط یہ تحریریں فاضل مصنف کی فکری و ذہنی استقامت کی دلیل ہیں۔ ان کی ذہنی و ادبی وابستگی شبلی سے ہے اور اس کا اثر ہر تحریر سے نمایاں ہے۔ پاکیزہ، ارفع اور مقصدی اور افادی ادب کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے لیکن اب شناخت سے زیادہ قبولیت کا دور ہے اور اس میں اس چھوٹی سی کتاب کا کردار بہت بڑا ہو سکتا ہے۔

(ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ، بابت: اکتوبر ۲۰۰۸ء)

○○○

تبصرہ

خیابان خیال

از: محمد رضوان خان

مولانا طیب عثمانی ندویؒ تحریک اسلامی ہند کے رہ نماؤں میں سے تھے۔ ان کی پیدائش ۳۰ رستمبر ۱۹۳۰ء کو بمقام سملہ ضلع اورنگ آباد، بہار میں ہوئی۔ بعد میں نیا کریم گنج، گیا، بہار میں سکونت اختیار کی۔ ان کی وفات گزشتہ سال ۲۹ رستمبر ۲۰۱۵ء کو ہوئی۔ آپ جماعت اسلامی ہند حلقہ بہار کی مجلس شوریٰ کے رکن اور ضلع گیا کے امیر مقامی بھی رہے۔ تعلیمی اور رفاہی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ آپ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ تحقیق و تنقید پر گہری نظر رکھتے تھے۔

آپ کی درجن بھر کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں رسول اکرم ﷺ نقش دوام، اقبال: شخصیت و پیام، افکار و اقدار، ادبی اشارے اور صحرا میں اذان کافی مقبول ہوئیں۔ آپ نے ادبی و صحافتی دنیا میں بحیثیت مدیر، نقیب پھلواری شریف اور معاون مدیر نئی نسلیں لکھنؤ بھی خدمات انجام دی ہیں۔

''خیابان خیال'' مولانا طیب عثمانی ندویؒ کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ جسے ان کے لائق فرزند ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی نے بڑی عرق ریزی سے ترتیب دیا ہے۔ فاضل مرتب الحمدللہ تحریک اسلامی سے وابستہ ہیں اور ادبی موضوعات پر ان کی کئی اہم کتابیں منظر عام پر آکر مقبول بھی ہو چکی ہیں۔ موصوف ادبی دنیا میں اپنی پہچان رکھتے ہیں اور انہیں علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

خطوط نگاری کی روایت قدیم ہے۔ جدید اُردو نثر کی ابتداء غالب سے ہوتی ہے۔

مکتوباتی ادب کی قدر و قیمت اسلئے بھی ہے کہ خط مکتوب نگار کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور بقول پروفیسر حنیف نقوی ''انسانی جبلّت کا جیسا واشگاف اظہار خطوط میں ہوتا ہے کسی اور تحریر میں نہیں ہوتا۔'' ''خیابان خیال'' میں مرتب نے خطوط پر حواشی لگانے کا بھی اہتمام کیا ہے جس سے ان خطوط کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ ان خطوط کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول میں ملی و اجتماعی موضوعات پر خطوط ہیں۔ یہ جن شخصیات کو لکھے گئے ہیں ان میں (۱) مولانا ابواللیث ندویؒ (۲) مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (۳) جناب محمد مسلم 'ایڈیٹر دعوت' اور (۴) ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی (۵) ڈاکٹر احمد سجاد وغیرہ شامل ہیں۔

باب دوم میں علمی و ادبی خطوط ہیں۔ ان کے مکتوب الیہ میں کئی قد آور شخصیات ہیں، جن میں مولانا عبدالماجد دریابادی ایڈیٹر صدق جدید، ڈاکٹر عبدالمغنی، وائس چانسلر متھلا یونیورسٹی، بہار، ڈاکٹر وہاب اشرفی، مولانا سید رابع حسنی ندوی، جناب عزیز بگھروی، ڈاکٹر ابن فرید وغیرہ اہم ہیں۔

باب سوم میں تعزیتی و دینی خطوط شامل ہیں۔ جو قریبی احباب اور تحریکی افراد کو لکھے گئے تھے۔ ان میں ڈاکٹر سید حبیب الحق، محترمہ طاہرہ ابدالی، ڈاکٹر سلیم الدین احمد، اسسٹنٹ ڈائرکٹر خدابخش لائبریری، ڈاکٹر سید ضیاء الہدیٰ امیر حلقہ جماعت اسلامی بہار، مولانا محمد سراج الحسن امیر جماعت اسلامی ہند وغیرہ شامل ہیں۔

باب چہارم میں چند نجی نوعیت کے خطوط شامل ہیں۔ آخر میں 'عکس تحریر' کے عنوان سے مولانا مرحوم کے چند خطوط کا عکس شامل کیا گیا ہے۔ کتاب میں پروف کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اسی طرح اردو کے قدیم رسم الخط کو رکھا گیا ہے، جواب متروک ہوگیا ہے۔ بہرحال یہ کتاب مکتوباتی ادب میں ایک اہم اضافہ ہے، جس کے لئے مرتب ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

(ماہنامہ 'زندگی نو' دہلی، بابت اکتوبر ۲۰۱۶)

○○○

تبصرہ: خیابان خیال

مبصر: غلام نبی کمار

زیر تبصرہ کتاب ''خیابان خیال'' مولانا طیب عثمانی ندویؒ کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔ جو انھوں نے وقتاً فوقتاً ملک کی مختلف شخصیات کے متنوع موضوعات جیسے علمی و ادبی، ملّی و اجتماعی، سیاسی و سماجی، تعزیتی اور گھریلو مسائل وغیرہ پر تحریر کئے ہیں۔ ان خطوط کے مکتوب الیہ میں بزرگ اساتذہ، ملت کے قائدین، جماعت کے ذمہ داران، تحریکی رفقاء، ادبی برادران و رسائل کے مدیران، ملت کے نوجوان اور عزیز و اقارب غرض ہر قسم اور میدان کے لوگ شامل ہیں۔ اس کتاب کو ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی نے مرتب کر کے ایک سعادت مند فرزند ارجمند کا پختہ ثبوت پیش کیا ہے۔ انھوں نے اس بیش قیمتی علمی و ادبی سرمایہ کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اس کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر منظر عام پر لانا اپنا فرض اولین سمجھا اور اسے قارئین ادب تک نہایت سلیقہ مندی سے پہنچا دیا ہے۔

مولانا طیب عثمانی ندویؒ نے ایک طویل عمر پائی۔ اس کا صد فیصد حق ادا کیا۔ بحیثیت ایک ادیب، معلم، مفکر، محقق، نقاد، دانشور، مکتوب نگار، سوانح نگار، سفرنامہ نگار، صحافی اور سیاسی و سماجی مصلح ان کے کارنامے اور خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی تصنیفات کی تعداد تقریباً ایک درجن کے قریب ہے جن میں ''رسول اکرم ﷺ، نقش دوام، حدیث اقبال، افکار و اقدار، ادبی اشارے، شخصیات، حیات دوام، سفرنامہ حرمین شریفین'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ''نقیب اور نئی نسلیں'' جیسے رسائل میں ادارت کے فرائض بھی انجام دئے۔ ان کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی زندگی کا سفر کئی دہوں پر پھیلا ہوا ہے۔

''خیابان خیال'' مختلف اوقات میں مختلف احباب کو لکھے گئے ۱۱۲ خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط چار ابواب میں موضوعاتی طور پر تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول میں ''ملی و اجتماعی خطوط'' باب دوم میں ''علمی و ادبی خطوط'' باب سوم میں ''تعزیتی و دینی خطوط'' اور آخری باب چہارم میں

”گھریلو ومتفرق خطوط“۔ مرتب کتاب ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی نے ”صاحب مکاتیب کے بارے میں چند باتیں“ کے عنوان سے ۱۹ صفحات پر مشتمل ایک طویل سوانحی مضمون تحریر کیا ہے۔ اس سے مولانا مرحوم کے احوال وکوائف پوری طرح افشاں ہوجاتے ہیں۔ ”خیابان خیال (مجموعۂ مکاتیب)“ کے عنوان سے ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی نے ہی زیرنظر مکتوبات پر ۱۱ رصفحات کا ایک تفصیلی مضمون رقم کیا ہے۔ اس مضمون کی تمہید میں ابتدا اس برق رفتار دور میں بھی مکتوب نگاری کی قدر وقیمت اور اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ باوصف اس کے کہ ترسیل وابلاغ کے برقی آلات انٹرنیٹ اور موبائل وغیرہ کی ایجاد اور عام رواج ورجحان کی وجہ سے فن مکتوب نگاری خاصی متاثر اور کمزور ہوئی ہے۔ اس کے بعد فن مکتوب نگاری کا مختصر سا جائزہ لیا گیا ہے اور طیب عثمانیؒ کی خطوط نگاری کے بنیادی اوصاف پر بھی خصوصی طور سے بات کی گئی ہے۔

مولانا طیب عثمانی کے مکتوب الیہ میں چند خاص اور اہم اسمائے گرامی یہ ہیں: مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی قابل ذکر ہیں۔ باب دوم میں ”علمی وادبی خطوط“ کے موضوع پر سب سے زیادہ باسٹھ خطوط شامل کتاب ہیں۔ اس حصہ کے مکتوب الیہ میں عبدالماجد دریابادی، پروفیسر عبدالمغنی، مولانا محمد رابع حسنی ندوی، ڈاکٹر ابن فرید، ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی، پروفیسر رشید کوثر فاروقی اور پروفیسر احمد سجاد وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ باب سوم میں ”تعزیتی ودینی خطوط“ کے موضوع کے تحت سترہ خطوط کو جگہ ملی ہے۔ باب چہارم میں ”گھریلو ومتفرق خطوط“ کے موضوع پر کل بائیس خطوط کو کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ جن حضرات کے نام خطوط ہے ان میں سید حسیب ابدالی، ڈاکٹر مشیر الحق، عبداللطیف اعظمی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی وغیرہم۔

اس کتاب میں شامل کچھ مکاتیب طویل ہیں اور کچھ مختصر۔ جس انداز میں مولانا مرحوم طیب عثمانی نے مکاتیب لکھے ہیں وہ ہر اعتبار اور ہر پہلو سے قارئین کا دل موہ لینے کے لئے کافی ہے۔ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ مکتوب نگاری کے فن میں اس سے ایک قابل قدر اضافہ ہوگیا

ہے۔ ان مکاتیب کی اہمیت اس وجہ سے بڑھ گئی ہے کہ ہر خط کے اخیر میں اس کا اشاریہ بھی شامل ہے۔ جس میں مکتوب الیہ اور دیگر احباب (اگر مکتوب میں کسی دوسرے شخص کا ذکر آیا ہے تو اس کا اشاریہ بھی) کا مختصر تعارف (پہچان) پیش کیا گیا ہے۔ اکثر بیشتر خطوط ایسے ہیں جن پر تاریخ کا اندراج ہے جس سے زمانی ترتیب بھی ممکن ہوئی ہے۔

مولانا مرحوم کے خطوط سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں فکریہ عنصر، بیان میں سنجیدگی، سلاست اور فصاحت، سوچ میں پختگی، شعور میں بالیدگی، تحریر میں شگفتگی اور چاشنی، اسلوب میں روانی اور لفظوں کی فراوانی ہے۔ انھوں نے جن جن موضوعات پر مکاتیب لکھے ان میں سب میں نیت کی خلوص مندی، جذبۂ ہمدردی اور گہری انسیت کا رنگ چھلکتا ہے۔ غلطیوں کا کوئی احتمال نہیں۔ مولانا مرحوم کے مکاتیب فن مکتوب نگاری کی ہر کسوٹی پر کھرے اُترتے ہیں۔

مولانا مرحوم کے مکتوب الیہ اپنے اپنے میدان کے مردمجاہد رہے ہیں۔ زبان وادب کا ہر قاری ان خطوط کے مطالعے سے دلچسپی لینا پسند کرے گا۔ اس کتاب کا آخری حصہ ”عکس تحریر“ کے عنوان سے درج ہے جس میں مولانا مرحوم کے چند خطوط کے عکش پیش کیے گئے ہیں۔ آخر میں کتاب کی پُشت پر طیب عثمانی کے سوانحی کوائف اور تصویر بھی ثبت ہے۔ معیاری طباعت، مضبوط جلد، پیپر اور کمپوزنگ بھی اعلیٰ معیار کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے قارئین ادب کے علمی اثاثہ میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔ (ماہنامہ پیش رفت، دہلی، بابت: دسمبر ۲۰۱۶ء)

○○○

تبصرہ: خیابان خیال

تبصرہ: اشعر حمیدی

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی اور ان کے والد مولانا شاہ طیب عثمانی ندویؒ سے میرے تعارف کی کہانی 44 سال پرانی ہے۔ وہ یوں کہ 1972 میں میرے والد بزرگوار نے میٹرک کے بعد انٹرمیڈیٹ میں داخلہ کے لیے مجھے گیا بھیج دیا جہاں میرے چچا ڈاکٹر نصر حمید خلش مرزا غالب

کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔کریم گنج محلّہ کے جس مکان میں رہتے تھے وہ دوحصوں میں منقسم تھا۔دوسری جانب مولانا طیب عثمانی کی فیملی رہتی تھی۔اکثر مولانا مخصوص لہجہ میں ’رشاد‘ پکارتے اورفوراًہی ’جی ابا‘ کا جواب آتا۔یہ آوازیں آج تک میرے تحتِ شعور میں محفوظ ہیں اور شرافت ووضع داری کا معیار معلوم ہوتی ہیں۔تب سے آج تک دنیا کتنی بدل گئی۔

’خیابانِ خیال‘ پرتبصرہ کرنے بیٹھا ہوں توان کی شخصیت،ان کی کم گوئی، کسرنفسی،ان کا کتابی متین چہرہ،ان کا نپے تلے الفاظ میں تقریر کرنا سب کچھ گویا میرے سامنے ہے۔اب جب کہ مکتوب نگاری تقریباً متروک ہوچکی ہے،رشادصاحب نے اپنے والد کے خطوط کا مجموعہ شائع کراکے گویا کم توجہ والے صنفِ ادب کومہمیز لگانے جیسا کام کیا ہے۔مجموعہ مکاتیب تواردو میں بہت سارے ہیں جودینی،سیاسی اورادبی موضوعات پر لکھے اورشائع کیے گئے ہیں لیکن شاید پہلی بارخطوط کومنتخب عنوانات کے تحت شائع کرنے کا خیال ڈاکٹر رشادہی کوآیا جس کے ذریعہ انہوں نے مکتوب نگار کی ہمہ جہت شخصیت سے عام قاری کوواقف کرانے کی کوشش کی ہے۔بے شک خط جوفطری جذبہ کے تحت لکھے گئے ہوں،انسان کی مخصوص شخصیت،اُس کی فکراور Vision کو بے نقاب کرتا ہے،جس سے مکتوب نگار کی شخصیت کے چھپے رازہائے سربستہ کھلتے چلے جاتے ہیں۔

یوں تو مولانا مرحوم کو جاننے والے واقف ہیں کہ وہ ایک اسلامی مدبر،ایک کامیاب معلم،ایک مفکر خیرخواہ اورسب سے بڑھ کرداعی الی اللہ تھے۔لیکن ان کے دل میں انسانیت کی صلاح وفلاح کے لیے کیسے کیسے خیالات اُبھتے رہے اس کا اندازہ ان خطوط سے ہی ہوسکا۔گومولانا کی دس کتابیں مختلف موضوعات پرزیورطبع سے آراستہ ہوچکی ہیں جوان کی علم دوستی،وسیع المشربی کی گواہ بنی ہیں۔

’خیابان خیال‘ چارابواب اوراتنے ہی عناوین پر مشتمل ہے جس کے کل 232 صفحات میں سے 45 مختلف ضرورتوں کے لیے استعمال ہوئے۔دیباچہ سے لے کرتعارفِ کتاب کے لیے 32 صفحات لیے گئے اورصاحب مکاتیب کی نامکمل خودنوشت کے لیے پانچ صفحے استعمال میں لائے گئے۔ان کی افادیت پر میں کوئی بحث نہیں چھیڑتا لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ

بیٹے نے باپ کی یہ نصیحت یاد نہ رکھی...’’آپ صرف اپنے موجودہ پیش لفظ کے ساتھ شائع فرمادیں،کسی اور سے بھی کوئی تحریر یا مقدمہ اُس پر نہ لکھوایا جائے اس لیے کہ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید‘‘(خط بنام محمد طاہر عثمانی،صفحہ 206)۔واضح کردوں کہ یہ جملہ مولانا نے اپنے والدشاہ محمد قاسمؒ کے مکاتیب کے مجموعہ ’نقش دوام‘ کی اشاعت کے حوالے سے لکھا تھا۔

’خیابان خیال‘ کے چاروں ابواب پر طائرانہ نگاہ بھی ڈالی جائے تو تاثر کچھ یوں قائم ہوسکتا ہے۔

باب اول:ملّی واجتماعی خطوط۔اس کے زیرعنوان کل 11 خطوط شامل کتاب ہیں جن کا دورانیہ 1962 سے 2000ء تک کا ہے۔یہ وہ خطوط ہیں جوملک کے مشاہیر اہل علم ودانش کے نام ملک وملت کو درپیش مسائل کے حوالے سے لکھے گئے۔اہم بات یہ ہے کہ ان خطوط میں جن مسائل پرگفتگو کی گئی ہے تب بھی اتنے ہی اہم تھے جتنے آج ہیں۔واضح ہوتا ہے کہ مولانا نے ملت کے اندر درآئی خرابیوں کا راز پالیا تھا لہٰذا وہ نبض شناسِ ملتِ مرحوم کہے جاسکتے ہیں۔یہ وہ موضوعات ہیں جوصدیوں پر محیط ہیں مثلاً مسلم قیادت کے فقدان کے حوالے سے ان کا کرب پوری ملت کا کرب ہے۔اس حصہ میں شامل سب سے طویل خط مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ (امیر جماعت اسلامی ہند) کے نام ہے جبکہ پہلا خط مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے نام۔ان دونوں میں مسلم مسائل کے حوالے سے مولانا طیب مرحوم کے مشورے پڑھنے کو ملتے ہیں۔تین خطوط مختلف رسائل کے مدیرصاحبان کو لکھے گئے ہیں جن میں ادب کے سلسلہ میں ’توجہ طلب امور‘ پر گفتگو ہے۔دیگر میں اجتماعی مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں۔ایک خط میں لکھتے ہیں:’’...ہماری ملت کا مرض یہ ہے کہ حقائق کواس کی اصل شکل میں دیکھنے کے بجائے اپنی خواہشات کے آئینہ میں سب کچھ دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔‘‘خط بنام سیّد عبدالباری شبنم سبحانی مرحوم،مدیر دوام ٹانڈہ،صفحہ 51۔

باب دوم:علمی وادبی خطوط۔اس عنوان کے تحت چھوٹے بڑے 62 خطوط کا ایسا مجموعہ پیش کیا گیا ہے جوخود ایک مکمل کتاب کا درجہ لیے ہوئے ہے۔ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے

کہ مولانا طیب عثمانی ندوی نہ صرف تعمیر پسند مصنّفین میں اونچا مقام رکھتے تھے اور اس فکر کو عام کرنے کے لیے مسلسل کوشاں رہتے۔ دوسروں کے ساتھ اپنے نورِ نظر، لختِ جگر شاہ رشاد عثمانی کو بھی اس حوالے سے تحریک دیتے رہتے۔ مولانا کی تین کتابیں حدیث اقبال/ اقبال شخصیت و پیام، افکار و اقدار اور ادبی اشارے نیز چھوٹے بڑے دیگر مضامین سے ان کا مطمح نظر واضح ہوتا رہا تھا۔ اس کے باوجود تعمیر پسندوں/ اسلام پسندوں کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کو وہ اپنا فرض جانتے تھے۔ بیٹے کو لکھے گئے ایک خط کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں۔ ''کم لکھنا مختصر ہونا عیب نہیں لیکن اُس میں مطالعہ کی وسعت اور زبان و بیان کی قدرت نظر آئے۔ لکھنے سے زیادہ پڑھنے پر زور دو، دو ڈھائی سو صفحات روزانہ مطالعہ ہونا چاہیے اور پھر ایک صفحہ لکھنا چاہیے۔ اس طرح ایک سال میں تمہارا مطالعہ عروج پر پہنچے گا جس کے ہم متمنی ہیں۔ اس طرح ایک برس میں 360 صفحے بہترین ادبی و علمی نگارشات تمہارے قلم سے نکلیں گے، جن کی ادبی دنیا میں قدر و قیمت ہوگی۔''

آج کتنے باپ ہیں جو اپنی اولاد کی ایسی تربیت کرنے کی سوچ رہے ہیں؟ اس باب کا پہلا خط عبدالماجد دریابادی مرحوم کے نام 1952 میں لکھا، شامل ہے اور آخری ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی کے نام 2008 میں لکھا گیا۔ ان دونوں کے درمیان عبدالمغنی، وہاب اشرفی، رشید کوثر فاروقی، احمد سجاد، ڈاکٹر ابن فرید، انتظار نعیم، عزیز بگھروی وغیرہ جیسے ادیبوں، شاعروں کو تو دوسری جانب مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی جیسے اسلامی مفکرین کو لکھے گئے۔ ایک خط جناب عزیز برنی، مدیر راشٹریہ سہارا کے نام بھی ہے۔ ان خطوط میں ادب، قاری، رسائل کا مسئلہ اور خود اپنی ادبی مصروفیات پر اظہار خیال ہے۔ موصوف نے صرف مسائل کا ذکر نہیں کیا بلکہ ان کے حل بھی بتائے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا طیب عثمانی اپنے خیالات نہ صرف مضامین لکھ کر سامنے لاتے تھے بلکہ جہاں کہیں اس حوالے سے اصلاح کی ضرورت محسوس کرتے خط کے ذریعہ اس کی نشاندہی کر دیتے۔ ایسے بے باک قلم کار اور مشنری اب کہاں؟ ایک خط مرقومہ نومبر 2003 جناب عارف اقبال (مدیر اردو بک ریویو، نئی دہلی) ہے جس میں مولانا کے

مشورہ سے راقم الحروف کو بھی اتفاق ہے۔ ملاحظہ ہو:

''اردو بک ریویو جو حقیقتاً کتابوں پر معیاری تبصرے اور نئی کتابوں کے تعارف کے سلسلہ میں ممتاز و منفرد ہے، اس کے ساتھ ہی اگر اس کی افادیت اور مقبولیت میں اضافہ کے لیے نثر و نظم کے مختصر انتخاب کا سلسلہ بھی جاری رکھیں تو قارئین کے لیے مزید دلچسپی کا باعث بنے گا۔''

اس باب کے خطوط 56 سالوں کے دوران لکھے گئے ہیں لیکن قابل توجہ ہے کہ جو نظریہ پہلے خط میں جھلک دکھا رہا تھا وہی آخری وقت تک قائم رہا۔ گویا ترقی پسند تحریک کے ٹوٹتے بکھرتے دور سے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نام سے ادب میں تجربات کیے گئے اور ماضی کا ورق بنتے چلے گئے، لیکن طیب عثمانی ندوی نے جس تعمیر پسندی اور اسلام پسندی (کو جو اردو کے خون میں روزِ اول سے شامل ہے، اس روایت کو فروغ دیتے رہے) کا جو فیصلہ روز اول میں کیا تھا اُسی کے ساتھ بلا خوف و طمع چمٹے رہے، اُسی کے ہو کر رہ گئے۔ انہیں سجدہ سہو کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس باب کے اکثر خطوط ماہنامہ 'پیش رفت' کے مختلف وقتوں کے مدیران کے نام ہیں۔ ان خطوط میں مولانا اپنی بے لاگ رائے اور مشورے دیتے نظر آتے ہیں جس سے ان کے ادبی رویہ کی عکاسی ہوتی ہے۔

باب سوم: تعزیتی و دینی خطوط۔ اس ذیل میں 17 خطوط لائے گئے ہیں جو فطری طور پر اعزا و اقربا کے نام لکھے گئے۔ بیشتر روایتی انداز کے ہیں۔ ایک خط سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے حادثاتی موت پر لکھا گیا ہے جس میں بجا طور پر انہیں 'دارالمصنّفین اور دبستان شبلی و سلیمان کے آخری یادگار' کہا ہے۔ اس طرح ایک خط سید محمد رابع حسنی ندوی کو حضرت مولانا علی میاں کی وفات پر تعزیت کرنے کے لیے لکھا گیا ہے جس سے خانوادۂ حسینی سے ان کے بے پناہ لگاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ باقی ماندہ خطوط جماعت اسلامی ہند اور ادارہ ادب اسلامی ہند کے ذمہ داران کو لکھے گئے ہیں جس سے مکتوب نگار کے موقف کی پختگی، احساس کی شگفتگی، اپنوں سے محبت کا اظہار، زندگی اور موت کے متعلق خالص دینی سوچ، بے ثباتی دنیا کا اظہار سب کچھ سامنے آتا ہے۔ میرا

احساس ہے کہ مرتب نے اس باب پر کم توجہ کی ورنہ یہ ممکن نہیں ہے کہ 1972 سے 2004 کے درمیان مولانا نے سترہ خطوط ہی لکھے ہوں جبکہ وہ اس وقت بھی بلا تکلف خط لکھ دیتے جب کسی واقف کار کے موت کی خبر اخبار میں پڑھتے۔ گویا یہ باب تشنہ رہ گیا۔

باب چہارم: گھریلو و متفرق خطوط۔ یہ حصہ کل 22 مکاتیب پر مشتمل ہے۔ ایک اہم خط حضرت علی میاں کے نام شاہ رشاد عثمانی کے تحقیقی مقالہ 'اردو شاعری میں نعت گوئی' کی اشاعت سے قبل مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے قلم سے مقدمہ لکھنے کی درخواست کے طور پر لکھا گیا ہے۔ دیگر خطوط متفرق موضوعات پر لکھے گئے ہیں جس سے ان کے خانوادہ، اس کی روایات، اس کی دین داری سے بے حد پیار کا احساس ہوتا ہے۔ کیوں نہ ہو کہ ان کا خانوادہ علاقہ میں زہد و تقویٰ کے لیے جانا جاتا تھا۔ خود مولانا کی زندگی اس کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ (مزید معلومات کے لیے ماہنامہ پیش رفت کا مولانا طیب عثمانی نمبر دیکھا جاسکتا ہے)

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کے نام کا جو خط 4 ستمبر 1992 کو لکھا گیا، اُس میں پرنسپل صاحب کا دل موم کرنے کا جو نسخہ تجویز کیا ہے وہ مولانا کے قدیم صوفی روایت سے عقیدت کی چغلی کھاتا ہے اور ان کی شخصیت کے ایک خاص پہلو سے واقف بھی کراتا ہے۔ کئی خطوط بیٹے کو خاندانی روایات کی یاددہانی، حوصلہ افزائی، رہنمائی کے لیے لکھے گئے ہیں۔

آخر میں عکس تحریر کا عنوان باندھ کر مولانا کے تین خطوط چھاپے گئے ہیں۔ کتاب کی طباعت اور گٹ اَپ عمدہ ہے۔ پوری کتاب پڑھ جایئے شاید ہی کہیں ٹائپ کی غلطی ملے، غالباً اس کی وجہ اپلائڈ بکس کے ذمہ داران کی سنجیدگی اور پیشہ ورانہ صلاحیت کے ساتھ احساسِ ذمہ داری ہے۔

'خیابانِ خیال' کے خطوط Original ہر لحاظ سے ہیں۔ ایک جذبۂ صادق کے تحت ڈاکٹر رشاد عثمانی نے اپنے والد ماجد مرحوم کے خطوط کو من و عن شائع کردیا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ وہ حضرات ضرور کریں جو اولاد کی تربیت کے خواہاں ہوں۔

○○○ (اردو بک ریویو، نئی دہلی بابت جنوری تا مارچ 2017)

وفیات...... اخبار و رسائل کے تراشے

مولانا طیب عثمانی ندوی

—— محمد عارف اقبال

جید عالم دین، معروف ادیب اور صحافی مولانا طیب عثمانی ندوی ۲۹ ستمبر ۲۰۱۵ء کی صبح انتقال کر گئے۔ انکا انتقال گیا کے نیو کریم گنج محلّہ میں ان کی قیام گاہ ''بیت الرشاد'' پر صبح چھ بجے ہوا۔ نماز جنازہ بعد نماز عصر، نیو کریم گنج کی مسجد میں ادا کی گئی اور اس کے بعد ان کے جسد خاکی کو انکے آبائی گاؤں سملہ (اورنگ آباد، بہار) لے جایا گیا جہاں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ محترمہ کے علاوہ تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی انکے بڑے بیٹے ہیں جو بھٹکل اور کاروار (کرناٹک) کے اور فی الحال گورنمنٹ فرسٹ گریڈ کالج ساؤنور (کرناٹک) میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ مولانا طیب عثمانی کی شخصیت نہ صرف ایک عالم دین کی حیثیت سے معروف تھی بلکہ اپنے ادبی اور دینی و لسانی مضامین سے انہوں نے نوجوانوں کی ذہن سازی میں بڑا اہم رول ادا کیا۔

مولانا طیب عثمانی کی ولادت اورنگ آباد ضلع کے سملہ گاؤں میں ۳۰ ستمبر ۱۹۳۰ کو ہوئی تھی۔ ان کے والد شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی سملہ کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ آباواجداد پانی پت سے آئے تھے، بہار میں کئی سو سال سے ان کا خاندان آباد تھا۔ ان کی اردو فارسی اور عربی زبان کی تعلیم ان کے آبائی گاؤں سملہ کے ایک اتالیق خاص ایک عالم دین سے ۱۹۴۳ تک جاری رہی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ۱۹۴۴ میں داخل ہوئے۔ اور

۱۹۵۲ میں سند فضیلت امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ اس کے بعد وہ جدید تعلیم کی حصولیابی میں دو سال تک مشغول رہے۔ ندوۃ میں مولانا سید سلیمان ندوی کے صاحبزادے مولانا سلمان ندوی ان کے ہم سبق تھے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۵۴ سے وہ ادب اور صحافت کے میدان میں داخل ہوئے۔ چند ماہ کلکتہ کی صحافتی سرگرمیوں میں پورے انہماک سے حصہ لیا اور آزاد صحافی کی حیثیت سے روزنامہ 'عصر جدید'، 'الحق' اور دیگر کئی روزناموں میں اداریے اور صحافتی کالم لکھتے رہے۔ ان صحافتی تجربات سے انہیں بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ۱۰ جنوری ۱۹۵۴ کو پھلواری شریف (امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ) کے مشہور ہفتہ وار اخبار 'نقیب' میں مدیر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ وہاں وہ ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء تک صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران ۱۹۵۴ء میں لکھنؤ سے جناب م نسیم کی ادارت میں ادبی ماہنامہ 'نئی نسلیں' کا اجراء ہوا تو اس سے وہ بحیثیت معاون مدیر منسلک ہو گئے اور ۱۹۵۸ تک یقینی تقریباً پانچ برسوں تک اس رسالہ میں ادبی اداریے لکھتے رہے۔ ۱۹۶۳ میں گیا سے ایک سہ ماہی رسالہ 'صدف' پروفیسر عبدالمغنی مرحوم کے اشتراک سے نکالا جس کی ملک کے ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ طیب عثمانی مرحوم نے ۱۹۵۷ میں گیا کے ہادی ہاشمی ہائی اسکول میں اردو، فارسی کے معلم کی حیثیت سے ملازمت بھی اختیار کر لی تھی جہاں سے وہ ۱۹۸۸ میں سبکدوش ہوئے۔ مولانا عثمانی ملت ہاسپٹل، گیا کے بانیوں میں سے تھے۔ اقراء پبلک اسکول، گیا اور شتابدی پبلک اسکول گیا کا منصوبہ مولانا ہی نے بنایا تھا۔ مولانا مرحوم اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں تحریک اسلامی سے متعارف ہوئے اور رکن کی حیثیت سے تاحین حیات اقامت دین کی جدو جہد میں مصروف رہے۔ پروفیسر محسن عثمانی ندوی کے بقول ''علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کا ادبی ذوق، مولانا ابوالحسن علی ندوی کا اسلوب اور دعوتی مزاج اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک، یہ وہ عناصر تھے جن سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی۔

مولانا طیب عثمانی ادب اور صحافت کے میدان میں بے حد متحرک اور فعال رہے۔

ملک و بیرون ملک کے رسائل و مجلّات میں ان کے ادبی و صحافتی مضامین مسلسل شائع ہوتے رہے۔ ان مضامین کا ایک انتخاب 'صحرا میں اذان' کے نام سے شائع ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے۔ اسی طرح 'نئی نسلیں' لکھنو اور 'پیش رفت' دہلی میں لکھے گئے ان کے ادبی اداریوں کا مجموعہ 'ادبی اشارئے' کے نام سے منظر عام پر آیا جو اردو بک ریویو نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس سے قبل ان کی ایک کتاب 'سفر نامہ حرمین شریفین' اردو بک ریویو کے زیر اہتمام چائع ہو چکی تھی۔ ان کی دیگر تصانیف میں رسول اکرم ﷺ، نقش دوام، حیات دوام، افکار و اقدار، اقبال شخصیت اور پیام، اسلامی معاشرہ شامل ہیں۔ مولانا طیب عثمانی نے اپنی بے پناہ دینی، ملی، لسانی، ادبی اور صحافتی صلاحیتوں سے صالح معاشرہ اور صحت مند ادب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تحریر میں شائستگی، شگفتگی اور سلاست کے عنصر نمایاں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے اداریے، تبصرے، تجزیے اور مضامین میں قارئین گہری دلچسپی لیتے تھے۔ اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں داخل فرمائے۔ آمین!

(اردو بک ریویو، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۵)

○○○

مولانا طیب عثمانی بھی داغ مفارقت دے گئے

از: ڈاکٹر سید احمد قادری

جید عالم دین، معروف ادیب اور صحافی مولانا طیب عثمانی مورخہ ۲۹ ستمبر ۲۰۱۵ کی صبح داغ مفارقت دے گئے۔ ان کا انتقال گیا کے نیو کریم گنج محلّہ میں ان کی رہائش گاہ پر صبح چھ بجے ہوا۔ ان کے جسد خاکی کو ان کے آبائی گاؤں سملہ (اورنگ آباد، بہار) لے جایا گیا، جہاں کے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مشہور ومقبول افسانہ نگار اور صحافی ڈاکٹر سید احمد قادری نے ان کے انتقال پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولانا طیب عثمانی کی شخصیت اپنی ذات میں ایک انجمن جیسی تھی۔ وہ نہ صرف ایک عالم دین کی حیثیت سے معروف تھے، بلکہ اپنے ادبی اور دینی ولسانی مضامین سے انھوں نے نوجوانوں کی ذہن سازی میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر سید احمد قادری نے بتایا کہ ان کی ولادت اورنگ آباد ضلع کے سملہ گاؤں میں ۳۰ ستمبر ۱۹۳۰ کو ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی تھا، جو اپنے وقت کے کافی مشہور و معروف عالم دین کی حیثیت سے اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ ان کی اردو فارسی اور عربی زبان کی تعلیم ان کے آبائی گاؤں سملہ اتالیق خاص ایک عالم دین سے ۱۹۴۳ تک جاری رہی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ۱۹۴۲ میں داخل ہوئے اور ۱۹۵۲ء میں سند فضیلت امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ اس شاندار کامیابی کے بعد وہ جدید تعلیم کی حصولیابی میں دو سال تک مشغول رہے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد ۱۹۵۴ سے وہ ادب وصحافت کے میدان میں داخل ہوئے۔ چند ماہ کلکتہ کی صحافتی سرگرمیوں میں پورے انہاک سے حصہ لیا اور آزاد صحافی کی حیثیت سے روزنامہ

'عصر جدید'، 'الحق' اور دیگر کئی روزناموں میں اداریے اور صحافتی کالم لکھتے رہے۔ ان صحافتی تجربات سے انہیں بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ۱۰ر جنوری ۱۹۵۴ کو پھلواری شریف کے مشہور ہفتہ وار اخبار ''نقیب'' میں مدیر کی حیثیت ان کا تقرر ہوگیا۔ جہاں ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ تک وہ اپنی صحافتی خدمات دیتے رہے۔ اس دوران ۱۹۵۴ میں لکھنؤ سے ادبی ماہنامہ ''نئی نسلیں'' کا اجراء ہوا تو اس میں وہ بحیثیت معاون مدیر منسلک ہوگئے اور ۱۹۵۸ء تک یعنی تقریباً پانچ برسوں تک اس رسالہ میں ادبی اداریے لکھتے رہے۔ ۱۹۶۳ میں گیا سے ایک سہ ماہی رسالہ ''صدف'' پروفیسر عبدالمغنی جیسی معروف شخصیت کے اشتراک سے نکالا۔ جس کی، ملک کے ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ طیب عثمانی مرحوم نے ۱۹۵۷ میں گیا کے ہادی ہاشمی ہائی اسکول میں اردو وفارسی کے معلم کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی، جہاں سے وہ ۱۹۸۸ء میں سبکدوش ہوئے۔ ڈاکٹر سید احمد قادری نے مزید بتایا کہ طیب عثمانی صاحب ادب اور صحافت کے میدان میں کافی متحرک اور فعال رہے۔ ملک و بیرون ملک کے رسائل ومجلّات میں ان کے ادبی وصحافتی مضامین مسلسل شائع ہوتے رہے۔ خاص طور پر رسالہ ''افکار ملی'' (دہلی اور سہ روزہ ''دعوت'' (دہلی) میں سیاسی، سماجی اور ملی مسائل پر ان کے کافی مضامین، اداریے اور تبصرے شائع ہوئے۔ ان مضامین کا ایک انتخاب ''صحرا میں اذان'' کے نام سے شائع ہوکر مقبول عام ہوچکا ہے۔ اسی طرح ''نئی نسلیں'' (لکھنؤ) اور ''پیش رفت'' (دہلی) میں لکھے گئے ان کے ادبی اداریوں کو مجموعہ ''ادبی اشارے'' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔

طیب عثمانی نے اپنی بے پناہ دینی، ملی، لسانی، ادبی اور صحافتی صلاحیتوں سے صالح معاشرہ اور صحت مند ادب کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی تحریر میں شائستگی، شگفتگی اور سلاست کے عنصر نمایاں ہوتے تھے۔ اس لئے انکے ہر اداریے، تبصرے، تجزیے اور مضامین میں قارئین گہری دلچسپی لیتے تھے۔ ڈاکٹر سید احمد قادری کے مطابق جناب طیب عثمانی کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کا پُر ہونا بہت مشکل ہے۔ اسلئے کہ ایسی شخصیتیں روز روز نہیں پیدا ہوتی ہیں۔ (ماہنامہ پیش رفت، دہلی نومبر ۲۰۱۵) ○○○

مولانا شاہ طیب عثمانی ندوی کی رحلت

——ڈاکٹر سید شاہ فتح اللہ قادری

مورخہ ۲۹ر ستمبر بروز منگل مولانا شاہ طیب عثمانی رحلت کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی عمر ۸۵ر برس تھی، انتقال ان کے مکان گیا میں ہوا، ان کی وصیت کے مطابق جنازہ ان کے آبائی وطن سملہ لے جایا گیا اور اسی دن بعد نماز عشاء آبائی قبرستان میں تدفین ہوئی۔ ان کے حلقۂ احباب اور اہل تعلق کے خیال سے ایک نماز جنازہ گیا میں اور دوسری نماز جنازہ سملہ میں پڑھی گئی۔ مولانا طیب عثمانی حضرت شاہ محمد قاسم فردوسی رحمہ اللہ کے منجھلے صاحبزادے تھے، ندوۃ العلماء کے فضلاء میں تھے۔ ۱۹۵۲ء میں فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ کلکتے میں شعبۂ صحافت سے وابستہ رہے پھر امارت شرعیہ کے ترجمان ہفت روزہ نقیب پھلواری شریف میں بحیثیت مدیر کام کیا۔ ۱۹۵۷ء میں ہادی ہاشمی ہائی اسکول گیا میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۸۸ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

مولانا شاہ طیب عثمانی گیا کے علمی حلقہ میں معروف ومقبول تھے، صحافت کے میدان سے ان کا تعلق کم رہا لیکن مختلف موضوعات پر ان کی تحریریں علمی حلقہ میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں، ان کی کئی تصانیف شائع ہو چکی ہیں، جن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، نقش دوام، افکار واقدار، اقبال: شخصیت اور پیام، سفرنامۂ حرمین شریفین، ادبی اشارے، صحرا میں

اذان، شخصیات اور اسلامی معاشرہ شامل ہیں۔

سملہ (ضلع اورنگ آباد بہار) کے عثمانی خانوادہ میں شاہ طیب عثمانی کی شخصیت اس وقت بہت غنیمت تھی، ان کا خاندان ذی علم صوفیا کا خاندان رہا ہے، سملہ میں ان کے جد امجد حضرت شاہ مجیب الحق کمالی کے نام سے موسوم ''خانقاہ مجیبیہ فردوسیہ'' سلسلۂ فردوسیہ کی اشاعت کا مرکز رہا ہے، شاہ طیب عثمانی کے بڑے بھائی مولانا حکیم شاہ محمد طاہر عثمانی فردوسی رحمہ اللہ اپنے والد ماجد کے بعد اس خانقاہ کے سجادہ نشین ہوئے اور اب ان کے صاحبزادے مولانا شاہ تسنیم عثمانی صاحب سجادہ نشیں ہیں، اس گھرانے سے پھلواری شریف کے بزرگوں کا خاندانی تعلق ہے۔

مولانا شاہ طیب عثمانی اپنے والد کے مرید ومجاز تھے، مگر خود بیعت کا سلسلہ نہیں رکھا، آپ کے بڑے فرزند ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی نے اپنے خاندان کے علمی معیار کو قائم رکھا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اولاد کو اکابر کا سچا وارث بنائے۔ آمین

ادارہ المجیب ان کی رحلت پر ان کے پسماندگان سے تعزیت کرتا ہے۔

(سہ ماہی 'المجیب' پٹنہ، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۵ء)

○○○

حضرت مولانا الحاج شاہ محمد طیب عثمانی فردوسی ندویؒ کا وصال

از: شاہ مبشر حسنین عثمانی

انتہائی رنج وغم اور افسوس کے ساتھ یہ چند سطریں لکھی جارہی ہیں کہ خانقاہ مجیبیہ فردوسیہ ،سملہ آورنگ آباد (بہار) کی بزرگ ترین شخصیت حضرت مولانا الحاج شاہ محمد طیب عثمانی فردوسی سملوی ندویؒ کا بتاریخ ۱۴؍ذی الحجہ ۱۴۳۶ھ مطابق 29؍ستمبر 2015ء (منگل) کی صبح وصال ہوگیا۔ معروف ادیب، صحافی، جیداور جلیل القدر عالم دین عم محترم مولانا طیب عثمانی ندوی کا انتقال شہر گیا میں ان کی رہائش گاہ ''بیت الرشاد'' میں منگل کی صبح چھ بجے ہوا، پہلی نماز جنازہ گیا میں بعد نماز عصر اور دوسری ان کے آبائی وطن سملہ میں بعد نماز عشاء ادا کی گئی۔ سملہ میں نماز جنازہ ان کے سنجھلے بھائی عم محترم پروفیسر الحاج ڈاکٹر شاہ حسن عثمانی فردوسی سملوی مدظلہ نے پڑھائی۔ تدفین حسب وصیت، سملہ میں ان کے آبائی قبرستان میں ان کے دادا فارسی واردو زبان کے ممتاز شاعر مولانا حکیم شاہ محمد مجیب الحق کمالی فردوسی سملویؒ کے پائنتی میں عمل میں آئی اور اس طرح

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

نعش مبارک شہر گیا سے سملہ لانے کی خدمت سب سے چھوٹے صاحبزادے جناب شاہ محمد علی عثمانی عرف غزالی نے انجام دی۔ سب سے بڑے صاحبزادے جناب ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی (کاروار، کرناٹک) اور منجھلے صاحبزادے جناب شاہ حماد عثمانی (سعودی عربیہ) ملازمت، مسافت اور تدفین میں تاخیر نہ کئے جانے کی وصیت کی وجہ سے تجہیز وتکفین میں شریک نہ ہوسکے۔

حضرت شاہ طیب عثمانی، جد امجد محبوب الاولیاء حضرت مولانا الحاج شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی سملویؒ زیب سجادہ خانقاہ مجیبیہ فردوسیہ کے منجھلے صاحبزادے اور والد گرامی تاج العرفان حضرت مولانا الحاج حکیم شاہ محمد طاہر عثمانی فردوسی سملویؒ زیب سجادہ خانقاہ مجیبیہ فردوسیہ کے بھائی تھے۔ آپ کو اپنے آباء واجداد سے بے حد عشق تھا اور وہ اپنے اجداد کی روش پر آخری دم تک عمل پیرا رہے۔ آپ اپنے والد گرامی محبوب الاولیاء کے مرید (سلسلہ عالیہ فردوسیہ) ومجاز بھی تھے۔ آپ کی پیدائش ۳۰؍ستمبر ۱۹۳۰ء (منگل) کو سملہ میں ہوئی۔ ابتدائی اردو فارسی نوشت وخواند اور عربی زبان کی تعلیم مدرسہ فرقانیہ محمدیہ (موجودہ مدرسہ قاسم العلوم) سملہ میں اتالیق خاص ایک عالم دین سے ۱۹۴۳ء تک جاری رہی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ۱۹۴۴ء میں داخل ہوئے اور ۱۹۵۲ء میں سند فضیلت امتیاز کے ساتھ حاصل کی پھر دو برسوں تک جدید تعلیم کا سلسلہ انٹرمیڈیٹ تک رہا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۵۴ء سے ادب وصحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ چند مہینے کلکتہ کی صحافتی دنیا میں کام کرنے بعد ہفت روزہ ''نقیب'' پھلواری شریف پٹنہ سے بحیثیت مدیر وابستہ ہوئے۔ پھر ۱۹۵۷ء سے ہادی ہاشمی ہائر سکنڈری اسکول، گیا میں بحیثیت معلم باضابطہ ملازمت اختیار کرلی۔ ملازمت کے دوران اور اکتوبر ۱۹۸۸ء میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی ادب وصحافت کے ساتھ وابستہ رہے اور ملک وبیرون ملک کے رسائل ومجلّات آپ کے علمی ادبی اور دینی موضوعات پر وقیع مضامین سے مزین ہوتے رہے۔

حضرت طیب عثمانی ندویؒ کی متعدد کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں۔ جن میں ان کی ایک اہم تصنیف ''حیات دوام'' ہے جو ان کے والد ماجد اور پیرومرشد محبوب الاولیاء حضرت مولانا الحاج شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی سملویؒ کی سوانح حیات اور ان کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ ماہنامہ ''پیش رفت'' دہلی کے مدیر جناب ڈاکٹر سید عبدالباری اس کتاب کے متعلق لکھتے ہیں:

''سوانح اتنی دلچسپ اور پرکشش ہے کہ پڑھئے تو ناول کا لطف حاصل ہوتا ہے اور طیب صاحب کے بیانیہ کی داد دینی پڑتی ہے۔ اسلام کی سیدھی سچی تعلیمات انسانی زندگی کو کس سانچے میں ڈال دیتی ہیں اس کا دلکش مرقع سامنے آتا ہے۔ اس کتاب میں تصوف پر فکر انگیز گفتگو ہے اور حق پرست صوفیاء کس طرح معاشرہ کی اصلاح فرماتے تھے اس کی تفصیلات سامنے آتی ہیں۔''

مولانا طیب عثمانی ندویؒ کی دیگر تصنیفات میں ''رسول اکرم ﷺ، نقش دوام، افکار واقدار، اقبال شخصیت اور پیام، سفرنامہ حرمین شریفین، ادبی اشارے، صحرا میں اذان، شخصیات اور اسلامی معاشرہ'' شامل ہیں۔ ان کے علاوہ خانقاہ مجیبیہ فردوسیہ کی دیگر مطبوعات پر ان کے پیش لفظ اور مقدمے خاصے اہمیت کے حامل ہیں۔

جناب مولانا شاہ طیب عثمانی ندویؒ کے انتقال پر خانقاہ مجیبیہ فردوسیہ کے سجادہ نشین حضرت مولانا الحاج شاہ محمد تسنیم عثمانی فردوسی سملوی مدظلہ نے فرمایا کہ ''حضرت منجھلے ابیؒ کے وصال ہم سب کے لئے ایک سانحہ عظیم ہے، خانقاہ اپنے ایک بزرگ مخلص مربی محافظ اور نگراں سے محروم ہوگئی، تمام خانقاہی امور کی ادائیگی میں اور خصوصاً عرس کے موقع پر ان کے مشوروں اور رہنمائی کا بڑا دخل ہوتا تھا اور اپنے والد ماجد (حضرت محبوب الاولیاءؒ) اور برادر بزرگوار (حضرت تاج العرفانؒ) کی طرح ہی عرس کے مہمانوں کی خدمت، خاطر و تواضع اور رشد و ہدایت کے فروغ کے لئے کوشاں رہنے کی تاکید و تلقین فرمایا کرتے تھے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ''

[ایڈیٹر، آئینہ (دی مرر آن لائن) میگزین]

○○○

آہ! حضرت شاہ محمد طیب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

از: شاہ مسرور عثمانی

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

رب العالمین کا فضل و کرم ہے بہار کی سرزمین علمی و ادبی اور روحانی لحاظ سے ہمیشہ زرخیز رہی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں اس سرزمین پر بے شمار علماء، فضلاء، اولیاء اللہ، ادباء اور شعراء پیدا ہوئے۔ صوبہ بہار میں جہاں بہار شریف، بیتھو شریف، پھلواری شریف، امجھر شریف، دیورہ شریف جیسے مقدس مقامات ہیں وہیں ایک بستی سملہ ہے جو ضلع اورنگ آباد (بہار) میں واقع ہے۔ یہاں کے اکابرین نے اپنے آپ کو شہرت و ناموری سے دور رکھا۔ ان کی زندگی ''خاک شو گمنام شو'' پر گذری۔ لوگوں نے نہ جانا کہ وہ کون تھے؟ اور کیا تھے؟ انکا سودا آخرت کا سودا تھا۔ ان ہی اکابرین وقت میں عصر حاضر کی مشہور و معروف شخصیت، تصوف اور تاریخ و تنقید کی دنیا کے معتبر بزرگ اور صاحب قلم حضرت مولانا الحاج شاہ محمد طیب عثمانی فردوسیؒ تھے۔ وہ اپنے وقت کے ایک نامور عالم، منجھے ہوئے ادیب اور ممتاز بزرگ تھے جو ۲۹ ستمبر ۲۰۱۵ کو ہم سب کو اس دنیا میں چھوڑ کر اپنے رب اعلیٰ سے جا ملے۔ ''انا للہ وانا الیہ راجعون''

عم مکرم حضرت مولانا شاہ محمد طیب عثمانی شیخنا مرشدنا ولی نعمت حضرت مولانا الحاج شاہ احمد علی فردوسی سملوی مدظلہ العالی (سجادہ نشین خانقاہ شرف ذاکر نگر، جمشید پور (جھارکھنڈ) کے پیرو مرشد اور عم معظم حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی سملوی قدس سرہ العزیز کے منجھلے فرزند ارجمند تھے۔ آپ اپنے قلمی نام 'طیب عثمانی' سے مشہور ہوئے۔ لیکن آپ کا پورا نام شاہ محمد طیب عثمانی

تھا۔ آپکی پیدائش ۳۰ ستمبر ۱۹۳۰ء کو بمقام سملہ ہوئی۔ ابتدائی تعلیم اردو فارسی اور عربی گھر پر ہوئی پھر دارلعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کا سفر کیا اور ندوہ میں ۱۹۴۴ تا ۱۹۵۲ زیر تعلیم رہے اور یہیں سے فضیلت کی سند حاصل کی۔ آپ کو دور طالب علمی ہی سے مضمون نویسی کا خاص ذوق وشوق تھا۔ آپ نے مختلف موضوعات پر درجنوں مضامین لکھے جو ملک کے ممتاز و معتبر رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا کرتے اس کا حق ادا کرتے۔ آپکی علمی صلاحیت کو ظاہر کرنا گویا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے! آپکی تصنیفات ایک درجن ہیں۔ آپ کی پہلی تصنیف ''نقش دوام'' ہے جو ۱۹۶۰ء میں منظر عام پر آئی جو دراصل راقم الحروف کے بڑے دادا ابا یعنی عارف باللہ حضرت شاہ محمد قاسم فردوسی سملویؒ کے مکاتیب کا مجموعہ ہے۔

حضرت مولانا شاہ محمد طیب عثمانی کو تاریخ و ادب کے ساتھ ساتھ صوفیائے کرام کی سوانح عمری اور تذکروں سے خصوصی دلچسپی تھی۔ مثال کے طور پر سوانح حضرت شاہ قاسم عثمانی فردوسی سملویؒ جو ''حیات دوام'' کے نام سے ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آئی۔ اس سے گویا اس موضوع سے متعلق ان کی خصوصی دلچسپی نمایاں ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی تصنیفات کے مطالعہ سے قاری کو انکی معیاری تحقیق کا پتہ چلتا ہے۔ تحقیق ہو یا تنقید یا پھر سوانح نگاری کے میدان میں خاندان سملہ میں آپ کا ثانی نہیں پایا گیا۔ آپ کی علمی صلاحیت سے آپ کے معاصرین اہل تحقیق، ریسرچ اسکالر اور طلباء و نوجوانوں کی بڑی تعداد میں استفادہ کیا ہے۔ آپ کی شہرت علمی و ادبی صلاحیت کی بناء پر ہوئی۔ خدا نے آپ کو اردو اور عربی زبان و ادب میں جو ملکہ بخشا تھا یقیناً وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ کے مضامین اعلیٰ تحقیق کے معیار پر پورے اترتے ہیں بچپن سے ہی آپکے والد ماجد قدس سرہ العریز کی خاص توجہ آپ پر تھی۔ حضرت شاہ قاسم عثمانی قدس سرہ العزیز کی ہی تربیت ونگرانی میں آپ رہے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کو اسلامی علوم وفنون میں مہارت حاصل تھی۔ چونکہ اکابرین سملہ کا ماحول زمانہ قدیم سے علمی و ادبی رہا ہے۔ یہاں کے صوفیاء، علماء، شعراء، ادباء اور اہل علم حضرات نے علم و ادب کی اشاعت اور اس کے گیسو سنوارنے میں اپنے آپ کو ہمیشہ سے مشغول رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کو خاندانی ادبی ماحول سے استفادہ کا

خوب خوب موقع نصیب ہوا۔

آپ حسن اخلاق کے پیکر اور علم وعرفان کے دریا تھے۔ جو شخص بھی آپ سے ایک بار ملتا وہ یہی تاثر لیکر اُٹھتا کہ..... ''حضرت ہم کو زیادہ مانتے ہیں۔ آپ وسیع المطالعہ تھے۔ کوئی کتاب اگر کہیں شائع ہوتی تو اس کو منگوا کر ضرور پڑھتے۔ آپ کا دائرہ تعلقات خاصا وسیع تھا۔ ہر مکتبۂ فکر سے خندہ پیشانی سے ملتے یہی وجہ تھی کہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کو لیکر لوگ آپ کے پاس آتے اور آپ علمی ذہن وفکر سے باآسانی اسکا حل نکال دیتے اور لوگ اس پر عمل کرتے۔ غریبوں کی فریاد رسی آپ کا خاص شیوہ تھا۔ ہر عالم دین کی آپ عزت کرتے چاہے وہ جس مکتبہ فکر کے ہوتے۔ چونکہ آپ نے دینی، علمی اور روحانی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں یہی وجہ ہے کہ صوفیانہ رنگ و آہنگ نے انجناب کو اخلاق حسنہ کا پرتاثیر پیکر بنا دیا تھا۔ آپ نہایت منکسر المزاج تھے۔ مزاج عالیہ میں انکساری اور متانت اور چہرے میں جمال وجلال کا نور تھا۔ آپ کی شخصیت روحانی سعادت وعظمت کے لحاظ سے اک امتیازی خصوصیات کی حامل ہے۔ مشاہدہ کرنے والوں نے آپ کی ذات کو... ''اظہر من الشّمس'' کی طرح نمایاں پایا۔ راقم احقر نے آپ کو سنت نبوی کی پاسداری کا پوار خیال کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ کا دل خلوص ومحبت کا سمندر تھا یہی وجہ تھی کہ ہر عقیدہ اور ہر مذہب کے لوگوں میں عزت وتکریم کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔

آپ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ تہجد کی نماز اور نوافل کے ساتھ ساتھ اوراد وظائف اور ذکر واشغال کے خاص پابند تھے۔ ایسے ہی شخص کے لئے عربی کا شعر حق بہ جانب ہے؎

موت التقی حیاۃ لانفاد لھا

قدمات قوم وھم فی الناس احیاء

(متقی کی موت ایسی زندگی ہے جو کبھی ختم نہ ہونے والی ہے۔ یہ ایسی زندگی ہے جو مرنے کے بعد بھی ان لوگوں کو حاصل ہے۔)

(ہفت روزہ 'آغاز تحریک'، جمشید پور، 15 اکتوبر 2015)

○○○

مولانا طیب عثمانی ندوی کی رحلت پر
مجلس اعلیٰ ادارہ ادب اسلامی ہند کی تعزیتی قرارداد

ادارہ ادب اسلامی ہند کی مجلس اعلیٰ کا یہ اجلاس منعقدہ ۱۵؍نومبر ۲۰۱۵ء بمقام دہلی، تحریک ادب اسلامی کے بزرگ رفیق مولانا طیب عثمانی ندوی صاحب کی رحلت پر شدید رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے اس سانحہ کو تحریک کے لئے عظیم نقصان سے تعبیر کرتا ہے۔ مجلس اعلیٰ کا احساس ہے کہ محترم طیب عثمانی صاحب اپنے قیام لکھنؤ سے لے کر زندگی کے آخری ایام تک نصف صدی سے زائد عرصہ تک تحریک ادب اسلامی سے اپنی گہری وابستگی کا ثبوت دیتے ہوئے ماہنامہ ''نئی نسلیں'' سے لے کر ''ماہنامہ پیش رفت'' تک اپنے قلم کے ذریعے ادب کے وسیلے سے فکر اسلامی کی ترجمانی وترویج کا فریضہ مؤثر انداز میں ادا فرماتے رہے اور تحریک کی ترقی کے لئے ہمیشہ فکر مند رہے۔

مجلس اعلیٰ اس بات پر اطمینان ومسرت کا اظہار کرتی ہے کہ مولانا طیب عثمانیؒ اسلامی فکر کی حامل اپنی گراں قدر تحریروں کے تسلسل کو آگے بڑھانے کے لئے اپنے صاحبزادے ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کو فکر وآگہی کا عظیم سرمایہ وراثت میں منتقل کر گئے ہیں جو مرحوم کی طرح ہی تحریک ادب اسلامی کے ہراول دستے میں شامل ہو کر عظیم مقصد کے لئے رواں دواں ہیں۔

مجلس اللہ رب العالمین کی بارگاہ میں مولانا طیب عثمانیؒ کی مغفرت، بلندی درجات اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کرتی ہے۔

(ماہنامہ پیش رفت دہلی، دسمبر 2015ء)

○○○

مولانا طیب عثمانی

اردو کے معروف ادیب، صحافی اور جید عالم مولانا طیب عثمانی کا گیا (بہار) میں انتقال ہو گیا۔ وہ سملہ خانقاہ کے معروف بزرگ شاہ قاسم صاحب علیہ الرحمہ کے بیٹے تھے۔ ان کی تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہوئی تھی، ان کا علمی وادبی ذوق بہت منفرد تھا، اسی لئے وہ ادارہ ادب اسلامی سے وابستہ رہے۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ انکی پیدائش ۱۹۳۰ میں ہوئی تھی۔ بنیادی تعلیم وتربیت سملہ خانقاہ میں ہوئی، لیکن وہ مولانا مودودی کی شخصیت اور ان کی فکر سے متاثر ہو کر جماعت اسلامی میں شامل ہوئے اور تاحیات جماعت سے وابستہ رہے۔ ان کے ندوہ کے ہم درس رفقاء میں علامہ سلیمان ندوی کے بیٹے ڈاکٹر سید سلمان ندوی ساؤتھ افریقہ کا نام قابل ذکر ہے۔ مولانا شاہ محمد طیب عثمانی کی رحلت پر ادارہ ادب اسلامی ہند نے ان کی مغفرت اور درجات کی بلندی اور ان کے فرزند ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی اور جملہ پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کی۔ ملک کی معروف دینی جماعت سے آخر دم تک وابستہ رہ کر دینی اور ادبی میدان میں مولانا شاہ محمد طیب عثمانی کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔

(روزنامہ راشٹریہ سہارا پٹنہ، بابت ۲؍اکتوبر ۲۰۱۵)

○○○

ممتاز عالم دین، ادیب ونقاد مولانا طیب عثمانی نہیں رہے

ـــــ شوکت علی

مولانا طیب عثمانی ندوی ۲۹ ستمبر ۲۰۱۵ء کی صبح چھ بجے شانتی باغ، نیو کریم گنج، گیا میں انتقال فرما گئے۔ مولانا تقریباً ۹۰ (نوے) سال کے تھے۔ مولانا تحریک اسلامی ہند کے پرانے رکن، ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل تھے۔ وہ جید عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ تعمیری ادب کے نقیب، قابل تقلید استاذ، ماہر تعلیم اور مثالی سماجی کارکن تھے۔ ملت اسپتال گیا کے بانیوں میں سے تھے۔ اقراء پبلک اسکول گیا، شتابدی پبلک اسکول گیا کا منصوبہ مولانا ہی نے بنایا تھا۔ ہادی ہاشمی ہائی اسکول گیا میں اردو، فارسی اور دینیات کے ٹیچر تھے۔ ندوۃ العلماء کے زمانہ طالب علمی میں ہی تحریک اسلامی سے متعارف ہوئے اور اس وقت سے لے کر تاحین حیات جماعت کے رکن کی حیثیت سے اقامت دین کی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف رہے۔ پسماندگان میں اہلیہ محترمہ کے علاوہ تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ ۲۹ ستمبر کی صبح مولانا کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے پروفیسر بدیع الزماں صاحب، امیر مقامی جماعت اسلامی ہند گیا نے بتایا کہ مولانا کے انتقال سے ملک و ملت میں ایک خلاء واقع ہوگیا۔ سابق امیر جماعت اسلامی ہند بہار جناب قمر الہدیٰ صاحب نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے بتایا کہ جماعت اسلامی ہند بہار ایک باصلاحیت اور اہم رکن سے خالی ہوگئی ہے۔ صبح ۹ بجے تذکیر کے بعد رضوان احمد اصلاحی نے مولانا کی مغفرت، بلندی درجات اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کرتے ہوئے تحریک اسلامی سمیت ملک وملت کے لئے مولانا کا نعم البدل عطا کرنے کی دعا فرمائی۔

جنازے کی نماز ۲۹ ستمبر کو بعد نماز عصر نیو کریم گنج کی مسجد میں ادا کی گئی اور تدفین آبائی گاؤں سملہ میں عمل میں آئی۔ (روزنامہ قومی تنظیم، پٹنہ)

○○○

قارئین کے خطوط

پروفیسر عبدالقیوم خاں، کاروار (سابق صدر شعبۂ سیاسیات، انجمن کالج، بھٹکل، کرناٹک)

ماہ مارچ کا پیش رفت موصول ہوا، جو مولانا طیب عثمانی مرحوم پر ایک مبسوط خاص نمبر ہے۔ پروفیسر شاہ رشاد عثمانی کا بھٹکل ڈگری کالج کے شعبۂ اردو میں جب تقرر ہوا تو پہلی ہی ملاقات میں میں نے ان سے ذہنی ہم آہنگی محسوس کی تھی، اسی شعبہ کے صدر مرحوم عمر حیات خاں غوری نے بتایا کہ یہ طیب عثمانی کے فرزند ہیں جو ہندوستان کی لائق احترام ہستی ہیں۔ میں اُنھیں جانتا نہیں تھا مگر غائبانہ پہچان ضرور ہوئی۔ میرے مزاج میں جو بھی دینی شغف پیدا ہوا بہت حد تک میں عمر حیات صاحب کا ممنون ہوں اور ان کی رحلت کے بعد ان کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتا ہوں۔ پیش رفت میں ڈاکٹر محمد بدیع الزماں صاحب مرحوم طیب عثمانی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اُسے پڑھتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ میرے اور عمر حیات صاحب کے تعلقات کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ میں بھی شعبہ سیاسیات سے متعلق رہا ہوں۔ مرحوم ڈاکٹر سید عبدالباری کا بھی ممنون ہوں۔ ان کی تحریر پُرمغز ہوتی ہے۔ وہ خود بھی سنجیدہ اور پرخلوص انسان تھے۔ بھٹکل کالج میں ۱۹۷۵ء میں وہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم دونوں مزاج کے مختلف تھے، ان کی باتوں کی گہرائی میں اُترنے کا شعور نہیں تھا۔ بھٹکل کی دھواں دھار بارش سے گھبراتے نہیں بلکہ خائف لگتے تھے۔ کچھ مہینوں میں اُن کا ساتھ چھوٹا۔ برسوں بعد بھٹکل کالج کے سمینار میں ملاقات ہوئی تو یہ سنجیدہ انسان سراپا سنجیدہ بن گئے تھے۔ ہم نے پرانی باتوں کو یاد دلا کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ ان کے ساتھ پیش رفت سے متعلق کچھ اور بھی احباب

تھے۔عمر میں بھی بڑے اور علم میں بھی۔ ہمارے اردگرد بڑی بڑی علمی ہستیاں ہوتی ہیں۔ باذوق حضرات ان سے استفادہ کرتے ہیں مگر اکثر ایسے لوگوں کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا۔اس کے لئے پیش رفت جیسے رسالے ہوتے ہیں مگر پڑھے کون۔ برسوں بعد مرحوم طیب عثمانی کی کتاب افکار واقدار سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔اب تک ذہن پر جوفکشن کا غبار چھایا ہوا تھا آہستہ آہستہ دور ہونے لگا اور ذوق ایسے ادب کی طرف مائل ہونے لگا جو زندگی کی صحیح رہنمائی کرتا ہے اور یہ سمجھ میں آنے لگا کہ ادب کو اخلاق واقدار کا تابع کیسے بنائیں۔اتنی ساری اچھی اچھی کتابیں اتنے سارے اچھے اچھے ادیب لکھ گئے ہیں کہ زندگی ان کے مطالعہ کے لئے مختصر لگتی ہے۔تفسیر، سیرت، اسلامی تاریخ پڑھنے میں ایسی ادبی کاوشوں سے بہت مدد ملتی ہے۔ زبان کی چاشنی الگ ہوتی ہے۔شاہ رشاد عثمانی صاحب ہمارے شہر کاروار میں بھی آئے تھے اور اپنے دو برس کے قیام کے دوران اپنے والد صاحب کو یہاں لانے کی بات کی تھی مگر افسوس خرابی صحت کی وجہ سے وہ نہ آسکے اور ہم ایک معزز شخصیت سے ملنے سے محروم رہ گئے۔

پیش رفت میں جناب حسن رضا صاحب کے اداریے بہت اچھے لگتے ہیں۔ بسا اوقات اُن کا طرز تحریر دقیق ہوتا ہے۔ یہ شمارہ نکال کر انھوں نے مرحوم طیب عثمانی کا تعارف کرانے کی سعادت حاصل کی ہے اور سرورق کی مختصر تحریر اُن کے ادبی نظریے کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ چند سطور اسی اعتراف میں ہیں۔

○○○

ایم ایم افتخار حسین (لکھمنیا، بیگوسرائے (بہار)

مارچ ۲۰۱۶ء کا 'پیش رفت' خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ بہار کے شہر 'گیا' کی شخصیت پر فوکس ہے۔ جناب طیب عثمانی مرحوم پر سیر حاصل مضامین لکھے گئے ہیں جو معلوماتی اور تعمیری ادب کے لئے بہت قیمتی ہیں۔مولانا کی تمام تر ادبی کاوشوں کا تذکرہ ہے۔ ہر صاحبِ مضمون نے

مولانا کی تحریر کو اسلامی ادب سے وابستہ بتایا ہے۔ان کے شب وروز کا ذکر بھی ہمارے لئے گراں قدر ہے۔تعلیمی ادروں کے قیام کے لئے مرحوم کی مخلصانہ کوششوں سے آج کے لوگوں کو رہنما اصول اور ترغیب ملتی ہے۔ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کا بعنوان ''سوانح وشخصیت''، مضمون بہت معلوماتی اور دلچسپ بھی ہے۔اس مضمون کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان کے صاحب زادے نے اپنا ذاتی مشاہدہ اس میں بیان کیا ہے۔'سوانح وشخصیت' کے حوالے سے پروفیسر احمد سجاد، ڈاکٹر بدیع الزماں اور شبیر عالم خاں کے مضامین قابل قدر ہیں۔'فکروفن' کے حوالے سے تمام کے تمام مضامین اسلامی ادب کے لئے متاع حیات ہیں۔

○○○

ارشد قمر (ڈالٹن گنج، جھارکھنڈ)

مارچ ۲۰۱۶ء کا پیش رفت ''طیب عثمانی نمبر'' کی شکل میں ہمہ دست ہوا۔اس سے پیشتر علامہ اقبال اور تعمیر پسند شعرا کی نگارشات پر خصوصی نمبر شائع کر کے آپ نے جہاں ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے وہیں طیب عثمانی مرحوم ومغفور کی شخصیت، ان کے فکر وفن اور ادبی کارناموں پر ایک اور نمبر نکال کر مزید احسان کیا ہے۔ جو آپ کی اردو دوستی کا بین ثبوت ہے۔

سرورق پر ان کا قول ''اچھا ادب اچھا انسان ہی پیدا کرسکتا ہے'' سچائی پر مبنی ہے۔ بلا شبہ انسان کا بہتر ہونا شرطِ اول ہے۔کسی شخصیت یا کسی صنف پر نکلنے والے یہ خصوصی شمارے دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔کسی شخصیت پر ایک ساتھ اتنی ساری معلومات یکجا کردینے سے انکے کارنامے بھی محفوظ ہوجاتے ہیں۔

طیب عثمانی صاحب پر قلم بند کئے گئے تمام مضامین تاریخی نوعیت کے ہیں۔مختلف النوع مضامین کے ذریعے موصوف کے سوانحی، ادبی، فکری وفنی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔جن کے مطالعے سے طیب عثمانی صاحب کی شخصیت کو قریب سے جاننے میں معاون ثابت ہوئے۔

برسوں میں ایسی مایۂ ناز شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں، جنھیں تاریخ نہیں بناتی بلکہ وہ تاریخ ساز ہوتے ہیں۔

طیب عثمانی اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ اس اہم نمبر کی اشاعت کے لئے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

ooo

اے عبداللہ (بجنور، یوپی)

مارچ ۲۰۱۶ء کا شمارہ دستیاب ہوا۔ ماشاء اللہ اچھا نمبر آپ نے نکالا ہے۔ طیب عثمانی مرحوم کا بھرپور تعارف اس خاص شمارے کے ذریعہ اردو حلقہ میں ہوگا۔ عبدالباری مرحوم کا مضمون، ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں کا احاطہ کرتا ہے، بڑا وقیع مضمون ہے۔ یہ تشنگی بہت محسوس ہوتی ہے کہ ان کے ادبی کارنامے سامنے نہیں آپائے، جب کہ ہونا چاہئے تھا کہ ان کی فکر اور ادبی نظریہ پر ان کی تحریروں اور کتب کے حوالے سے تجزیہ اور تنقید اہل ذوق ناقدین پیش کرتے اور ادبی مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی جاتی۔

ooo

ڈاکٹر ظفر مرادآبادی (نئی دہلی)

''پیش رفت'' کی تازہ بہ تازہ پیش رفت ''طیب عثمانی نمبر'' کی شکل میں خصوصی توجہ کا مرکز بنی جو خود خراج عقیدت کے طور پر آپ کے ادارے کی وسعت دلی اور اعلیٰ ظرفی کا تاریخی دستاویز ہے جس کے لئے آپ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مرحوم وموصوف پر سبھی اہل قلم واجب الاحترام مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، ڈاکٹر بدیع الزماں، محمد شبیر عالم خاں، پروفیسر محمد ظفر الدین اور عارف اقبال کے علاوہ قند مکرر کے طور پر ڈاکٹر سید عبدالباری، شاہ ہلال احمد قادری، محسن عثمانی، ڈاکٹر وقار انور، ڈاکٹر محمد منصور

عالم، سید احمر قادری، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، عبدالرؤف ساؤنور اور دلشاد حسین اصلاحی جیسے بصیرت افروز قلم کاروں کی تحریریں بھی مرحوم ومغفور کے اعتراف نامے کی شکل میں تحسین ومبارکباد کے لائق ہیں۔

منظوم خراج عقیدت بھی جاندار ہے۔ اپنے بزرگوں کی پذیرائی نہ کی جائے تو ادبی بددیانتی کے زمرے میں آتی ہے۔ انتہائی شرمندگی ہے کہ اپنی مسلسل علالت کے سبب اس دستاویز کا حصہ نہ بن سکا۔ اللہ مجھے معاف فرمائے۔ آمین ثم آمین!

ooo

مناظر حق (چترا، جھارکھنڈ)

اپریل کے شمارے میں ڈاکٹر حسن رضا صاحب کا مضمون ''رزم ویا بزم ہو پاک دل و پاک باز'' طیب عثمانی نمبر بماہ مارچ ۲۰۱۶ء کا نچوڑ ہے۔

بڑے ادب کے ساتھ عرض ہے کہ مضمون کے تیسرے اور چوتھے پیراگراف میں مولانا مرحوم کے (محفل میں) انداز نشست پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض لوگوں کے نفسیاتی موٹاپے کا ذکر آیا ہے، اور ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب مرحوم کی مثال پیش کی گئی ہے، یہاں مجھے اشکال ہے۔ بعض مولویوں جیسے الفاظ بھی میری سمجھ سے باہر ہیں۔ ایسے الفاظ ہندی کے متعصب صحافی استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال ان کالموں میں جو مثالیں دی گئی ہیں ان سے مولانا مرحوم کے انداز نشست کی اہمیت پوری طرح واضح ہوجاتی ہے۔ اور یہ بہت سبق آموز ہے۔

ooo

شبیر حسن شبیر (اورنگ آباد، بہار)

مارچ ۲۰۱۶ء کا شمارہ مولانا طیب عثمانی نمبر تھا۔ اپنے اسلاف کو یاد کرنا ہم لوگوں کا فریضہ ہے۔ ان کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوئیں اور معلومات میں اضافہ ہوا۔

اپریل ۲۰۱۶ء کے شمارہ میں آپ کا مضمون طیب عثمانی صاحب پر پڑھا۔ کچھ اور معلومات میں اضافہ ہوا۔

○○○

محمد امین عامر (کولکاتہ، مغربی بنگال)

اسلامی ادب کے نمائندہ شعراء پر مشتمل نگارشات کے خصوصی شمارہ کے بعد ماہنامہ کا خصوصی شمارہ مولانا طیب عثمانی نمبر بے حد کامیاب، مکمل اور معلومات افزاء ہے۔ آپ سبھوں کی محنت، سعی وجہد اور شب وروز کی کوششوں کو ہدیہ سلام اور دلی مبارکباد۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغین کی ایک کثیر تعداد درس وتدریس کے علاوہ شغل علم و ادب سے بھی ہمیشہ وابستہ رہی ہے، جنھوں نے نہ صرف برصغیر ہندوپاک بلکہ عرب وعجم کی دنیا میں بھی شہرت وناموری کی بلندیوں پر کمندیں ڈالتے ہوئے اپنی ایک مخصوص شناخت قائم کی۔ ان میں ایک بہت نمایاں نام مولانا طیب عثمانی ندویؒ کا بھی ہے۔ جس سے متعلق پیش رفت کا یہ دستاویزی شمارہ قدردانی اور طیب شناسی کا بہترین مثال ہے۔ اس خصوصی شمارہ میں کل ۱۷ مضامین ہیں جن میں دو تاثراتی، چھ سوانح وشخصیت اور ۹ فکر وفن سے متعلق ہیں۔ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور محمد جعفر صاحبان کے تاثرات بہت قیمتی ہیں۔ بقیہ سوانح اور شخصیت سے متعلق جو مضامین ہیں ان میں ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی خلف الرشید مولانا طیب عثمانی کا ایک طویل مضمون ہے جو مولانا کی شخصیت اور سوانح پر مکمل اور جامع ہے۔ بقیہ قلمکاروں کے مضامین میں تکرار کے ساتھ کچھ قابل ذکر امور بھی ہیں۔

مولانا طیب عثمانی ندوی پر مشتمل یہ خصوصی شمارہ کسی دستاویز سے کم نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مولانا کے افکار وآثار کی روشنی میں ان پر مزید تحقیقی کام ہو، بالخصوص ادب عالیہ اور اسلامی ادب سے متعلق ان کے جو گراں قدر افکار ہیں نئی نسل کو ان پر قلم اٹھانے کی ترغیب دلائی

جائے تاکہ مولانا مرحوم کی صحیح ڈھنگ سے خراج عقیدت پیش کیا جاسکے۔

○○○

اقبال احمد خاں (بانی واعزازی جنرل سکریٹری، مسلم لڑکیوں کا یتیم خانہ، چرکی ضلع گیا)

ماہ مارچ کا پیش رفت دیکھا، دوسرے مضامین تو اچھے تھے ہی، مگر مجھے آپ کے اور محمد بدیع الزماں صاحب کے مضامین بہت پسند آئے۔ بھلے ہی میں اپنا کوئی تاثر رسالہ کو نہیں بھیج سکا جس کا افسوس ہے۔

آپ کے والد صاحب کے وقت کے کئی واقعات ذہن میں ہیں، وہ بڑے صاف گو تھے، دوٹوک منہ پر ہی کہہ دیا کرتے تھے، یہ ان کی خوبی تھی۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آپ نے اپنے مضمون میں ساری باتوں کو یکجا کردیا ہے اور آپ سے بہتر کون لکھ سکتا ہے۔ آپ ہی تو ان کے صحیح اور سچے جانشین ٹھہرے۔ یعنی ادبی مماثلت تو آپ ہی میں شروع سے دیکھتا آرہا ہوں۔ اب تو ماشاءاللہ آپ کا قلم بھی پختہ ہوگیا ہے۔

○○○

پروفیسر شاہ غلام سلطانی احقر (سابق صدر شعبۂ اردو بی ین وی کالج مدھے پورا، ضلع بیگوسرائے)

آپ کے ابو حضرت مولانا شاہ طیب عثمانی صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر ''دعوت'' اخبار سے ملی تھی، پھر آپ سے ٹیلی فون پر بات ہوئی، لیکن جب پیش رفت کا خاص نمبر ملا تو بہت سی پرانی بھولی بسری یادیں تازہ ہوگئیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مرزا غالب کالج میں اردو لکچرر کے انٹرویو کے لئے میرا گیا جانا ہوا تھا، میری داڑھی اور تحریک اسلامی سے وابستگی کے باعث ایک رکن انتظامیہ کی مخالفت کی وجہ سے میری وہاں تقرری نہیں ہوسکی۔ میں تلاش روزگار میں بہت پریشان تھا۔ پروفیسر وہاب اشرفی صاحب نے کلام حیدری صاحب کو کہہ کر مجھے ہفت روزہ مورچہ میں رکھوا دیا تھا، لیکن چند مہینے ہی میں وہاں کام کرسکا۔ تحریکی وابستگی وہاں بھی میری

آزمائش کا سبب بنی اور میں وطن واپس چلا آیا۔ بہر حال شہر گیا کے دوران قیام آپ کے والد صاحب سے میری تقریباً روز ہی ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ ان چند مہینوں میں ہی میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ میری ان سے آخری ملاقات ایمرجنسی کے بعد ۱۹۷۵ء میں دہلی کے کل ہند اجتماع میں ہوئی تھی۔ مین ان کو وہاں دیکھتے ہیں گلے مل کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ انھوں نے میری ہمت بندھائی اور جذباتی نہ ہونے اور ہمت نہ ہارنے کی تلقین کی۔ میرے ان مخلص دوستوں کی دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ پھر جلد ہی مجھے اپنے وطن میں ہی ایک کالج میں مستقل جگہ مل گئی۔

حضرت مولانا شاہ طیب عثمانی صاحب بحمد للہ ایک صوفی خاندان کے چشم چراغ تھے۔ پرورش صوفیانہ ماحول میں ہوئی۔ سرشت میں صوفیانہ افکار وخیالات کے تانے بانے بنتے رہے بقول ماہرین نفسیات انسانی شخصیت کی تعمیر میں نسل اور ماحول دونوں کے اثرات ہوتے ہیں۔ اور یہ دونوں عوامل موصوف کے اندر پورے آب وتاب سے جلوہ فگن تھے۔ گھر کے ماحول، درسگاہ (ندوہ) کی فضا اور عربی زبان وادب کی تعلیم نے وہ سب کچھ انھیں بخشا جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔

یہی سب اسباب وعلل تھے کہ مولانا کی شخصیت ایک صالح فطرت اور اخلاق کریمانہ والی تھی۔ جو بھی ان سے ایک بار مل لیتا تھا وہ ان کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا تھا۔ گفتگو کا انداز، قلّ و دلّ کی مثال تھا۔ ہر وقت قرآنی فکر وتصور میں ڈوبی باتیں اور اسوۂ رسول کے تذکرے ان کی نجی زندگی میں بھی دیکھنے کو ملتے اور اجتماعی معاملات میں بھی نمایاں تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ جماعت اسلامی ہند کے ایک فعال اور مستند ومعتبر رکن تھے۔ مولانا مودودی کی کتابوں اور مکتبۂ اسلامی کے لٹریچر نے ان کی ساخت وپرداخت کچھ ایسی بنائی تھی کہ

زفرق تا قدمت ہر کجا کہ می بینم   کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

آپ کے ابو گھر میں اور باہر میں یکساں مزاج اور فطرت کے تھے۔ یک رنگی انسان کو محترم بنا دیتی ہے۔ ظاہر وباطن کی یکسانیت والے لوگ معتبر ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ طبیعت میں سادگی، رہن سہن میں میانہ روی اور روزمرہ کی زندگی میں اعتدال پسندی سے آپ کا وقار بلند سے بلند تر ہو گیا۔ اقامت دین اور شہادت حق کی منصبی ذمہ داری کے احساس نے جلا بخشی۔ ماضی کی ساری چیزوں کو تیاگ کے جادۂ حق کو ویسے ہی قبول فرمایا جیسے حضرت مولانا حبیب اللہ چتر پوری کا معاملہ تھا۔ مولانا مذکور پوری زندگی مولانا ابوالکلام آزاد کے فین رہے۔ لیکن جب مولانا مودودی کا لٹریچر نظروں سے گذرا تو دنیا ہی بدل گئی۔ آپ کے ابو مرحوم بھی بالکل ویسے ہی کردار وعمل کے حامل تھے۔ اقبال کے لفظوں میں دونوں بزرگوں کے لئے یہ شعر زبان پر آتا ہے۔

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں   غلغلہ ہائے الاماں بت کدہ صفات میں

اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''جب حق واضح ہو کر سامنے آ گیا تو غیر حق فرار اختیار کر گیا۔''

آپ کے ابو محترم کے شب و روز کا تذکرہ تو بہت تفصیل طلب چیز ہے۔ البتہ دو واقعات کو تحریر میں پیش کرنے سے ان کے تفقہ فی الدین کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ ایک بار کسی مخاطب نے ایک معروف عالم دین کا ذکر چھیڑ دیا اور ان کی تعریف میں غلو اور مبالغہ کی شمولیت محسوس کر کے آپ کے ابو کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ پھر یوں گویا ہوئے ''کیا عالم رہیں گے اور یہ علم کس کام کا ہے جب دین حق کا آوازہ بلند نہ کیا اور اپنے لئے نشان راہ متعین نہ کی۔ تو مخاطبین حیرت میں پڑ گئے اور مولانا کی حق گوئی کی داد دل ہی دل میں دینے لگے۔

ایک دوسرے موقع کا ذکر کچھ یوں ہے۔ عیدالاضحیٰ نزدیک تھی، گیا میں بکروں کا میلہ سا

لگا ہوا تھا، ان میں بکریاں بھی بک رہی تھیں۔کسی نے مولانا محترم سے پوچھا، لوگ بکریاں کیوں قربانی دیتے ہیں؟ جواب ملا سب کی مالی حیثیت ایک جیسی نہیں ہوتی۔بکرے زیادہ داموں میں ملتے ہیں سب کی بساط نہیں ہوتی کہ قیمتی بکرے خرید سکیں۔تو پھر بڑے جانوروں میں حصہ لے لیں۔سائل نے کہا، جواباً آپ نے فرمایا ملکی قانون کا احترام کسی بھی شہری پر ناگزیر ہوتا ہے۔اگر حکومت کسی جانور پر پابندی عائد کرتی ہے تو ملکی قانون کے تحت وہ شئے ممنوع ہو جاتی ہے۔ چاہے اس پر کسی سبب گرفت نہیں بھی ہوتا ہم ممنوع ممنوع ہے۔اور جبکہ بدل موجود ہے۔یہ ویسے ہی ہے جیسے بغیر ٹکٹ ریل کا سفر قانونی جرم ہے۔اب ریلوے کے عملے کی غفلت ہو یا مسافر چھپ چھپا کر سفر مکمل بھی کر لیتا ہے تو جرم بہرحال جرم ہے۔وہ مباح نہیں ہوسکتا۔اس طرح مولانا محترم نے ایک بڑا مسئلہ چٹکیوں میں حل کر دیا۔اور لوگ آپ کے فکر ونظر سے بے حد متاثر بھی ہوئے۔

یہ تھے آپ کے ابو۔بس اللہ سے دعا ہے کہ اللہ آپ کے مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور اجر عظیم سے نوازے۔اور آپ نے جو نقوش ثبت کئے ہیں ان پر عام مسلمانوں کو گامزن ہونے کی توفیق وہدایت سے سرفراز کرے۔آمین ثم آمین!

○○○

علی احمد عثمانی (کلیۃ اصول الدین، جامعۃ الازہر، قاہرہ، مصر)

پیش رفت کے خاص نمبر کے بارے میں چھوٹے بھائی مشیر سے معلوم ہوا تھا، اور ان کو وہاٹس اپ پر فوٹو کاپی بھیجنے یا ای میل کرنے کو کہا تھا۔مگر افسوس رسالہ کی پی ڈی ایف کاپی میرے موبائل پر نہ کھل سکی، اور استفادہ سے محروم رہا۔یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔پہلے سے معلوم ہوتا تو میں ایک مفصل مضمون لکھتا، مگر شاید اب وقت نہیں ہے اس لئے جلدی میں مختصر طور سے چند باتیں بلکہ یادیں سپرد قلم کر رہا ہوں۔

انسانی زندگی میں چند لمحات ایسے آتے ہیں جو کامیابی اور کامرانی کے اساس ہوتے ہیں اور ہر ترقی اور تقدم کی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔اگر کبھی بنظر غائر دیکھا جائے تو ان لمحات کی وجہ سے حاصل ہونے والی تمام کامیابی اور ترقی کے پیچھے کسی ایسی ذات کا ہاتھ ہوتا ہے، جو خود درّ نایاب ہوتی ہے اور اپنے سے قریب ہونے والوں کو بھی قابل قدر بنا دیتی ہے اور اس کی تمام تمناؤں اور آرزوؤں کو پوری کرنے کا سامان مہیا کر دیتی ہے۔میرے لئے بلاشک وشبہ وہ ذات بابرکات اور عظیم شخصیت میرے پیارے دادا جان حضرت مولانا شاہ محمد طیب عثمانی فردوسی علیہ الرحمہ الرضوان تھے۔آپ عالم باعمل، صوفی باصفا، اپنے اسلاف کے سچے خلف، اخلاق حسنہ کے پیکر، محبت والفت کے مجسمہ، شفیق ومہربان، رحم دل وکرم نواز، حلیم وبردبار، صبر وتحمل کے مالک، تواضع وانکساری کے سرچشمہ اور خاندان عثمانی سملہ کے وہ چمکتا دمکتا سورج تھے، جن سے بلاشبہ دور دور تک لوگوں نے روشنی اور گرمی حاصل کی۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ آج سے سات سال قبل والد محترم حکیم شاہ ذکی انور عثمانی رحمۃ اللہ علیہ مجھے دوسری مرتبہ جب اپنے ساتھ رمضان کے موقع پر حضرت دادا جان علیہ الرحمہ کے دولت کدے پر نیو کریم گنج گیا لے کر گئے تو انھوں نے اپنی عادت حسنہ کے مطابق بڑے پیار سے میرے تعلیمی حالات کے بارے میں پوچھا۔اس وقت میں جامعہ اشرف کچھوچھہ شریف میں زیر تعلیم تھا۔آپ نے فرمایا بیٹا! دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں پڑھنا چاہو گے؟ آپ وہیں سے فارغ تھے اور ممتاز طلباء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔1948ء میں وہاں کی جمعیۃ الطلباء کے آپ ناظم اعلیٰ بھی تھے جو کسی تعلیمی ادارہ میں کسی طالب علم کے لئے بڑا مقام اور درجہ رکھتا ہے۔بہرحال میرے والد صاحب کی بھی یہی خواہش تھی کہ میں ندوہ میں تعلیم حاصل کروں، لیکن معاشی حیثیت سے ہم لوگ اس قابل نہیں تھے کہ وہاں جاسکیں۔مگر کرم نواز کی کرم نوازی کا کیا کہنا، فوراً فرمایا تمہارے تمام تعلیمی اخراجات کی ذمہ داری مجھ پر ہے، پھر انھوں نے اسی وقت ندوہ کے ذمہ داروں کے نام خط لکھ کر مجھے دیا اور یوں وہاں پر میرا داخلہ کرایا۔گویا یہ لمحہ میری زندگی کا ایک

نا قابل فراموش ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے جامعۃ الازہر قاہرہ تک کی میری تمام ترقی اور کامیابی، میری تمام تمنا اور ہر علمی خواب کی تعبیر کا اساس اور بنیاد میرے پیارے دادا جان علیہ الرحمہ ہیں۔

آپ کی ہی وہ عظیم ذات ہے جن کے توسط سے مجھے اپنے اسلاف کی حقیقی معرفت نصیب ہوئی۔ آپ کی کئی ادبی تصانیف ہیں، مگر جو کتاب آپ نے اپنے والد محترم ولی کامل، محبوب الاولیاء حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت وسوانح پر 'حیات دوام' کے نام سے لکھی تھی، اسے کئی بار پڑھنا نصیب ہوا اور جب بھی پڑھا آپ کے علمی و ادبی صلاحیت، خوش بیانی اور اسلوب جمیل کی تعریف پہلے دل نے کی اور پھر بعد میں زبان نے کی۔ آپ کی اس تحریر کی اصل خوبی وہ اثر انگیزی ہے جو دل کو اسیر کرتی ہے اور کبھی اشک بن کر آنکھوں کی راہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ آپ کی تحریر کا اثر تھا یا اس ذات بابرکات کا کمال جس کی سوانح حیات آپ قلمبند کر رہے تھے۔ میرا یہ دل کہتا ہے کہ شاید دونوں کا اثر تھا اور کیوں نہ ہو ایک ولی کامل تو دوسرے ادیب کامل تھے۔ دونوں ہی اہل دل اور صوفی باصفا۔ اسی لئے یہ کتاب ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں ممدوح کے ساتھ مصنف کے فکر و خیال اور عمل و کردار کی تصویر بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ میری نظر میں اس کتاب کو سملہ کے عثمانی خاندان کے ہر فرد کو بغور پڑھنی چاہئے، جس میں پیار و محبت، الفت وانسیت، عفو و درگذر، بندگان خدا کی خدمت اور عبادت و ریاضت کا سبق دیا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب میں اپنی عظمت رفتہ کی بازیافت کے اسباب کا بھی ذکر ہے۔

آپ کی کرم نوازی اور احسانات پر میں کیا کیا لکھوں۔ میرے پاس الفاظ نہیں، دل صرف ان کی مغفرت اور بلندی درجات کی دعاؤں کے ساتھ دھڑک رہا ہے۔

○○○

رشاد عثمانی کی دیگر اہم کتابیں

۱۔	روشن تہذیب	10/روپئے
۲۔	روشن حیات	20/روپئے
۳۔	نظریۂ ادب اور ادیب	20/روپئے
۴۔	اردو شاعری میں نعت گوئی	75/روپئے
۵۔	ادب کا اسلامی تناظر	100/روپئے
۶۔	تعبیر و تشکیل	200/روپئے
۷۔	نظریاتی ادب	100/روپئے
۸۔	شعرائے بھٹکل کی نعتیہ شاعری	150/روپئے
۹۔	افکار و اقدار	100/روپئے
۱۰۔	خیابان خیال	250/روپئے
۱۱۔	کتابوں کے رنگ و بو	150/روپئے
۱۲۔	شیرازۂ حیات	250/روپئے

رابطہ:

مجلس مصنّفین، شانتی باغ، نیا کریم گنج، گیا (بہار)